Teacher's Professional Development

خود شناس و خود آگاہ

قابلِ رشک ٹیچر

جس کا سب احترام کریں!

www.KitaboSunnat.com

اختر عباس

مصنف "وننگ لائن پر کون پہنچتا ہے"

نسل نو کی تیاری کے آرزو مند اساتذہ کے لئے

ہائی پوٹینشل بکس رحمٰن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مجلس التحقیق الاسلامی کے زیر اہتمام

محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں لکھی جانے والی اردو اسلامی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مجلس التحقیق الاسلامی کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق واجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

KitaboSunnat@gmail.com

www.KitaboSunnat.com

www.KitaboSunnat.com

قابل رشک ٹیچر

جس کا سب احترام کریں!

بسم الله الرحمن الرحيم

Teacher's Professional Development

خود شناس و خود آگاہ

قابل رشک ٹیچر

جس کا سب احترام کریں!

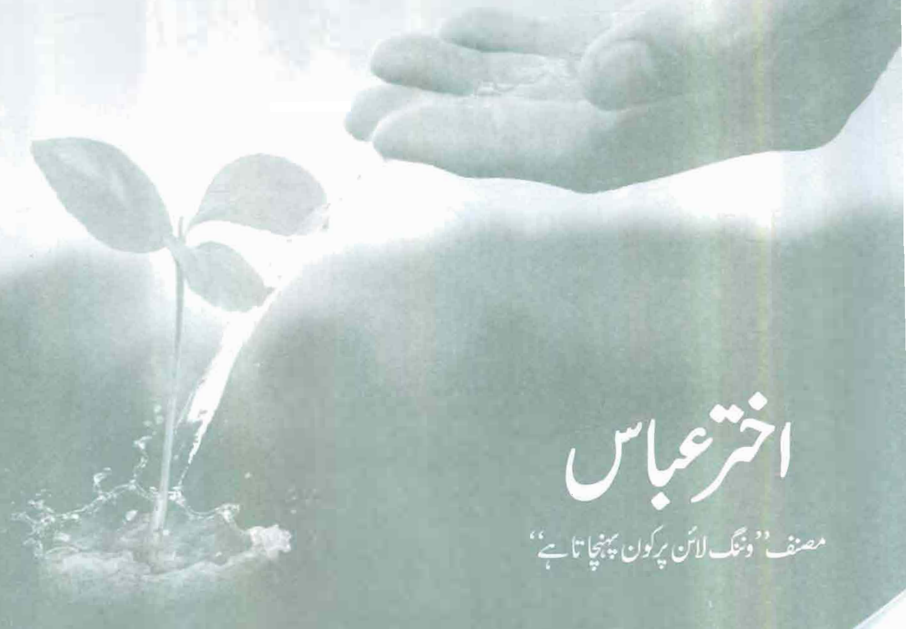

اختر عباس

مصنف "وننگ لائن پر کون پہنچتا ہے"

نسل نو کی تیاری کے آرزو مند اساتذہ کے لئے

ہائی پوٹینشل آئیڈیاز بکس رحمٰن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

042-35424443 , 0332-9468746 highpotentialideasl@gmail.com

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

کتاب	قابل رشک ٹیچر
مصنف	اختر عباس
کمپوزر	ناصر عباس
ڈیزائننگ و پرنٹنگ	کرسٹل آرٹ لاہور 0336-4693871
پبلشر	محمد سلیم
اشاعت	مئی 2015ء
تعداد	1000
قیمت	-/400

سٹاکسٹ

علم و عرفان پبلشرز، اردو بازار لاہور

ادارہ معارف اسلامی، فیڈرل بی ایریا کراچی

ہائی پوٹینشل آئیڈیاز بکس رحمٰن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور

042-35424443 , 0332-9468746 highpotentialideasl@gmail.com

انتساب

اس بیس سالہ استاد کے نام

جو اپنی غربت سے آگاہ تھا اور علم کے لئے اپنی بے پناہ لگن سے بھی
وہ جانتا تھا کہ کوئی اس کی مدد کو نہیں آئے گا، اس کی زبان نے شکوہ سیکھا نہ شکایت
وہ جو چھ سال کی عمر سے اساتذہ کو دیکھنے اور سننے بھاگتا تھا تو لوگ اس پر ہنستے تھے
وہ جو بیس سال کی عمر تک پوری بے سروسامانی کے باوجود بیس ہزار کتابیں پڑھ چکا تھا
وہ جس کے علم کو بیس ہزار سے زائد لوگوں نے سنا، یقیں کیا اور ایمان لا کر اس جیسا بننے کی آرزو کی
وہ جس نے پڑھانا شروع کیا تو شیخ سعدی شیرازی جیسے فاضل، عالم اور قابل فخر شاگردوں کو جنم دیا
وہ جسے اصل نام محمد بن ابوبکر بن ایوب سے کہیں زیادہ امام ابن جوزیؒ کے نام سے جانتے ہیں۔
وہ جس نے عمر بھر نہ کسی سے دشمنی کی، نہ کسی کی بے عزتی کی، نہ کسی پر حملہ کیا اسی ابن جوزی کے نام
جس کے بارے میں ابن الخاطر نے لکھا ''میں نے زندگی بھر کسی اور کو ابن جوزی سے زیادہ محنت اور لگن سے کام کرنے والا نہیں دیکھا'' جو اپنی محنت اور لیاقت سے قرآن وسنت کا ہی نہیں کیمیا اور فلکیات کا بھی استاد بنا، اسی نے ملکی وے اور دھاتوں سے حرارت کے عمل ترسیل کو دریافت کیا۔ اسی نے فقہ وسنہ کے علاوہ قرآن عظیم کی تفسیر بھی لکھی، اس کے زیرِ زمیں دفن ہونے کے بعد بھی برسرِ زمیں اس کا تذکرہ نو سو سال سے ویسا بننے اور ویسی محنت سے عزت پانے کی آرزو رکھنے والوں کے مابین آج بھی پوری محبت اور شدت سے جاری ہے۔ (محمد بن ابوبکر بن ایوب بن سعد ابوعبداللہ ۲۸ جنوری ۱۲۹۲ء۔ ۱۵ ستمبر ۱۳۵۰ء دمشق)

فہرست

ابتدائیہ: پہلی بات 19
باب اوّل: خودشناسی کا لمحہ 33
باب دوم: خودشناسی ایک دلچسپ تصور۔۔۔تصورِ نفس / تصورِ ذات 39
تصورِ نفس 40
انسانی زندگی کے چار حصے 41
جسمانی خودشناسی 41
ساری عمر پالتو کتے کا شوق 42
جانوروں سے ممتاز کرنے والی صلاحیت 44
سماجی خودشناسی 45
تخلیقی خودشناسی 47
تخلیقی خودشناسی کیسے جنم لیتی ہے 49
روحانی خودشناسی 51
اچھی بُری صحبت کا فرق سمجھ آتا ہے 53
والدین کے آگے بولنے کی ہمت اور ان سے محبت 53
جسم بڑی بڑی تبدیلیاں اور روح کی مضبوطی 54
روحانی خودشناسی کی مضبوطی اور خوب صورتی 57
کس کی ناک خاک آلود ہوگی 58
روحانی تصورات صرف دنیا تک محدود نہیں ہوتے 60

جس کا سب احترام کریں!

خود آ گاہی رکھنے والے کا ذکر کیسے ہوگا 60

باب سوم: تصور کامیابی کا تعین 61

خود شناس استاد کی شخصیت کیسے آزادانہ ہوتی ہے: 62

خود آ گاہی کی راہ میں حائل 4 رکاوٹیں 62

عظمت کے جھوٹے احساس سے بھرے لوگ 64

خود آ گاہی کے خلاف مزاحمت کی چھ وجوہات 66

پاپی دل کیسے مان جائے 66

خود شناسی پہ دل کیوں نہیں مانتا 67

خود آ گاہی کیوں اور کہاں ضروری ہے 67

خود آ گاہی کی ترقی 68

شخصی احترام کی ضرورت اور فرق 68

باب چہارم: ہم اپنا فائدہ خود کیوں نہیں کر سکتے !۔۔۔احتسابِ نفس/احتسابِ ذات 71

خود احتسابی کا ایک پسندیدہ پہلو 73

آسان اور قابل عمل طریقہ 73

صوفی تبسم کی اصل شہرت کچھ اور تھی 74

بابا جی نور والے کی حیران کرنے والی بات 75

خود احتسابی کیسے فائدہ پہنچاتی ہے 76

اپنی سونے جیسی خوبیوں سے بے خبر لوگ: 77

تصورِ احتساب کے دو حصے 77

اپنی غلطی نہ ماننے والے لوگ 78

کچھ لوگوں کو احتساب نفس کا فائدہ کیوں نہیں ہوتا 79

خود احتسابی۔ زندگی کے مقاصد کے حصول میں کیسے معاون بنتی ہے 79

وزیر جب اپنی بے عزتی کا سن کر رو پڑے 79

خود احتسابی، ایک خوابیدہ قوت 80

خود احتسابی۔ ایک آسان راستہ یہ بھی ہے 80

سقراط کی کہی خوبصورت بات 81

مجھے اس پر ضرور حیرت ہوتی 82

خود آگاہ اور خود بین عظیم لوگوں کی دنیا 83

عظیم شخصیات جو گمنامی کے گھاٹ اتر گئیں 84

اللہ کے رسول کا فرمان، احتسابِ نفس کی پوری کتاب 84

باب پنجم: بے عزتی سے بہت فرق پڑتا ہے جناب!۔۔۔عزتِ نفس / تکریمِ ذات 85

بارہ سالہ بچی کا تصور عزتِ نفس 87

انسان کی سب سے بڑی دولت 88

نگاہوں سے گرنے کا خوف 88

آنحضور ﷺ کے سامنے شرمندگی 89

کمرہ امتحان میں کیا گیا ایک تجربہ: 89

عزتِ نفس کی کمی (Low self esteem) کا اظہار کیسے ہوتا ہے؟ 90

انکی ہر جگہ بے عزتی ہوتی رہی 91

کتنے ہیں جن کی بے عزتی انہیں بری نہیں لگتی؟ 92

بے عزتی سے بہت فرق پڑتا ہے جناب 93

اندھی زندگی گزارنے کا فیصلہ کیوں ہوتا ہے؟ 93

اپنی عزت۔ اپنے ہاتھ 94

آپ کو اپنی عزت نفس کی کتنی ضرورت ہے	94
انسانی کردار کی کچھ منزلیں	95
باب ششم: خوف کو ہرانا آسان نہیں۔۔۔تصور خوف	97
خودشناسی کا دشمن	98
شخصیت کی روح کھینچنے والا	99
یہ خیال سو فیصد غلط ہے	99
بے خوفی کا فیض پانے والے	100
خوف کو ہرانا آسان نہیں ہے	103
شہری اور دیہی بچوں کے الگ الگ خوف	103
سوچئے! ایک بچے کی شخصیت کس کس خوف کا سامنا نہیں کرتی؟	104
چھپکلی کا خوف کیسے دور ہوا؟	104
بچپن کا بہادر ہی بہادری دکھاتا ہے	105
تکلیف کا سامنا کیوں کرنا پڑتا ہے!	106
پشاور آرمی سکول کے بچوں کی شہادت خوف کیوں نہ بن سکی:	107
خوف کی دوسری قسم فوبیاز	110
خوف، سوچ، صلاحیت اور قوت کو متاثر کرتا ہے	111
جب میں ڈوبتے ڈوبتے بچا	112
گھوڑے سے گرنے کا خوف آج تک نہیں گیا	113
استاد سے ڈرنے والے پر کیا بیتتی ہے؟	114
عادات ہی نہیں راز اور خوف مشترک ہو جاتے ہیں	114
عزت صرف لڑکیوں کی نہیں ہوتی	114

خوف کب کب منفی جذبات میں ڈھلنے لگتا ہے 115

شخصیت مسخ ہونے سے کیسے بچے گی؟ 115

غلطی انسان کے بس میں نہیں 116

کوئی اچھا لگے تو فیصلہ کس بنیاد پر کرتے ہیں 117

وہ تو خوف سے مرنے والے ہو گئے 118

پیر صاحب کی مانو ورنہ مارے جاؤ گے 119

قیامت کے خوف سے وہ ذہنی توازن کھو بیٹھا 120

ان مذہبی باتوں کا خوف جن کی ابھی عمر نہیں آئی 120

غزہ کی خوف زدہ کرنے والی شام 121

ابو بیگ پر پتہ کیوں لکھتے 121

باب ہفتم: اللہ ویسا ہے جیسے آپ سوچتے ہو۔۔۔تصور خالق 123

ابھی اس کی کائناتوں کا شمار ممکن نہیں 126

انکار کرنے والوں کی زندگی 127

مغرب کی اندھی پیروی کرنے والے بیچارے دانشور 127

قبرستان میں گزری ایک رات 128

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کیوں رو دیں 130

کیوں تمہارے دل کی کیا کیفیت ہے 131

میں نے محسوس کیا کہ میرے گال گیلے ہو رہے ہیں 131

ایک مختصر سی بات نے ایمان کا مزہ چکھا دیا 133

انہی کی وجہ سے احادیث سے تعارف ہوا 133

خدا کا حسن سلوک 134

اس سرخ لائن کی طرف قدم ہی نہیں بڑھانا	135
یوں وہ سارے متکبرلوگوں کا سردار بن گیا	136
اللہ کے رسول ﷺ کا خصوصی شکریہ	137
اس واقعہ نے مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا	138
بدقسمتی سے مزنگ بڑے بڑے ''گڑبڑ گوٹالا'' کاموں کا مرکز	139
اللہ صرف پاکیزہ مال ہی قبول کرتا ہے	140
بندہ جب تک رزق پورا نہیں کر لیتا موت نہیں آتی	141
سر! سارے شارٹ کٹ رزق حرام سے کیوں جڑے ہیں!	141
بچوں کی عزتیں لوٹنے والے بدبخت	143
خبردار، ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہے	144
یہ کوئی کتابی باتیں نہیں ہیں	144
کردار، اللہ کی قربت کا اظہار	145
شخصیت کب مضبوط ہوتی ہے	145
ان کے محبوب نے انہیں کہاں جوڑ دیا	146
عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو دانش کیسے عطا ہوئی	146
چھوٹی سی عمر میں خلفائے راشدین کے مشیر خاص	147
جامعہ عباس رضی اللہ عنہ کے اکیلے اُستاد	147
عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی محبت پر تو مجھے رشک آتا ہے	148
معمولی واقعات کا غیر ضروری اثر	148
گھر کے دروازے پر آم کی پیٹیاں	149
میری سفارش میرے اللہ جی!	151

ایک دھوکے کا ماجرا 152
رب نے ایک نقصان چپکے سے میری جھولی میں ڈال دیا 153
اشفاق صاحب کے ساتھ زاویہ 154
اللہ ویسا ہے جیسے آپ سوچتے ہو 155
ذکر الٰہی اور تقرب الٰہی 155
پھر اللہ محبت کرنے لگتا ہے 156
اللہ کی محبوبیت سے دنیا میں محبوبیت 156
اللہ سے ڈرنا اور خوف کھانا کیا ہے 157
دانائی کی اصل اللہ کا خوف ہے 158
یہ مت کہو خدا سے میری مشکلیں بڑی ہیں: 160
کیا خوب دعا ہے: 161
باب ہشتم: خودشناسی کا شجر سایہ دار 163
ظرف، طلب اور علم کے مطابق اضافہ اور کمی 168
خودشناسی کی مرجھائی شاخیں 169
تصورِ ذات کو بدلے بغیر کسی کے رویے کو نہیں بدلا جا سکتا 170
سر! مجھے گائیڈ کر دیں کہ انٹرویو کیسے دوں 171
یہ خودشناسی کی بدترین مثال مانی جاتی ہے 172
خودشناسی، کیریئر اور کردار کی کنجی 173
آپ کے اعتقادات کے نظام میں کیا شامل ہے 173
ہر کام میں آپ کی کارکردگی کیسی ہے 174
جیسا محسوس کرتے ہیں ویسا ہی عمل کرنے لگتے ہیں 174

دونوں ایڈیٹرز کے خواب پورے ہوئے	175
یہ کام مرے لیے صرف ایک ٹاسک نہیں تھا	177
کیا مجھے بال آخر اپنے ابو جی اور دادا جی جیسا بننا ہے	178
خودشناسی میں سفید اور کالے پتھروں کا مقابلہ	179
کیسے بدلتی ہے بڑی سوچ کمزور زندگیوں کو	180
اس کا استاد ایک خاکروب تھا	182
کبھی جو آپ گر جائیں	182
بی کام کے ڈی موٹی ویٹڈ طلباء	184
اس کے بنا چارہ نہیں	184
چشتیاں میں سوشل ورک پر اعتراض	184
لاہور میں پہلا عوامی میلہ	185
آپاں کیڑا افسر لگناں اے	187
سکول کی سطح پر اس تصور کو کیوں سمجھا جائے	188
امام ابن تیمیہ نے قید خانے میں کیا کہا!	188
ایسے میں حاضری کے سوجھتی ہے!	189
اقبال سے نہیں ملے تو اُن کے در و دیوار سے ہی سہی:	192
باب نہم: خودشناس فلسفی اُستاد سقراط۔ موت سے پہلے کیا بولا؟	197
ایتھنز کے لوگ فلاسفر کی باتوں اور تحقیق کے شوقین تھے	198
سقراط اس مقام پر بیٹھ کر لوگوں کے ساتھ دیوی ایتھینیا پر بحث	199
حسد اور خوف دنیا میں فساد پیدا کر دیتا ہے	200
اسپارٹا نے جنگ میں شکست دی اور ایتھنز کی اینٹ سے اینٹ بجا دی	200

اس کی گفتگو کے انداز سے ذہانت ٹپکتی تھی	201
سقراط کے تمام شاگردوں میں بات کرنے اور پوچھنے کا حوصلہ ملتا ہے	201
کائنات میں تعلیم کا یہ طریقہ بھی سقراط ہی سے شروع ہوا	202
زندگی کا لالچ کرنا کہاں کی دانشمندی ہے	202
یہ الزام کس قدر دلچسپ ہے کہ سقراط خدا پر یقین نہیں رکھتا	202
خدا کرے سقراط ظلم کا شکار ہونے والا آخری انسان ہوتا	203
انسان اپنے کردار کا خود مصنف	203
تم لوگ میرے قتل کے بعد میرا نعم البدل نہ پا سکو گے	204
میری مثال ایک ڈنکھی کی ہے	204
کم یا زیادہ دیر زندہ رہنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا	205
بے اصول کے راج پاٹھ میں اصولوں کا قتل سب سے پہلے	205
میں التجا کروں گا نہ ہی گڑگڑاؤں گا	206
عزت نفس سب سے مقدم ہے	206
اے ایتھنز والو! یہی اوباش کل تم پر میرے قتل کا الزام رکھیں گے	206
مجھے اپنے اسلوب میں بات کر کے مرنا کیوں قبول ہے	207
موت کے قریب کیا قدرت پیغمبرانہ قوت عطا کرتی ہے!	208
عظمت و شرافت کیا ہے	208
میری موت اتفاقیہ نہیں ہے!	209
مجھے اپنے قاتلوں سے کیوں ناراضی نہیں ہے!	209
ایتھنز والو! تم ان کو خود سزا دینا	209
تم ان سب کو اسی طرح ستاؤ جیسے میں نے تمہیں ستایا	210
میرے رخصت ہونے کا وقت آن پہنچا	210

ایسے استاد جس عہد میں بھی ہوں گے، یاد رکھے جائیں گے 211
باب دہم: دلوں میں جگہ کیوں نہیں بنتی؟؟؟ 213
آپ نے کبھی جانا ہی نہیں کہ مجھے اس سے مانگنا کیا ہے؟ 214
کبھی لوگ پوچھتے تھے کبھی آنحضور ﷺ بھی پوچھتے تھے 215
جنت میں لوگ فارغ تو نہیں بیٹھے ہوں گے 216
جس سے محبت کرو گے اسی کے ساتھ اٹھائے جاؤ گے 216
محبت بڑی احتیاط سے کرنی چاہیے 217
جب اپنی گواہی کی ضرورت پڑی تو 40 بھی پورے نہ ہوں 218
اتنے عام سے دوستوں میں آپ اتنے خاص کیسے ہو گئے 218
یہ کیسا نقصان بھرا سودا کیا آپ نے۔۔۔۔! 219
اب بوتل وہیں رہ گئی دانت کا مسئلہ بن گیا 220
اب تو Inference اثر پذیری کا زمانہ ہے: 221
آپ کے پاس کیا خوبی ہے کہ کہ لوگ آپ سے محبت کریں؟ 222
علم کی بات کیا کرو، علم سے سینے بڑے ہوتے ہیں: 222
تنخواہ دار ملازموں سے کام لیتے ہیں محبت نہیں کرتے 223
دو بار تو قدرت یہ موقع سب کو دیتی ہے 224
آپ کسی گڈرے سے کیسے کم ہو سکتے ہو 224
ہمارا دل ہی آمادہ نہیں ہوتا 225
فائدہ انہیں کو ہوتا ہے جو فائدہ لینا چاہتے ہوں 226
اور ہم خود اس وقت سوئے رہ جاتے ہیں 226
اگر تم پوری دنیا کے خزانے دے کر میرا کتب خانہ لینا چاہو تو 227
دو سالوں میں 80 شاندار عربی کتابوں کا ترجمہ کر ڈالا 228

جب تم نہ رہو تو لوگ تمہیں یاد کر کے روئیں 229

امام ابو حنیفہؒ سے کسی نے اچھے استاد کا پوچھا تھا 229

عبداللہ بن مبارکؒ نے ایسا علم پہلے کب سیکھا تھا 230

بیٹا! بکریاں نہیں بدلتیں، انسان بدلتے ہیں 231

شخصیت پر پڑے داغوں اور چھالوں کا علاج 232

ہر استاد کے پاس ایک اپنا ''جھاواں'' ہونا لازم ہے 233

دعویٰ کے ثبوت دینے پڑتے ہیں 234

ایک روز کہیں سے ایک بھڑ دعوی لیکر آ گئی تھی 234

یہی استاد ہونے کے دعوے کا مضبوط جواب ہے 235

تشدد آمیز تصور والا شعر 238

جب استاد اتنا بڑا ہو تو شاگرد کس درجے میں ہو گا؟ 238

اب آپ بھی خود شناس پیر بن کر دکھائیں تو بات بنے 237

باب یازدوہم: آپ کیسے یاد رکھے جانا چاہیں گے؟ 239

جب ذات کی خوبصورتی صرف چہرے کی خوبصورتی بن جائے 244

20 باتوں سے خود شناسی میں اضافہ کرنا ممکن ہے 245

دلچسپ منظر کا تکلیف دہ پہلو، اسے کوئی کیسے یاد رکھے گا 247

سرکاری سکولوں میں ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا 249

آپ کو بطور استاد لوگ کیسے یاد رکھیں گے 250

یقین مانیے آپ ایک لمبی عمر پانے والے ہیں 250

بھلا وہ آپ کی راہنمائی اور مشوروں کی قدر و قیمت کیسے بھلا پائیں گے؟ 251

لفظ تو لفظ ہی سکھاتے ہیں آدمی، آدمی بناتے ہیں 253

خود شناسی استاد کی 254

قابل رشک ٹیچر

جس کا سب احترام کریں!

پہلی بات

مال روڈ لاہور پر سالوں پہلے کے دونوں منظر یادوں میں کسی جالے کی طرح آج بھی معلق ہیں اور اتنے ہی برے لگتے ہیں جتنے تب لگے تھے۔ روزنامہ نوائے وقت کا دفتر چیرنگ کراس (فیصل چوک) کے بالکل قریب واقع تھا جہاں میری زندگی کے تیرہ قیمتی اور محبت بھرے سال "پھول" کو خوشبودار بناتے اور پڑھنے والوں کے ذہنوں میں اس خوشبو کو راسخ کرتے گزرے۔ ایک منظر سڑک پہ اپنی جانیں بچانے کے لیے ادھر اُدھر بھاگتے ننھے منّے چوزوں کا ہے جنھیں پولٹری فارم والوں نے مرغی کی قیمتوں میں کمی پر بطور احتجاج اپنے شیڈوں سے لا کر سڑک پر الٹ دیا تھا۔ مال روڈ پر جگہ جگہ کچلے ہوئے اور مرے ہوئے چوزے بکھرے تھے۔ کاروں کی بریکیں چیخ رہی تھیں اور ان سے زیادہ کاروں کے اندر بیٹھی خواتین اور بچے دُکھ، تکلیف اور معصوم چوزوں کی جان لینے کے احساس گناہ سے لرزاں، چیخ رہے تھے۔ تصویریں بن رہی تھیں اور زندہ چوزوں کو مرنے کے لیے لانے اور پھینکنے والے کھڑے مسکرا رہے تھے، تصویریں بنوا رہے تھے۔

بہت سے لوگوں کے لیے بے حسی زندگی کا ایک مضبوط حوالہ ہے، ایسے ظالموں پر یہ پھبتی بھی خوب ہے۔ معصوم پرندوں، جانوروں کی جانوں سے کھیلنے والے وقت آنے پر انسانی جانوں کو بھی اتنی ہی بے رحمی سے کاٹتے اور تکلیف دہ موت سے ہم کنار کرتے ہیں کہ کوئی بھی سلیم الفطرت اس کا تصور کرتے ہوئے کانپ جائے۔ ممکن ہے کچھ لوگوں کے لیے یہ بے رحمی، بے حسی اور بے نیازی

ایک دن کے لیے ہو مگر کچھ انھیں اوڑھ کر جیتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو انسانی گلے کاٹنے والوں کی شکلیں اور اس کارنامے کی گواہی کے لیے خود انہی کی بنائی اور پھیلائی ہوئی ویڈیوز دیکھ لیں۔ یقین کرنے میں آسانی رہے گی۔ خدا جانے ایسے لوگوں نے کن اساتذہ سے یہ سیکھا اور پڑھا ہوتا ہے۔

دوسرا منظر جو میری یادوں کے تہ خانے کی دیواروں پر کسی پرانی تصویر کی طرح ٹنگا ہوا ہے، سینکڑوں ادھیڑ عمر مردوں کا جلوس ہے۔ جس میں موٹی موٹی چادروں میں لپٹی عورتیں بھی شامل تھیں۔ مردوں کے چہروں پر بے نیازی، لاتعلقی اور تھکاوٹ دور سے پڑھی جا سکتی تھی۔ اکثر کے کندھوں پر صافے اور چادریں تھیں۔ کپڑوں اور حلیے سے پہلی نظر میں پہچانا جا سکتا تھا کہ یہ بھی قصبات سے تعلق رکھنے والے ہیں۔ ہم جہاں بھی رہتے اور جیتے ہیں، اسی کا عکس ہمارے چہروں، کپڑوں، دلیلوں اور نعروں میں در آتا ہے۔ یہ ایک تدریجی عمل ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ اتنے بڑے جلوس کے شُرکا پنجاب کے مختلف شہروں سے آئے تھے۔ بینر اُٹھائے خاموشی سے ریگل چوک سے چیئرنگ کراس کی طرف آ رہے تھے۔ ہم دوپہر کے ہلکے پھلکے کھانے کے لیے ریگل چوک آئے ہوئے تھے۔ سرکاری اسکولوں کے اساتذہ کی ایک بڑی تعداد کو یوں سڑکوں پر دیکھ کر افسوس بھی ہوا اور برا بھی لگا مگر جونہی بعض شُرکا سے جلوس کی غرض و غایت سنی تو اور بھی برا لگا۔ صوبائی حکومت پرائمری تعلیم سے متعلق تین لاکھ اساتذہ کو دو ماہ کی چھٹیوں میں بچوں کی بہتر تدریس کے لیے انگریزی پڑھانے کے طریقے سکھانے کی خواہش مند تھی۔ ان کے لب و لہجے اور اندازِ تدریس میں تبدیلی کے لیے کئی ارب روپے مختص کیے جا چکے تھے۔ اساتذہ کی تنظیموں نے اس کا بے حد برا منایا اور سب کو یہی بتایا کہ انگریزی سیکھنے کے بعد حکومت تعلیمی پرفارمنس چیک کرے گی اور یوں نوکریاں ختم ہو جائیں گی یعنی یہ پہلے ہی سے انھیں یقین تھا کہ پرفارمنس اچھی نہیں ہوگی۔ بھولے بھالے سادہ منش اساتذہ نے یہ سوچے بنا کہ وہ اتنے سالوں سے پڑھا رہے ہیں، کچھ نیا سیکھ کر ان کی ذات اور طریقہ تدریس میں بہتری ہی آئے گی، نقصان کہاں سے ہوگا۔ ان کو سکھانے کے لیے انتظامات، ٹرینرز کا ہی نہیں ان سب کے آنے جانے، کھانے پینے کے اخراجات کے ساتھ ساتھ ڈیلی الاؤنس الگ سے ملنا تھا۔ اس

سارے عمل میں فائدہ ہی فائدہ تھا۔ علمی بھی اور مالی بھی، مگر خودشناسی سے محرومی، احتجاجی رویے اور ردعمل کے اندازِ فکر نے دونوں فائدوں سے محروم رکھا۔ جلوس ابھی چیئرنگ کراس نہیں پہنچا تھا جب بعض شرکا کی اشتعال انگیزیوں اور جارحانہ پیش قدمی نے پولیس کے لیے روایتی لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا کر دیا اور انھوں نے بے دریغ اساتذہ کو لاٹھی چارج کا نشانہ بنا ڈالا۔

دور دراز سے لاہور کی سیر کے نام پر جلوس میں آنے والے اکثر اساتذہ کے لیے یہ سب اچانک، غیر متوقع اور نیا ہی نہیں افسوس ناک بھی تھا مگر جیسے ینگ ڈاکٹرز کی روز روز کی ہڑتالوں اور مریضوں سے مسلسل بدسلوکیوں سے تنگ آئے لوگ برملا کہنے لگ گئے ہیں کہ ڈاکٹرز عوام کی حمایت سے ہی محروم نہیں ہوئے، انھوں نے اپنے بڑوں کی سالوں سے بنائی عزت کو بھی اپنے ہاتھوں خاک میں ملا دیا ہے۔ اسی طرح سرکاری اسکولوں کے اساتذہ کی مار سے بھاگے، ان کے پڑھانے کے انداز سے خوفزدہ ہو کر پرائیویٹ اسکولوں کے ہوش ربا اخراجات اور فیس دینے پر مجبور ہونے والے عوام کا اساتذہ پر لاٹھی چارج اور زیادتی پر ردعمل بالکل حیران کن تھا۔

سیکھنے سے انکار بچہ کرے یا بڑا، دونوں میں خودشناسی کی کمی پر افسوس ایک سا ہوتا ہے۔ آخر خودشناسی ہے کیا جو کسی استاد کو بھی زندگی میں بے عزتی سے بچاتی ہے، عزت دلاتی ہے، اس کے درجے بڑھاتی ہے۔ خود مجھے اس خودشناسی کے بارے میں بطور علم پہلی بار تب پتا چلا جب 2003 میں یونیورسٹی آف لاہور جوائن کیے ہوئے چھٹا دن تھا۔ ایم۔ بی۔ اے کی کلاسز کے لیے خصوصی طور پر تیار کیے گئے ابتدائی سیمینار دے چکا تھا۔ دوسروں کی کہی ہوئی کتنی ہی اچھی باتیں انہیں بتا چکا تھا۔ کیریئر ڈویلپمنٹ کے کئی راستے دکھا چکا تھا۔ علامہ اقبال ٹاؤن کی مون مارکیٹ میں رات گئے جا جا کر پروجیکٹر پر چلانے کے لیے اپنے نوٹس کی سلائیڈز بنا بنا کر انھیں متاثر کر چکا تھا۔ زندگی میں آگے بڑھنے کا طریقہ انہیں سکھا چکا تھا، اپنا ذاتی ویژن بنانے کا فائدہ تک بتا چکا تھا۔ ایڈمن بلاک میں انجینئرنگ اور کمپیوٹر سائنس کے قابل اور سخت گیر ڈین پروفیسر فاروق شاہ کے کمرے کے ساتھ متصل آفس میں بیٹھا اگلے روز کے لیے لیکچر ترتیب دے رہا تھا جب اچانک ایک جملے نے کاغذ سے

سب کا سب احترام کریں!

سر اٹھایا اور میرے سامنے میز پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا۔

''تم کیا جانو خود شناسی یعنی سیلف اویئرنیس کیا ہے؟''

اس نے مجھے چڑایا، میں نے خاموشی اور حیرت سے اسے دیکھا

''یہ ایک الگ ہی دنیا ہے۔ لفظوں، ترکیبوں اور جملوں سے پرے مکمل، خود مختار، حیران کر دینے والی، سمجھے!'' اس نے معلومات تو دیں مگر اس کا لہجہ طنزیہ تھا۔

''ایسی بھی کوئی خاص بات نہیں'' میں نے اسے زیادہ بولنے سے ٹوکا۔

''ہمارے شاعر اور مفکر علامہ اقبال نے بہت پہلے خودی، خودداری کی بات کی تھی۔ ہمیں انہوں نے بتا دیا تھا آخر کو خودی، خود شناسی ہی ہے!''

میں نے ذرا تنک مزاجی سے جواب دیا۔

''بالکل نہیں! اس کی تو بہت پرانی تاریخ ہے۔''

''ہاں ہاں!'' میں نے کالر ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ پھر اپنی یادداشت پر زور دیا۔ عربی کا وہ جملہ یاد نہیں آ رہا تھا جسے کسی نے ایک بار حدیث قرار دیا تو ایک دانشور نے تصحیح کی تھی بیٹا عربی کی ہر چیز حدیث نہیں ہوتی۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ

''جس نے اپنے آپ کو پہچانا پس اُس نے اپنے رب کو پہچانا۔ یہ نفس پہچاننا ہی تو خود شناسی ہے۔'' میں نے ذرا فخر سے علم بگھارا۔

اس نے قہقہہ لگا کر میرا مذاق اڑایا۔ ''ارے بابا! تم ابھی پورے پروفیسر بنے نہیں ہو اس لیے بتا رہا ہوں۔ پروفیسر اور استاد بن کر تو اکثر لوگ سننا اور سیکھنا ہی بند کر دیتے ہیں۔ تم ابھی یونیورسٹی میں نئے نئے لیکچرار اور کونسلر بنے ہو۔ نئی باتوں کو شوق سے سن لیتے ہو۔ اس لیے بتا رہا ہوں، خود شناسی (Self Awareness) کی تاریخ تین ہزار سال پرانی ہے۔''

''ہیں!'' میری حیرت دیکھنے والی تھی۔

''میں تو اسے آج کل کی اختراع سمجھ رہا تھا۔ خودشناسی کا لفظ پڑھ کر سن کر، بہت ہوا تو پندرہ بیس سال کا پرانا لفظ اور تصور لگتا ہے۔ میرا گمان تھا کہ کسی میرے ہی ہم عصر نے علامہ اقبال کی شاعری پڑھ کر خودشناسی کی اصطلاح کو الگ کر کے اس پر کام کیا ہوگا۔

وہ کہہ رہا تھا'' یہ تصور تو یونان کے بادشاہوں اور ان کے درباروں میں موجود تھا۔ حتیٰ کہ دربار میں موجود ستونوں پر کھدے لفظ جو پڑھے جا سکے ہیں۔ وہ ہیں Thy yourself یعنی اپنے آپ کو جانو۔ اپنے آپ کو پہچانو۔ اپنی صلاحیتوں اپنی خوبیوں کا فہم اور ادراک پاؤ، اپنی کمزوریوں کا احساس کرو۔''

اس نے لمبی سانس لینے کے لیے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی

''ارے بابا اب ڈراؤ تو نہیں، یہی تو خودشناسی ہے، خود احتسابی، خود اعتمادی، خود انحصاری، خود داری اور خود توقیری یہ سب خودی کے ہی حصے اور بچے ہیں۔ اسی پودے پر لگنے والے خوش رنگ اور دل پذیر پھول ہیں۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اسے بتانا چاہا مگر وہ مسلسل بول رہا تھا۔

''اس صدی تک آتے آتے اس لفظ کو نئے معنی اور مفہوم پہنا دیے گئے۔ جو اتنے مکمل تھے کہ لگنے لگا جیسے صدیوں سے اس لفظ کا یہی مطلب اور مفہوم ہے جو تم لوگ لے رہے ہو۔''

''تم مسکرائے کیوں تھے؟'' اس نے لمحہ بھر کو بات روک کر مجھ سے پوچھا

''اصل میں مجھے ایک دکان پر لگا ایک بورڈ یاد آ گیا تھا'' میں نے اسے بتایا ''لکھا تھا مسلمانوں کی شاندار ایجاد، تاریخ میں پہلی بار'' میں بڑے اشتیاق سے آگے بڑھا تھا کہ شکر ہے مسلمانوں میں دوبارہ سے ایجادات کا شوق زندہ ہونے لگا ہے۔ لکھنے پڑھنے کی طرف راغب ہوں گے تو نوع انسانی کے لیے کام کی چیزیں بنائیں گے۔ سامنے شیشے کے ریک پر پلاسٹک کا ایک چھ انچ کا پین ہولڈر پڑا تھا۔ اس پر لکھا تھا'' تاریخ میں پہلی بار مسواک ہولڈر۔ آپ اسے جیب میں بھی ڈال سکتے ہیں، قلم کی طرح جیب پر لٹکا سکتے ہیں۔ خوش خبری، سبز رنگ میں بھی دستیاب ہے۔''

اس نے برا سا منہ بنایا اور کتاب کے صفحوں میں واپس جاتے ہوئے بولا۔

''خودشناسی تو دور کی بات تم لوگوں سے عقل کی بات کرنا ہی کس قدر مشکل ہے، ذرا کام کی بات سامنے آئی نہیں کوئی نہ کوئی غیر متعلقہ، غیر معیاری جوک سنا کر سارا مزہ خراب کر دیتے ہو، یہ ہے تمہاری کل خودشناسی۔ اکثر تو عالم یہ ہوتا ہے کہ نہ بات کے آغاز کی خبر ہوتی ہے نہ اختتام کی، جب اور جہاں جی چاہا۔ اقبال کا شعر لگا دیا۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے

اور سمجھ لیا کہ خودشناسی کا باب مکمل ہوا۔ حالانکہ ایسا کہنے سے تو خودشناسی شروع بھی نہیں ہوئی ہوتی۔'' یہ کہہ کر وہ ناراضی سے کتاب کے صفحات میں واپس چلا گیا۔

سچی بات تو یہ ہے کہ اس کے مشاہدے سے مجھے پورا اتفاق تھا اور دل یہ کہہ رہا تھا، دیکھا! اسے کہتے ہیں سو سنار کی ایک لوہار کی مگر اس لمحے تو خود میری اپنی خودی اور خودشناسی پہ کاری ضرب پڑی تھی۔ اس لیے میں نے بھی اسے جانے سے نہیں روکا مگر ہوا یہ کہ اس اتفاقی حادثے نے مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا۔ بے علمی اور لاعلمی میں کافی فرق ہے۔ آنے والے کئی ہفتے اس فرق کو مٹانے میں صرف کر دیے۔ ساتھ ساتھ نوٹس لیتا رہا۔ نکات لکھتا رہا۔ اس موضوع پر لکھی کتابیں پڑھتا رہا۔

''خودشناسی یعنی سیلف اویئرنیس'' کو جان لینے کا یہ طوفان اس عالم میں تھا کہ میرے کمپیوٹر میں پی جی اینڈ ڈی کا ایک نیا کورس بن چکا تھا۔ ''پرسنل گروتھ اینڈ ڈویلپمنٹ'' کے نام سے یہ پروگرام یونیورسٹی میں آفر ہوا تو سب حیرت سے دنگ رہ گئے۔ دو دنوں میں ڈیڑھ سو طلبہ انرول ہو چکے تھے۔ یعنی جنھوں نے پورا سمیسٹر یہ مضمون پڑھنے کے لیے فیس جمع کرادی تھی اور جن کے اندر یہ خواہش اور آرزو تھی کہ وہ خود کو جانیں۔ اپنی خوبیوں کو سنواریں۔ اپنی خامیوں کو پہچانیں۔

خودی کے لفظ کو پڑھنے سے جو کیفیت ہوتی ہے خود کو جان لینے کے بعد وہ اس قدر جلد کیوں بدل جاتی ہے۔ یہی وہ سوال ہے جسے ون ملین ڈالر کا سوال کہا جا سکتا ہے کیونکہ آنے والے دنوں کی خوشیاں، کامیابیاں سکھ، دکھ، ترقیاں اور ناکامیاں سب اسی سے جڑی ہوئی ہیں۔ خودشناسی ہو تو خود احتسابی بھی ممکن ہوتی ہے۔ خوداعتمادی ہو تو خودانحصاری کی منزل پہ پہنچنا ممکن ہو جاتا ہے۔ خودداری

ہوتو خود کی عزت کرنا بھی آ جاتا ہے۔ اب تو یہاں تک کہا جانے لگا ہے کہ عزتِ نفس یعنی Self Respect سب کامیابیوں کی ماں ہے مگر یاد رہے اسے خودداری جنم دیتی ہے جو انگریزی میں Self esteem کہلاتی ہے اور اردو میں خود توقیری کا نام پاتی ہے۔

گیارہ سال پہلے سیلف اویئرنیس کے جس لفظ سے متعارف ہوا تھا۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس بارے میں اتنا کچھ جاننے کے باوجود، پھر بھی تشنگی باقی ہے۔ 2015 کے اوائل میں بارہ ہزار اساتذہ کی تربیت کیلئے شروع کیے گئے احساس پراجیکٹ کے لئے کام کرتے ہوئے اساتذہ کی خود شناسی کے موضوع پر اردو زبان کی پہلی کتاب تیار ہوتی گئی۔ اس کو سوچتے اور لکھتے ہوئے اسی علمی اور عملی تشنگی کو مٹانے کی کوشش کی ہے جس کا ہمیں ہی نہیں آج کے ہر درد دل رکھنے والے استاد کو زیادہ شدت سے سامنا رہتا ہے۔ اس کتاب کو نہ صرف علمی طور پر دلائل سے ہمکنار کیا ہے بلکہ اپنی زندگی کے مشاہدات اور تجربات سے بھی سجایا ہے تاکہ آج کا استاد خود شناس اسے سمجھ کر، اچھی طرح جان کر اپنی شخصیت کی نئے سرے سے تعمیر کر سکے، اسے زیادہ خوبصورت اور دل پذیر بنا سکے، یوں اسکی شخصیت ایک ایسا شجر سایہ دار بن سکے گی جس کی شاخوں پر خوبیوں، عادتوں، صلاحیتوں اور اقدار کے کتنے ہی خوش رنگ پھول کھلے اپنی بہار دکھا رہے ہوں گے اور اپنے پرائے سبھی ان کو محبت بھری نگاہوں سے دیکھ کر اس کی دنیا اور آخرت کی کامیابی کے بارے میں اطمینان کا اظہار کر رہے ہوں گے۔

کچھ عرصہ قبل جب میانوالی کے رائل ان ہوٹل میں اساتذہ کی تربیت کے لیے منعقدہ ایک ورکشاپ میں جہاں ہیلپنگ ہینڈ آرفن کیئر پروگرام کے زیر اہتمام دو کلسٹرز سے آئے پچاس کے لگ بھگ اساتذہ کو بنیادی باتیں بتا چکا تو میری دلیل یہی تھی کہ صدیوں سے یہی ہوتا آیا ہے کہ بچہ کوئی بڑی غلطی کرے تو اس کی ذمہ داری ماں باپ پر اور عملی، ادبی کوتاہی کا مرتکب ہو تو استاد اور اس کی تربیت کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے آنے والے ہر دن اسکولوں سے پڑھ کر نکلنے والے لاکھوں کامیاب بچوں سے شکایات کا گراف بھی بڑھ رہا ہے۔ نہ انھیں دین سے محبت ہے، نہ ملک سے دلی لگاؤ ہے اور نہ اپنے والدین کی عزت اور اور نہ استاد کے احترام کا مکمل پاس اور ادراک ہے، کیا اس

سلسلے میں ویسی ہی فوری توجہ کی ضرورت نہیں ہے، جیسی حادثے کے بعد 1122 کے ایمرجنسی یونٹ کے جوان دیتے ہیں۔

استاد سرکاری اسکولوں کے ہوں یا پرائیویٹ اداروں کے، ان کی عزت تنخواہ کی کمی بیشی ادارے کے چھوٹا بڑا ہونے سے بالکل نہیں جڑی ہوتی۔ صرف سلیبس کی کتب سے انسانی شخصیت کی تعمیر ممکن ہوتی تو ان کتابوں کو چھاپنے اور بائنڈ کرنے والے بھی اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ ہو چکے ہوتے۔ یہ تو استاد کی ذات ہوتی ہے جو شخصیت کی تعمیر کرتی ہے۔ یوں سمجھئے بچے کی تعمیر ذات کرتی ہے۔ اسے علم، حلم، نگاہ اور کردار دیتی ہے۔ علم کی جستجو سکھاتی ہے۔ صاحب دل اور صاحب نگاہ بناتی ہے۔ وسعت دل اور وسعت قلب دیتی ہے، وضع دار استاد کے شاگردوں میں بھی ویسی ہی ملایمت، وضع داری اور شائستگی ہوتی ہے۔ اگر بچے علم سے بھاگ رہے ہیں اور تربیت کے لیے کسی کی سنتے نہیں اور اپنی عملی زندگی میں ناقابل بھروسہ اور ناقابل اعتبار ٹھہر رہے ہیں تو اس کی ساری وجوہات تو دیکھنا ہوں گی کہ آخر کہاں بنیادی کمی رہ رہی ہے۔

میری گزارش یہی تھی کہ چلیں پہلے یہ طے کرتے ہیں کہ آپ جیسے خود شناس استاد سے پڑھے ہوئے بچے میں کیا پانچ باتیں ایسی نہیں ہوں گی جو کسی صورت آپ کو پسند نہیں اور اس کی ذات کا حصہ نہیں بنیں گی۔ اس پر ایک دلچسپ سرگرمی اور مشق ہوئی۔ حیرت اس پر تھی کہ کبھی کا یہ کہنا تھا کہ کبھی اس طرح سوچا ہی نہیں۔ ہر طرف سے" روز سبق یاد کرانا، لیٹ نہ آنا، دیانت دار ہونا" قسم کے جوابات آنے لگے تو ہنستے ہنستے بات سمجھ آنے لگی کہ پڑھانے کا مقصد ہی واضح اور متعین نہیں ہو گا تو اچھا حاصل وصول جسے آؤٹ کم کہتے ہیں کیسے نکل سکتا ہے۔

گروپ بنا کر مشق کی تو باتیں کچھ اور واضح ہونے لگیں۔ 50 کے قریب ایسی باتیں سامنے آئیں جو بچے کی شخصیت میں استاد آنے سے روک سکتا ہے۔ اگر وہ اس پر بات کرے۔ دلائل اور واقعات لائے، اپنے ایمان کے ذخیرے سے حوالے لائے۔ بچوں سے سرگرمی کروائے۔ خود طے کیے ہوئے اصول، زندگی بھر نہیں بھولتے۔ دوسری سرگرمی پانچ ایسی خوبیوں کی تلاش تھی جو ہر صورت

میں آپ سے پڑھے ہوئے بچے میں ہوں گی۔ یہ کام کتاب، اسکول یا ہیڈ ماسٹر صاحب نہیں کریں گے، ٹیچر ہی سوچے گا۔ وہی اپنا ہدف طے کرے گا۔ اپنی زندگی کی خوشی، محبت، کامیابی اور موت کے بعد کی کامیابی بھی اسی سکھانے میں پائے گا۔ جب لوگ اس کی یادوں میں ان خوبیوں کا تذکرہ کریں گے کہ وہ استاد بہت دیالو تھا۔ عام سی باتوں میں بھی کچھ خاص پڑھا جاتا تھا۔

میرا ماننا یہ ہے کہ سخاوت صرف روپے پیسے کی نہیں ہوتی اصل سخاوت تو ان لفظوں، حرفوں کی ہوتی ہے جو آپ خوشی سے یوں کرتے ہیں کہ لینے والوں کی زندگیاں شاداب اور آباد ہو جاتی ہیں۔ ایک بار جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب سے پوچھا ''بتاؤ سب سے بڑا سخی کون ہے؟ صحابہ کرامؓ بھی خوب تھے، جب آنحضور ﷺ کوئی سوال کرتے جس کا مقصد تعلیم دینا اور سمجھانا ہوتا تو صحابہ عرض کرتے ''اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔'' یہ جواب سن کر آنحضور ﷺ نے فرمایا:

سب سے بڑا سخی تو اللہ تعالیٰ ہے۔ پھر پوچھا اس کے بندوں میں کون ہے؟

صحابہ کا انتظار ختم ہوا تو فرمایا ''اس نے اپنے بندوں میں اپنے رسول محمد ﷺ کو سب سے بڑا سخی بنایا''۔ پھر پوچھا میرے بعد کون سب سے بڑا سخی ہے؟ صحابہؓ کی وہی خاموشی تھی، ارشاد فرمایا ''میرے بعد سب سے زیادہ سخی وہ ہے جس نے علم حاصل کیا پھر اسے پھیلایا۔ ایسا شخص قیامت کے روز پوری اُمت بن کر اُٹھے گا۔'' ٹریننگ میں شریک اساتذہ یہ سن کر کھل اٹھے۔ سچ تو یہ ہے کہ دنیا میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے زیادہ موٹیویٹ (Motivate) کرنے والا کوئی نہیں ہے اور ہم کسی بھی عمر میں ہوں ہمیں خود کو ترغیب اور موٹیویشن چاہیے ہوتی ہے۔

میٹرک میں ہمارے کلاس ٹیچر فقیر محمد نظامی صاحب تھے۔ سادہ سے، اپنے کام سے کام رکھنے والے، ان کی عینک ناک پر دھری رہتی، وہ گورنمنٹ ہائی اسکول R-6/132 کے ان اساتذہ میں تھے جن کے کپڑے روز استری کا منہ بھی دیکھتے تھے۔ وہ موٹر سائیکل پر ایک قریبی گاؤں سے آتے تھے اور مزے کی بات یہ ہے کہ ہمیشہ بروقت آتے تھے۔ ہمارا ایک کلاس فیلو لیاقت اکثر غوطہ کھا جاتا تھا۔ ایک روز اُسے بتانے لگے ''جب طالب علم اپنی درس گاہ کی طرف جاتا ہے تو فرشتے اس کی راہ میں

اپنے پَر پھیلاتے ہیں۔تم چھوٹے موٹے کام چھٹی والے دن کرلیا کرو۔فرشتے انتظار میں تنگ ہوتے ہوں گے۔اسکول آنے میں کوتاہی نہ کیا کرو۔یہ تو برکت ہی برکت ہے۔" وہ بھی موڈ میں تھا کہنے لگا" ماسٹر صاحب!وائی بیجی (کھیتی باڑی) ہی کرنی ہے اتنی تعلیم تو حاصل کرلی ہے،روز روز آکر کیا کرنا ہے!" انھوں نے عینک کوتھوڑا نیچے کیا اور غصہ دباتے ہوتے بولے" ہاں ہاں تو نے اتنی اعلیٰ تعلیم حاصل کرلی ہے کہ اب کئی نسلوں تک تعلیم کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی۔" "اعلیٰ تعلیم" پہ انھوں نے دو تین دفعہ زور دیا پھر بڑے تاسف سے بولے"اسلام نے جس قدر محبت اور شدت سے علم کا شوق دلایا ہے۔ہمارے مسلمان بچے اتنا ہی علم سے دور بھاگتے ہیں۔مجال ہے کورس کی کتاب بھی پوری پڑھ لیں۔لائبریری جاکر پڑھنا تو خواب ہی ہوگیا ہے۔کبھی دنیا میں تقریباً سارے ہی اہل علم اور سائنسدان مسلمان ہوتے تھے۔آج ڈھونڈے سے کسی کا نام نہیں ملتا اور اب یہ لیاقت علی بھی کہتا ہے کہ ماسٹر صاحب کافی تعلیم حاصل کرلی ہے۔"

ہمارے جنت مکیں ہیڈ ماسٹر چودھری محمد انور صاحب کہا کرتے تھے"علم کی بھی ایک ذات برادری ہوتی ہے جو اس کی تلاش کرتا ہے،جستجو کرتا ہے،حضرت علیؓ کے بقول اپنی ہی میراث کو ڈھونڈتا ہے۔علم حاصل کرو چاہے مشرکین سے ہی کیوں نہ ملے۔علم سیکھنے کو عیب نہ جانو۔آپس میں بھی ملو جلو تو علم کا چرچا کرو ورنہ علم جاتا رہے گا۔علم تو ذکر کرنے،مذاکرہ کرنے سے بڑھتا ہے مگر کیا کریں اب ہم اور ہمارے اکثر اساتذہ تو اسکول آنے پر ہی تیار نہیں ہوتے اور آجائیں تو ان کا موڈ اور موضوعات ہی قابو نہیں آتے۔

اپنے سکول سے فارغ ہونے کے بہت سالوں بعد 2001ء میں ایک روز میں نوائے وقت آفس بیٹھا کام کررہا تھا تو استقبالیہ سے فون آیا کہ چیچہ وطنی کے کسی گاؤں سے ایک لڑکا آپ سے ملنے آیا ہے۔میں نے کہا بات کروادیں،میں دفتر میں کام کے دوران ہمیشہ جوتے اتار کر بیٹھنے کا عادی ہوں۔ملاقاتی کالج کے ابتدائی سال کا طالب علم تھا اور بڑی دور سے ملنے آیا تھا۔یہ دونوں باتیں اہم تھیں مگر جونہی اس نے کہا میں فقیر محمد نظامی کا پوتا ہوں،میں ننگے پاؤں لفٹ کی طرف لپکا

تھا۔اس بچے کولفٹ کے دروازے پر وصول کر کے آفس لایا۔کھانا کھلایا، چائے پلائی پھر پوچھا کیسے آنا ہوا؟ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا

''دادا واقعی آپ کے ٹیچر تھے؟''

''بے شک!'' میں نے پوری محبت سے جواب دیا۔

''اتنی دور سے صرف یہی تصدیق کرنے آیا ہوں۔ وہ کئی سالوں سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ گھر میں فارغ ہی ہوتے ہیں۔ وہی بار بار ذکر کرتے ہیں میرے شاگردوں میں سے ایک اچھا بھی نکلا ہے، اس کے تو والد بھی بہت اچھے تھے۔ وہ ڈائریکٹر سکولز بننے سے پہلے ہمارے ہیڈ ماسٹر تھے انھوں نے کبھی اپنے بچے کے لیے بھی رعایت کا ایک لفظ نہیں کہا تھا۔ جب ضلع کی کھیلوں کے مقابلے ہوتے تو سارے اسکول ٹیموں میں جعلی لڑکے ڈال کر جیتنے کی کوشش کرتے تو وہ کہتے'' اپنے بچے تیار کر لیں۔ جیت گئے تو انعام ہے، نہ جیتے تو شرمندگی اور شرمساری تو نہیں ہوگی۔ جعل سازی استاد کو اپنی ہی نہیں شاگردوں کی نظر سے بھی گرا دیتی ہے۔''

''سربراہ اچھا ہو تو رعایا بھی اچھی بن جاتی ہے۔'' میں نے اسے بتایا کہ اچھا استاد صرف سلیبس نہیں پڑھاتا، اتنے سالوں بعد مجھے سمجھ آیا ہے کہ اصل زندگی وہی سکھاتا ہے۔ قرآن پڑھنے کی طرف بھی وہی متوجہ کرتا ہے۔ نمازوں کی ترغیب بھی وہی دلاتا ہے۔ اللہ رسول کی سچائی سے بھی وہی جوڑتا ہے۔ ملک سے محبت بھی وہی سکھاتا ہے اس کے پاس اچھی سوچ اور عمدہ بات ہوگی تو ہی وہ اپنے بچوں کو دے سکے گا۔ ورنہ ہر ڈگری کے ساتھ پڑھنے والے کی گردن موٹی اور اخلاق چھوٹا ہوتا جاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے یہی زندگی کا حاصل تھا۔ اب ڈگری مل گئی تو اور کیا چاہیے۔ پھر وہ جہاں جاتا ہے، جب موقع ملتا ہے دھوکا دیتا ہے۔ اعتبار توڑتا ہے۔ دل چراتا ہے پھر سر راہ لٹا دیتا ہے، جھوٹ اور مکر اس کا اوڑھنا بچھونا بنتا ہے۔ خوشامد سے وہ اپنی کمزوری کو چھپاتا ہے اور بار بار اپنے ان اساتذہ کے لیے شرمساری کا باعث بنتا ہے، جنھوں نے اسے صرف کتاب کے سبق تو پڑھائے تھے مگر زندگی کا حصہ بننے والی اعلیٰ درجے کی باتیں سکھانا بھول گئے تھے۔ زندگی میں بدصورتی کا باعث بننے والی

عادتوں اور باتوں کو بتانے کی شعوری کوشش ہی نہ کر سکے۔ تبھی تو کتنے لوگ بڑے ہو کر اپنے رشتوں اور اپنی قدروں کو مال روڈ پر چوزوں کی طرح پھینک کر اُن کے مرنے کا تماشا کرتے ہیں اور دُکھی بھی نہیں ہوتے۔

ایک مشہور عرب دانشور اور اسکالر خلیل بن احمد کہا کرتے تھے ''علم اساتذہ کی صحبت سے بڑھتا ہے، جو اپنا علم کم علموں کو دیتے ہیں اور عالموں سے خود علم لیتے ہیں۔ اس طرح علم محفوظ بھی رہتا ہے اور بڑھتا بھی ہے۔ جبکہ جہل دور ہوتا ہے۔'' اسی لیے تو شاگرد اپنے استاد کا پرتو یا عکس بننے کی کوشش کرتا تھا، دوسروں کی شکایتیں کرنے والے، حکومتوں سے نالاں، افسروں کے خلاف غصے سے بھڑکنے والے اپنا وقت تو پورا کر لیتے ہیں مگر کسی دل اور کسی یاد میں جگہ نہیں پاتے۔ گزشتہ دس سال میں نے پورے دل سے علم کو صرف چاہا نہیں، بلکہ سیکھا، حاصل کیا اور اب لکھنے پڑھنے کے علاوہ علم کے سوتوں اور چشموں پر بیٹھے اساتذہ سے تبادلہ خیال کرتے ہوئے مزید سیکھنے اور انھیں سکھانے کی عملی شکلیں نکالنے میں مصروف ہوں تو اس کی اپنی لذت، خوشی اور اطمینان ہے۔ سچ کہوں تو میرے لیے یہ ایک مسلسل عبادت جیسا عمل ہے جو ام درد کرتی تھیں

حضرت ام دردؓ اور ان کے شوہر حضرت ابو دردؓ بے انتہا پرہیز گار بلکہ یکتائے روزگار تھے۔ حضرت عثمانؓ کے دور خلافت میں شام میں تھیں جب انھیں رب کی طرف واپسی کا بلاوا آیا۔ وہ اپنے میاں سے دو سال پہلے فوت ہوئیں۔ حافظ ابن عبد البر نے لکھا ہے کہ ام دردؓ بڑی عاقلہ، فاضلہ اور صائب الرائے استاد تھیں۔ ایک روز عون بن عبد اللہ اور ان کے ساتھی ملنے آئے اور دیر تک بیٹھے سوال و جواب کرتے اور سمجھتے رہے۔ اٹھنے لگے تو معذرت کی کہ آج آپ کا بڑا وقت خراب کیا۔ ممکن ہے آپ تھک گئی ہوں، اکتا گئی ہوں۔ ام دردؓ نے کہا نہیں تم لوگ ایسا نہ کہو۔ ہر کام میں میری نیت عبادت کی رہتی ہے اور علمی بات چیت سے زیادہ مجھے کسی اور کام سے آسودگی حاصل نہیں ہوتی۔

جب جب ام دردؓ کی یہ بات یاد آتی ہے تو جی چاہتا ہے، کاش تمام اساتذہ کے اندر یہی جذبہ

خون کی طرح دوڑنے اور اپنا رنگ دکھانے لگے۔ طبقات ام سعد میں لکھا ہے کہ استاد ابوعبدالرحمن درس دینے اور باجماعت نماز کی ادائیگی کے لیے ہمیشہ مسجد میں بیٹھے رہتے حتیٰ کہ آخری عمر میں بیماری حد سے بڑھی تو عزیزوں نے کہا خدارا! اب تو گھر چلیں۔ مرض الموت میں بولے "میں نے اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد سنا تھا کہ جو مسجد میں نماز کے انتظار میں رہتا ہے گویا وہ نماز کی حالت میں ہی ہوتا ہے اور فرشتے اس کے لیے دعائے رحمت کرتے رہتے ہیں۔ عزیزو! جب یہ بات ہے تو کیوں نہ میں مسجد ہی میں مروں ..." ایسی بات سننا آسان، اسے پڑھنا آسان تر ہے۔ مگر ویسے بننا اور محسوس کرنا بے شک آسان نہیں ہے مگر خودشناسی سے بھری قابل رشک زندگی یہی ہے

زندگی کبھی بھی آسان نہیں ہوتی، خاص طور پر استاد کا بڑھاپا۔ کئی سال پہلے کی وہ رات بہت دکھ دینے والی تھی جب فون کی گھنٹی بجی، میں نے خوشدلی سے سلام کہا۔ جواب میں خاموشی تھی پھر سسکیاں سنائی دیں۔ میں نے گھبرا کر کہا: اللہ آپ پر مہربان رہے، آپ کون ہیں؟ کس نے آپ کو درد دیا۔ ایک گھٹی ہوئی آواز آئی تھی۔ بیٹا میں ریٹائرمنٹ کے بعد ایک ٹوٹے بنچ کی طرح پڑا ہوں۔ آج میرا پوتا لاہور سے گھر آیا ہے تو سمجھو مجھے اٹھا کر آگے لے آیا ہے۔ وہ کہتا ہے میرا دادا تو بڑا سچا ہے۔ تبھی تو اس کے پوتے کی اتنی عزت ہوئی ہے۔ یہ میرے ساتھ لاہور جاتا تو اس کی عزت تو مجھ سے کہیں زیادہ ہوتی......" وہ فقیر محمد نظامی تھے۔ اپنے پوتے سے اچھی طرح ملنے پہ خوش اور شکر گزار تھے، ان کے آنسوؤں سے ان کے سارے جملے ہی نم دار ہو گئے تھے۔ آنکھیں میری بھی نم تھیں مگر نظامی صاحب کے لیے نہیں، اپنے لیے۔ آنے والے برسوں جب میرا دل بھی کرے گا کہ کوئی مجھے بھی یوں خوشی عطا کرے۔ میرے پیاروں کو بھی یونہی پیار کرے، میری تنہائی اتنی جان لیوا نہ ہو مگر کیا کریں یہ دکھ ہر استاد کو سہنا پڑتا ہے، اس آزمائش سے گزرنا پڑتا ہے کہ جہاں اسے بھلا دیا جاتا ہے۔ شاید اسی لیے میں پورے دل سے آرزومند رہا ہوں کہ ٹیچنگ ہو یا ٹریننگ یا آج کے لفظوں میں مینٹورنگ (Mentoring)، خیر کا سلسلہ کبھی مجھ سے نہ رکے، نہ ٹوٹے۔ اس کے لیے چاہے مجھے میانوالی، زیارت، پشاور اور بھکھر ہی کیوں نہ جانا

پڑے۔ ورنہ خوفناک سچ یہی ہے کہ یادوں کے تہہ خانے میں زندگی کے آخری سانس لیتے ہوئے کسی بوڑھے ٹوٹے بنچ کی طرح پڑے ہونے کا احساس بوڑھے استاد کو مرنے سے پہلے ہی مار ڈالتا ہے اور میں اس طرح تو بالکل نہیں مرنا چاہتا۔

اختر عباس
چیف انسپائرنگ آفیسر بائی پوٹینشل آئیڈیاز
80۔جی بلاک سبزہ زار لاہور 0300 9468746
یکم مئی 2015

www.KitaboSunnat.com

1

باب اوّل

خود شناسی
کا لمحہ

''دولے شاہ کا چوہا بننے اور بنانے کا فیصلہ انسان خود کرتا ہے''

ڈاکٹر فرید کی بات سن کر میرے پورے وجود نے جھرجھری لی۔ انسانی وجود اور خدائی نعمت کی اس اعلانیہ ناشکری کو دیکھ کر جو حال ہوا کرتا ہے، وہی اس لمحے سن کر میرا ہوا تھا۔ ''مجھ سے تو انہیں کبھی نظر بھر کر نہیں دیکھا جاتا، خدا جانے لوگ یہ ظالمانہ فیصلہ کیسے کر لیتے ہیں اور کسی ایک خوبصورت اور پیارے سے وجود کو چوہا بنا کر رکھ دیتے ہیں۔

ڈاکٹر فرید جسمانی ہی نہیں، روحانی اور کتابی معالج بھی ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے پاس جانے اور ملنے کے لیے کسی بیماری کا ساتھ ہونا ضروری نہیں۔ انہوں نے ایک عمر ''اردو ڈائجسٹ'' میں گزاری۔ گذشتہ کئی سال سے سکالرز کالج میں اُردو کے استاد ہیں۔ شام کو علامہ اقبال ٹاؤن میں کلینک کرتے ہیں۔ کلینک کیا کرتے ہیں دل کی تاروں پہ ہاتھ رکھتے ہیں۔ دل میں کشادگی اور آمادگی ہو تو ان کے پاس سے خالی ہاتھ نہیں آیا۔

اس روز ایک سمارٹ سا نوجوان ان سے علیحدگی میں ملنے آیا تھا، چپ چاپ سر جھکائے، وہ کتنی ہی دیر بیٹھا رہا۔ اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی اور ہونٹوں پر کپکپاہٹ، وہ کالج میں ان کا طالب علم رہا تھا اور آج معافی کا طلب گار ہو کر آیا تھا۔ اس کے آنے سے پہلے ہماری بات ہو رہی تھی جب میں نے پوچھا۔

ڈاکٹر صاحب! ایسے بدقسمت جن کے بڑوں نے ان کے سروں پہ لوہے کے خول چڑھا کر ذہن اور سر کی نشوونما روک دی ہو۔ جن کے سر چھوٹے رہ گئے ہوں اور جسم بڑے ہو گئے ہوں وہ جو دور سے ہی دولے شاہ کے چوہے لگتے ہیں، شاید بہت زیادہ نہیں ہوں گے مگر ایسے لوگ تو بہت زیادہ ہیں بظاہر جن کے سر بڑے ہوتے ہیں مگر ان میں کسی تازہ خیال کی روشنی جاتی ہے، نہ، کسی نئی بات

کے لیے آمادگی اور قبولیت ہوتی ہے۔ان کے پاس 21ویں صدی کے سوالوں کا تو کیا جواب ہوگا ۔بہت سے تو ابھی تک انیسویں صدی کے سوالوں میں ہی الجھے ہوئے ہیں۔ان کا کیا ہوگا؟ چھوٹے کائی زدہ ذہن، ادھر کوئی نئی بات سامنے آئی اُدھر ذہن میں لگی پرانی پھپھوندی سے پھسلتی ہوئی باہر۔ کیسی آمادگی کیسی قبولیت! خودآ گاہی کی نعمت سے محروم، خودشناسی سے کوسوں دور۔"

''ہاں! کچھ ایسا ہی ہے۔جس لمحے انسانی ذہن میں، خودآ گاہی جگہ بناتی ہے..... اپنا تجربہ اور مطالعہ رنگ جماتا ہے۔سوچنے اور غور کرنے سے رنگ ہی اور نکل آتا ہے۔ذہن بڑا ہونے لگتا ہے۔ دولے شاہ کے چوہوں کی صف سے نکل کر انسانوں میں شامل ہو جاتا ہے کہ ربِ اعلیٰ نے اسی خوبی کا فرق بنایا ہے۔دولے شاہ کا چوہا بننے اور بنانے کا ظالمانہ فیصلہ انسان خود ہی کرتا ہے''۔

ایک سورج مشرق سے طلوع ہوتا ہے تو ایک سورج اس انسانی ذہن میں بھی روشنی لاتا ہے جہاں اپنی غلط سوچ پہ اصرار ہو، اچھی اور نئی بات کی جگہ ہی نہ ہو۔تاہم ہر وہ ذہن جو اس گہرے کنویں کی طرح تازہ روشنی سے محروم ہوتا ہے۔وہاں سورج کبھی نہیں جھانکتا۔

اس کنویں میں سورج نے جھانک لیا تھا۔اس نوجوان کی آواز یوں تھی جیسے کسی گہرے کنویں سے آرہی ہو۔وہ کافی دیر خاموش بیٹھا رہنے کے بعد بالآخر بول پڑا تھا

''سر میں آپ سے معافی مانگنے آیا ہوں۔''

''اچھا مانگیے معافی۔''

ڈاکٹر فرید نے پُرشفقت نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''مگر بھئی پہلے یہ تو بتاؤ معافی ہے کس سلسلے کی؟

''سر! میں نے پورا سال آپ کو برا بھلا کہا، اپنے دوستوں میں، اپنے گھر میں ہر جگہ، آپ کے خلاف اتنی باتیں کیں کہ ایک روز والد صاحب نے پوچھ ہی ڈالا کہ اس استاد نے تمہارا کیا نقصان کیا ہے جو ہر وقت اسے کوستے رہتے ہو۔میں نے انہیں بتایا کہ نجانے کس نے انہیں استاد بنا دیا ہے۔نہ نوٹس لکھواتے ہیں، نہ کسی اچھے خلاصے اور ٹیسٹ پیپر کا نام بتاتے ہیں، نہ خاص خاص امتحانی سوال نوٹ کرواتے ہیں۔کلاس میں آتے ہیں، دنیا جہاں کی باتیں کرتے ہیں، کبھی کبھی تو ایک ایک شعر کی

تشریح میں پورا پورا پریڈ نکال دیتے ہیں۔ یہ بھی بھلا کوئی طریقہ ہے پڑھانے کا، بتانے کا، سمجھانے کا کہ شعر کے ساتھ ساتھ شاعر، اسکی سوچ، اس کے استاد اس کی ساری سوچ اور اس عہد کا بھی بتانے لگتے ہیں۔"

"پھر ہوا کیا؟"

مہربان استاد نے نرمی سے بات آگے بڑھائی۔

"وہ جی والد صاحب نے رزلٹ دیکھ کر کل رات مجھے بلایا، اپنے پاس بٹھایا اور پوچھا باقی کلاس کا کیا ہوا۔" میں نے بتایا کہ اردو میں رزلٹ سو فیصد رہا، باقی مضامین میں 50 فیصد لڑکے فیل ہیں۔"

"اچھا کمال ہے"

والد صاحب نے حیرت سے کہا:

"یہ تو اسی ناپسندیدہ استاد کا مضمون نہیں ہے جس نے کبھی خلاصے سے نہیں پڑھایا تھا۔ سوالوں پر نشان نہیں لگوایا تھا؟"

ان کی بات سن کر میں زندگی میں پہلی بار چونکا۔ والد صاحب کہہ رہے تھے:

"لگتا ہے وہ استاد تمہارے ساتھ ہاتھ کر گئے۔ تمہیں کتاب پڑھاتے پڑھاتے زندگی پڑھا گئے۔ وہ بولتے تھے تم سنتے تھے اور پھر الٹا سیدھا سوچتے تھے۔ امتحان آیا تو وہی کچھ اپنی سوچ میں ڈھال کر لکھ آئے۔ وہ باتیں کتابی جملے اور رٹے ہوئے محاورے نہیں تھے۔ وہ تو اچھی صحبت کے پھل تھے۔ گھنا سایہ تھے اور تم اس سائے سے ہی انکاری رہے۔ کیا بدقسمت اور ناشکرے ہو۔"

"سر! یہ سن کر میں پریشانی میں اپنے باقی دوستوں کے پاس گیا۔ انہیں بتایا تو وہ بھی بولے۔ "بات دل کو لگتی ہے اصل میں ہم نے کبھی غور ہی نہیں کیا کہ ہم استاد کے چکر میں آ کر اپنے ذہنوں کے چھوٹے چھوٹے روایتی پیمانوں اور خلاصوں سے بے نیاز ہو کر نئی باتیں سوچنے اور نئے زاویے سے لکھنے لگے۔ حتیٰ کہ ہم نے بعض باتوں پر اپنی رائے تک قائم کر لی اور ہمیں خبر تک نہ ہو۔"

سر! میں اپنے ان تمام لفظوں اور جملوں کی معافی مانگنے آیا ہوں جو میں نے اپنی کم علمی کے باعث پوری نیک نیتی سے آپ کے خلاف کہے اور بولے تھے۔''

وہ لڑکا بول رہا تھا اور مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے دولے شاہ کا سر غائب ہو رہا ہے۔ اب وہاں ایک جیتے جاگتے، سوچتے سمجھتے انسان کا سر نظر آ رہا تھا، کنویں میں سورج نے واقعی جھانک لیا تھا۔

رویے اور سوچ میں جب جب ایسی تبدیلی آئے جو تازگی لائے، اپنے آپ سے ملوائے، اپنی غلطی کا احساس دلائے تو عام سے عام آدمی بھی ''سرو کے بوٹے'' کی طرح سروقد بنتا اور نکلتا ہے۔ لوگ دیکھتے رہ جاتے ہیں اور وہ اپنے ہم عمروں اور ہم عصروں دونوں سے بلند ہو جاتا ہے۔

یہ کب ضروری ہے کہ جس کا سر دولے شاہ کے چوہے جتنا نہ ہو وہ بھی نہ سوچے نہ سمجھے، پھر ہر کوئی اس کے گلے میں رسی ڈالے، ہاتھ میں کاسہ دیئے در در پر لیے پھرے گا۔

جو لوگ اپنے ذہنوں اور رویوں کو زندگی کے ساتھ بڑا اور فراخ نہیں ہونے دیتے، انہیں ایک روز ایسے ہی لمحے کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اپنے نامناسب لفظوں اور رویوں پہ معذرت کرنی پڑتی ہے۔ اسی سے زندگی کا ایک نیا راستہ شروع ہوتا ہے، جہاں نئے راستے پر سوچ کے، اقدار کے عادتوں کے، خوبیوں کے، ہنر کے اور خود شناسی کے نئے نئے خوشبودار اور خوش رنگ پھول کھلتے ہیں۔ وہ نوجوان آیا تو اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی اور ہونٹوں پہ کپکپاہٹ مگر معذرت کے دو بول کہنے کے بعد جب ڈاکٹر فرید اسے رخصت کر رہے تھے تو اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی نہ ہونٹوں پہ کپکپاہٹ۔ ہاں اس کی آنکھیں ضرور نم تھیں۔

''اپنے ابو کو میرا سلام کہیے گا۔'' ڈاکٹر صاحب نے کہا:

''جی بہت اچھا'' نوجوان نے جواب دیا۔

''اور اپنی طرف سے انکا شکریہ بھی کہنا'' ڈاکٹر فرید مسکرائے۔

''سر! ایک بات کہوں!'' اس نے جاتے جاتے مڑ کر کہا

''ضرور!''

''سر! جب میں آ رہا تھا تو میرے قدم من من بھر کے تھے اور اٹھائے نہ اٹھتے تھے، فکر مندی، شرمساری نجانے کیا کیا بوجھ تھے جو میرے دل پہ اور روح پہ تھے، میں سوچتا تھا جب میں آپ کو اتنی بڑی اور اتنی بُری بات بتاؤں گا تو آپ مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ دولے شاہ کا چوہا کہیں گے۔ اب واپس جا رہا ہوں تو اطمینان اور خوشی کی ایک عجیب کیفیت سی ہے جو مجھے اڑائے لیے جاتی ہے۔ دل چاہتا ہے ان سب سے جا جا کر معذرت کروں جن جن کے بارے میں زندگی کے کسی لمحے بُرا سوچتا رہا ہوں، بُرا کہتا رہا ہوں، سر! کیا کچھ لمحے واقعی ایسے ہوتے ہیں جب انسان بدل جاتا ہے اور وہ لمحے اس کو بدلنے میں مدد دیتے ہیں۔ اُسے چوہے سے انسان بنا دیتے ہیں جیتا جاگتا، انسان اپنی سوچ اور پورے وجود سے کھڑا انسان۔

سر! آپ نے اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے مجھے معاف کیسے کر دیا! یہ اتنا آسان ہوتا ہے کیا؟

ڈاکٹر فرید جواب دیتے ہوئے کہیں کھو سے گئے۔ پھر دھیرے سے بولے:

''جس کو خود معافی چاہیے ہو، اسے دوسروں کو معاف کرنے میں جلدی کرنی چاہیے۔ دوسروں سے معافی تلافی میں شرطیں لگانے سے بندہ خود بھی تو مشکل میں پڑ سکتا ہے۔ پھر تمہارا معاملہ تو یہ ہے کہ تم امید کا ایک دیا جلا کر لائے تھے۔ میں اسے کیسے بجھا دیتا، آنے والے سالوں میں، بے شک میں تمہارے ساتھ نہیں رہوں گا مگر یہ کیفیت تم کو کئی بار یاد آئے گی اور بہت ممکن ہے ہر بار تم کسی کی زندگی میں معافی کا ایک نیا پھول کھلا دو، اسے ڈھنگ سے زندگی گزارنا سکھا دو۔ کسی ذہن اور سر پر چڑھے لوہے کے خول کو اتارنے میں مدد دینے بیٹھ جاؤ، دولے شاہ کا چوہا نہ بننے اور نہ بنانے کا فیصلہ بھی تو انسان خود کرتا ہے۔ خود شناسی کا ایسا لمحہ تو ہر زندگی میں آتا ہے۔ اسی لمحے کا انتظار ہوتا ہے، تم پر یہ لمحہ آیا تو کیوں کر اسکی خوشی نہ مناتا۔ تمہیں بُرا بھلا کہہ کر تمہاری امید کا چراغ کیسے بجھا دیتا، میری خود شناسی نے مجھے ایک استاد کو یہی سکھایا تھا''

☆..........☆..........☆

2

باب دوم

خود شناسی
ایک دلچسپ تصور ---
تصورِ نفس /
تصورِ ذات

خود شناسی ایک نہایت اہم اور دلچسپ تصور ہے۔ اس کو جاننے کے لیے اس کی بنیادوں کو جاننا لازم ہے۔ بطور استاد یاد رکھنے کی چیز یہ ہے کہ خود شناسی عمر بھر ہمارے رویوں کی بنیاد بنتی ہے، یہ الگ سے کوئی چیز نہیں بلکہ چھ اجزا کا مجموعہ ہے۔

1 ہمارے عقائد	2 ہماری اقدار
3 ہمارے خیالات	4 ہمارے تصورات
5 ماضی کے تجربات	6 ہمارے مقاصد

خود شناسی ہی اصل میں ہمارے ہونے بلکہ "ہمارے اصل ہونے" کا تعین کرتی ہے۔

یہ ایک ایسا مضبوط تصور اور احساس ہے کہ جو کسی ایک سے اس کی ساخت، شکل، عمل یا عقیدے کی بنیاد پر محبت کو اس جیسے سبھی سے ویسی ہی محبت کے رشتے میں باندھ دیتا ہے۔ کسی ایک کی دشمنی اور مخالفت کو اس جیسے سبھی کے حوالے سے ایسے جذبات کا شکار کر دیتا ہے۔ یہی خود شناسی کا تصور طے کرتا ہے۔ کہ آپ کیسے جئیں گے اور کن کے ساتھ کیا کام کرتے ہوئے جئیں گے۔

خود شناسی پانچ بنیادوں پہ قائم ہوتی ہے جو ہر استاد کی تعمیر ذات میں اہم ترین کردار ادا کرتی ہیں۔

اوّل۔ تصورِ نفس / تصورِ ذات   دوم۔ احتسابِ نفس / احتسابِ ذات

سوم۔ عزتِ نفس / تکریمِ ذات   چہارم۔ تصورِ خوف / خوفِ ذات

پنجم۔ تصورِ خالق / محبتِ رب

1- تصورِ نفس:

ہم مانیں نہ مانیں ہم عمر بھر مکمل طور پر اپنے تصورِ ذات یا تصورِ نفس کی قید میں رہتے ہیں۔ اسی کی مانتے ہیں اسی کی سنتے ہیں۔ ہمارا ہر عمل، ہر لفظ اور ہر تعلق اسی کی ترجمانی کرتا ہے۔ جو استاد اس

حقیقت کو جان لیتے ہیں وہ اپنے طرزِ عمل سوچ اور برتاؤ ہی میں نہیں اپنے سیکھنے پڑھنے آگے بڑھنے جیسی ہر سوچ میں تبدیلی لے آتے ہیں۔ اپنی شخصیت کو سنوار پاتے ہیں اس میں ظاہری نہیں بلکہ معنوی خوبیوں کے رنگ بھر سکتے ہیں۔

انسانی زندگی کے چار حصے:

تصورِ ذات کی اگر ایک ترتیب بنائی جائے تو سمجھنا انتہائی آسان ہو جائے گا۔ ایک انسان کی تصورِ ذات کو چار حصوں میں آسانی سے تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

حصہ اول جسمانی تصورِ ذات حصہ دوم سماجی تصورِ ذات

حصہ سوم تخلیقی تصورِ ذات حصہ چہارم روحانی تصورِ ذات

یہی چار حصے عمر کے ہر حصے میں ہر سوچ اور ہر فیصلے کی بنیاد میں اپنا کردار ادا کر رہے ہوتے ہیں جو استاد اسے سمجھ لیتے ہیں وہ عام انسانوں سے نہ صرف نمایاں ہو جاتے ہیں بلکہ کارکردگی کے ان معیارات کو چھو لیتے ہیں کہ دوسرے جن کا صرف تصور ہی کر رہے ہوتے ہیں۔

2 سماجی خودشناسی Love	1 جسمانی خودشناسی Live
4 روحانی خودشناسی Legacy	3 تخلیقی خودشناسی Lead

1۔ جسمانی خودشناسی:

حصہ اوّل کا تعلق مجموعی طور پر جسمانی تصورِ ذات سے ہے۔ ظاہری شکل وصورت، لباس، جسمانی طاقت کے لیے ورزشیں۔ خوب صورتی کے ماڈل اور رول ماڈل، ایک استاد کسے توجہ سے دیکھتا ہے اور کس جیسا بننا چاہتا ہے۔ ویسا ہونے کے لیے کیا طریقے اختیار کرتا ہے۔ سماجیات کے

ماہرین اس بارے میں کہتے ہیں جو لوگ شخصیت کے صرف اسی حصے میں محبت کرنے لگتے ہیں وہ جانوروں کی زندگی کے زیادہ قریب ہو جاتے ہیں۔ جن کا اول و آخر ہی جسم اور جسمانی ضرورتیں پورا کرنا ٹھہرتا ہے۔ وہ انہی کے لیے لڑائیاں کرتے ہیں، انہی کے لیے جیتے اور مرتے ہیں۔ رشتے، عقائد، احساسات، اقدار یعنی ہر لفظ ان کے لیے بے معنی اور غیر اہم ہوتا ہے۔ انہیں بہتر ہونے، سیکھنے یا ترقی کرنے کی نہ چاہت ہوتی ہے نہ ہی یہ ان کی یہ خواہش ہوتی ہے۔ اسی سوچ کے ساتھ ان کی نسل بڑھتی جاتی ہے۔ ہر ادارے، ہر ملک اور ہر معاشرے میں ایسے لوگ بکثرت ہوتے ہیں اور ان کا ہونا اور انہیں پہچاننا بالکل مشکل نہیں ہوتا۔ یہ جسمانی سطح پر صرف نوکری کرنے کی لئے زندہ رہنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ آپ اپنے آس پاس دیکھئے، کتنے ہی چہرے صرف جسمانی طور پر زندہ نظر آئیں گے۔ ان کے پاس کوئی بڑا مقصد تو دور رہا مقصدِ زندگی ہی نہیں ہوتا۔

ساری عمر پالتو کتے کا شوق:

قصبوں اور گاؤں میں آپ نے دیکھا ہوگا۔ وہ بچے جو شام کو فٹ بال، کرکٹ کھیلتے ہیں یا والی بال کھیلنے والوں کے پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ آہستہ آہستہ خود بھی کھلاڑی بننے کا شوق پال لیتے ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کے بس میں ہو تو وہ ساری عمر بیٹھے ہی رہیں انہیں چلنا پھرنا، کہیں آنا جانا ہی موت جیسا لگتا ہے۔ ہلنا جلنا ایک مصیبت لگتا ہے۔ ہمارے ایک استادِ محترم کہا کرتے تھے۔ ''اے بے ہدایتیو! کہاں ساری عمر بیٹھ کر اور لیٹ کر گزار دینی ہے۔ رحمِ مادر کے پالنے اور جھولے سے زندگی کا آغاز کرنے والے دنیا میں آ کر بھی ہمیشہ جھولتے رہنا چاہتے ہیں۔ پہلے ماں باپ کی گود میں پڑے جھولتے رہتے پھر پنگوڑے میں۔ بڑے ہوئے تو سائیکل، موٹر سائیکل، کار، ریل، طیارے سب ہمیں اُٹھاتے پھرتے ہیں۔ ان کے بس میں ہو تو کرسیاں فولڈ کر کے ساتھ ہی لیے پھریں۔''

ہمارے ایک عزیز دوست ہیں، بھائی چھیرو سے آتے ہیں، ان کی گاڑی کی ڈگی میں دو لوہے کی کرسیاں فولڈ کر کے ہمیشہ رکھی رہتی ہیں۔ میں نے ایک روز ان سے پوچھ لیا کہ قبلہ! کیا گاڑی کی سیٹیں کافی نہیں جو ڈگی میں بھی دو فولڈنگ سیٹیں رکھی ہوئی ہیں۔ جواب مزے کا تھا۔ شاہد صاحب

بولے؛

''کہیں راستے میں گاڑی پنکچر ہی ہوجاتی ہے تو کیا اتنی دیر بندہ کھڑا رہے؟

ارسطو اپنے علم ودانش کے ساتھ ساتھ بطور استاد شاگردوں کو پڑھانے کے منفرد انداز سے بھی پہچانا جاتا ہے۔ اسے چلتے چلتے سکھانے والا مکتبہ فکر کہا جاتا ہے۔ وہ اپنی درس گاہ کے میدان میں ٹہلتے ٹہلتے اپنے طلبہ کو پڑھایا کرتا تھا۔ جونہی کوئی خاص بات سکھانی ہوتی تو رک جاتا اور وہ خاص بات کہتا۔ یہ مضبوط تصور ذات کی ہی ایک مثال ہے یہ نہ صرف جسمانی بلکہ تخلیقی حصہ کی بھی نمائندگی کرتی ہے۔

ورڈز ورتھ انگریزی کے مشہور ترین شاعروں میں ہے نیچر پر کہے گئے اس کے اشعار خوب ضرب المثل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے قریبی دوستوں کا کہنا ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں کم از کم 185000 میل تو ضروری واک کی ہوگی۔ اس کا بیشتر حصہ انگلستان کے لیک ڈسٹرکٹ میں سرانجام پایا۔

دنیا میں محض ذہین لوگ ہی نہیں عام لوگ بھی جو اپنی تکمیل ذات کے لیے جسمانی صحت کو لازم سمجھتے ہیں، واک کا ضرور اہتمام کرتے ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ صدیوں سے صبح وشام اساتذہ اور شاگردوں کی واک کا رواج رہا ہے اور کہا جاتا ہے یہ واک وجدان کو بیدار کرتی ہے۔ دی کلاسیک ہسٹری آف انگلینڈ کے مصنف جارج ٹریولیان کا کہنا ہے، میں نے آج تک کوئی ایسا فرد نہیں دیکھا جو اخلاص کے ساتھ واک پر جاتا ہو، چاہے یہ واک طویل فاصلے کی ہو یا مختصر فاصلے کی اور اسے اس کا صلہ اپنی روح کی بالیدگی کی صورت میں نہ ملا ہو''

ایک نامور مصنف کا تو یہ کہنا ہے کہ میں واک کرتا ہوں اس لیے میں ہوں، واک کے دوران انسان اندر کے سفر پہ ہوتا ہے انسانی ذہن داخلی انتشار، پریشانی اور الجھاؤ سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ درختوں، پھولوں، ستاروں واقعات اور لوگوں کو کسی بچے کی طرح یوں دیکھتا ہے جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ ہمارے بچپن میں کھیتوں میں لگی ہوئی بیری کے محفوظ ٹہنوں پر دادا جی ہمیں پینگ باندھ دیتے تھے۔ موٹے رسے کی مدد سے بنا یہ مقامی جھولا چھوٹے بڑے سبھی جھولتے اور مزے لیتے تھے۔ بات

جھولنے سے شروع ہوئی اور جھولوں پر جا نکلی۔ جن لوگوں کا تصور آرام دہ زندگی کا ہوتا ہے، ملنے جلنے میں رغبت باقی نہیں رہتی۔ اللہ معاف کرے موٹے ہو کر بیٹھنے کے عبرتناک مناظر بھی دیکھے ہیں۔ ہمارے دفتر میں ایک صاحب تھے گاڑی سے بمشکل نکلتے پھر دو سیڑھیاں چڑھنا بھی مشکل ہوتا۔ دفتر کی کرسی کے دونوں بازو توڑ کر اس کے بیٹھنے کی گنجائش پیدا کی گئی تھی۔ شام کو دفتر سے اُٹھتے تو کسی ہوٹل یا جم خانہ چلے جاتے۔ رات سونے تک کھانے پینے کا دور چلتا۔ کہاں کی سیر، کہاں کی ورزش، اب دن بھر جس مشکل سے سانس لیتے، ان کا تصور ذات یہی تھا کہ اسی طرح جینا ہے۔ ان کے والد مشہور آدمی تھے۔ بھائی ایک سیاسی جماعت کے سیکرٹری تھے۔ سیر اور واک ایک صحت مند زندگی کا نشان ہیں جو بچے اور اُستاد سکول پیدل آتے ہیں وہ ہمیشہ فٹ اور پر جوش دیکھے گئے ہیں۔ باقاعدگی سے ہر روز واک کرنے کے حوالے سے ایک مشہور مصنف سوڈان اور اس کی بیوی ہم فرے نے اپنی کتاب میں ایک حیران کن حصہ لکھا ہے کہ باقاعدگی سے واک عزتِ نفس کی تعمیر کا باعث بنتی ہے۔ کیونکہ صحت مند جسم ہی صحت مند ذہن کو تشکیل دیتا ہے۔ صحت مندی ہی خود نظمی سکھاتی ہے اللہ رب العزت نے انسانی جسم کو نقل و حرکت اور کام کاج کے لیے بنایا ہے اور استاد تو فٹ ہی اچھا لگتا ہے، وہ بیٹھے رہنے کے لیے تو بالکل نہیں بنا۔ ست الوجود کبھی بڑی کامیابی کا منہ نہیں دیکھ پاتے۔

جانوروں سے ممتاز کرنے والی صلاحیت:

ہم چلتے میں تو کسی اڑتے پرندے کی طرح کسی پانی میں تیرتی مچھلی کی طرح، نہ جسم پر دباؤ پڑتا ہے نہ سینوں میں کھچاؤ، جسم ایک آہنگ کے ساتھ حرکت میں رہتا ہے۔ جتنی اللہ نے اسے قوت اور استطاعت بخش رکھی ہوتی ہے ایک امریکی استاد پروفیسر اووں لوجائے نے بڑی تحقیق کے بعد لکھا ہے کہ اگر لوگوں سے یہ کہا جائے کہ وہ انسانی جسم کے انتہائی اہم حصے یا صلاحیت کا انتخاب کریں تو کچھ لوگ دماغ کو عظیم ترین قرار دیں گے اور کچھ لوگ اعلیٰ ترین آلات کی تشکیل اوروں کے استعمال کی صلاحیت کو عظیم کہیں گے لیکن اصل صلاحیت جو ہمیں تمام جانداروں سے ممتاز کرتی ہے وہ ہمارا

سیدھا کھڑے رہ کر چلنا ہے۔ یہ صلاحیت صرف انسانوں میں پائی جاتی ہے اور انسانی ترقی میں اہم ترین موڑ۔ اسی صلاحیت کو حاصل کرنے میں آٹھ سے دس لاکھ سال لگے۔ دس سے بیس لاکھ سال کے درمیان اس نے دوٹانگوں سے چلنا سیکھا۔ پروفیسر لوجائے کہتے ہیں کہ انسان نے کھڑے ہوکر چلنے کا عمل 30 لاکھ سال پہلے شروع کیا۔ فطرت نے اسے جس محنت اور مشقت سے کھڑے ہونے اور چلنے کے پوپچر سکھائے اب یہ اپنی دانش مندی اور تساہل کے ہاتھوں چلنا چھوڑ کر طرح طرح کی ذہنی وجسمانی بیماریوں کو دعوت دے رہا ہے۔

آپ کو حیرت ہوگی اردو ادب میں اگر کسی کو یہ کہنا ہو کہ وہ صاحب کردار ہے، قابل بھروسہ ہے اور مشکل میں بھاگتا نہیں ہے تو کہا جاتا ہے "وہ پورے قد سے کھڑا رہتا ہے"۔

تصورِ ذات یا تصورِ نفس ایسا بنیادی خیال ہے جو ہر استاد کی زندگی میں اہم ترین کردار ادا کرتا ہے اسکی ذات اسکی شخصیت اسکی صلاحیتیں اسکے اوصاف اور اسکا سیکھنا، اس کا پہناوا اصل میں سب اسی تصور سے جڑا ہوتا ہے کہ وہ کیا کرسکتا ہے اور کیا نہیں کرسکتا۔ زندگی میں جس قدر "نہیں" بڑھتے جائیں گے اسی قدر شخصیت کی کامیابی کے امکانات کم ہوتے جائیں گے۔

2۔ سماجی خودشناسی:

معاشرے کے ساتھ ربط، رشتوں کے لحاظ، ادب آداب، خاندانی حسب نسب، محبت، نفرت، اچھے برے رویوں کے امتیاز، تعلیم، اس کے مدارج اور بڑے اہداف، نوکریاں، ترقیاں، گروہ بندیاں، اپنے گروہوں کی تیاری، ہر سوچ اور فیصلہ جو وہ سماجی سطح پر محبت کے کس تعلق کے لیے کرتے ہیں، انکی شخصیت کا وہ لازم حصہ ہوتا ہے جو خوبی اور خوب صورتی کا باعث بھی بنتا ہے اور بدصورتی کا بھی۔ اپنی سماجی زندگی میں آپ کا بھی ان لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے کہ جن کی زندگی کا ہر فیصلہ خود غرضی سے عبارت ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ سگے رشتوں کی بے قدری کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ذرا سے فائدے کے لیے دھوکے، غلط بیانی اور صریحاً جھوٹ سے کام چلا کر بھی انہیں سرشاری نہیں ہوتی کہ ان کا تصورِ ذات اسی رنگ سے رنگا ہوتا ہے اور سماج کے تعلق کیلئے یہ رنگ انہوں نے اپنی

مرضی اور منشا سے اختیار کیا ہوتا ہے۔

سکول کی زندگی میں بعض استاد غلط بیانی کے عادی ملتے ہیں، نقل سے کام چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنا کام نہ کرنے اور دھونس سے کام نکلوانے کو عادت بنا لیتے ہیں یہاں تک کہ اساتذہ اور افسروں کو بھی ڈرانے، دھمکانے سے باز نہیں آتے۔ بے شک کوئی اچھا استاد ایسا سوچ بھی نہیں سکتا مگر سماجی سطح پر کمزور تصور ذات والے ایسے استاد بھی ہم نے دیکھے اور اخبارات میں ان کی خبریں پڑھی ہیں کہ انہوں نے اپنے طلبہ پر ہی نہیں اپنے ہم عصر اساتذہ پر ہاتھ اُٹھایا۔ والدین سے بدسلوکی کرنے والے، کسی ناکامی پہ خودکشی کرنے والے بھی اسی حصے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس حصے میں مفاد اور محبت غالب رہتی ہے۔ رشتوں سے، روپے پیسے سے، اختیار سے، اقتدار سے، با اثر لوگوں سے، شارٹ کٹ سے، ہر اس جگہ، راستے اور رشتے سے جو ذاتی مفاد کو حاصل کرنے میں مدد دے۔ وقتی اور جھوٹی محبت پر مبنی اس سوچ پر قابو نہ پایا جا سکے تو بالآخر انسان ہر احترام سے محروم ہو جاتا ہے۔ کسی اعلیٰ تعلیمی ادارے میں ہو گا تو وائٹ کالر کرائم کرے گا اور بالآخر اپنے عزیزوں اور بچوں کے لیے شرمندگی کا باعث بنے گا۔ اخبارات میں آئے روز ایسے ہی لوگوں کی تصاویر اور اشتہار چھپتے ہیں جو دھوکا دے کر اور بددیانتی کے مرتکب ہوتے ہیں، امتحانوں میں بچوں کو نقل کروانے والے، امتحانی سنٹر بیچنے والے اسی کیٹیگری کا حصہ ہوتے ہیں۔ اپریل ۲۰۱۵ میں اے آر وائی ٹی وی پروگرام سرعام کی ٹیم جب کراچی میں امتحانی سینٹر بیچنے والے اساتذہ کو رشوت کی رقم دے رہی تھی تو سچ کہوں شرم آ رہی تھی مگر رشوت لینے والے اس احساس سے ہی عاری تھے۔

سماجی طور پر زندگی گزارنے والے ہر استاد کے پاس سماج میں اپنے مقام، مرتبے اور احترام کے تعین کے لیے واضح سوچ اور حدود طے ہونی چاہیے۔ یوں اس کی زندگی زیادہ بارآور ہوگی۔ سرکاری سکولوں کے اساتذہ اگر بچوں کو گھروں میں پڑھانے کے معاملے میں قابل اعتبار ثابت ہوئے ہیں تو ٹیوشن پڑھانے والے پرائیویٹ اساتذہ نے اکثر والدین کے اعتماد کا خون بھی کیا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے جگہ جگہ اپنی ہی شاگردوں سے جھوٹی محبت کا کھیل ایک معمول ہوتا ہے۔ وہ جس

جگہ بھی ہوں، تعلق اور تعارف کو افیئر بنانے، اس سے جسمانی فائدہ اُٹھانے اور پھر تعلق کو توڑ کر آگے نکل جانے میں انہیں نہ شرمندگی ہوتی ہے نہ یہ احساس کہ جس کے ساتھ یہ کھیل کھیلا گیا ہوتا ہے وہ زندگی بھر اس دھوکے، تکلیف اور اذیت سے نہیں نکل پاتی اور اکثر کیسز میں تو انسانوں سے ان کا اعتبار ہی اٹھ جاتا ہے۔ ایسے لوگ بڑی آسانی سے کہہ دیں گے" بے قوف بنانا آنا چاہیے۔" دھوکا دینے والے بھی ایسی ہی سوچ رکھتے ہیں، ہر فراڈ کا آغاز کسی چھوٹی سی کامیابی سے ہوتا ہے اور انسان اپنے آپ کو سماج سے کھیلنے اور کامیابی سے بے وقوف بنانے والا سمجھ کر اسی سوچ کو پوجنے لگتا ہے۔ ہمارے دادا مرحوم کہتے تھے، ایسے لوگ بھول جاتے ہیں کہ دھوکے بازوں کی اولاد کو اپنے بڑوں کے جرائم کی سزا اسی دنیا میں بھگتنا پڑتی ہے۔ سماج میں اپنا مقام مرتبہ اور کردار بنانا اور اسے بچانا ہر انسان کی خود شناسی ہی طے کرواتی ہے۔

3۔ تخلیقی خود شناسی:

کسی استاد کی تخلیقی خود شناسی کبھی اتفاقی نہیں ہوتی۔ بچپن سے ہی اس کا اظہار ہونے لگتا ہے۔ کسی ایک شعبے میں وہ نمایاں ضرور ہوتا ہے

1۔ بولنے میں 2۔ لکھنے میں 3۔ راہنمائی کرنے میں 4۔ اچھے رنگ بھرنے میں 5۔ اچھی تصویریں بنانے میں 6۔ کچھ نیا کام اور سوچ اپنانے میں 7۔ نعت اور حمد پڑھنے میں، گانے میں 5۔ اداکاری کرنے میں، محفلوں کی رونق لگانے میں 9۔ اشعار کو سمجھنے میں، خود اشعار کہنے میں، تقریبات کی میزبانی کرنے میں 10۔ کہانیاں پڑھنے اور رسائل جمع کرنے میں۔ خود کہانیاں اور آرٹیکل لکھنے میں

تخلیق کی سوسطحیں اور جہتیں ہیں۔ جو شعور اور عقل آنے کے ساتھ ہی وجود میں آجاتی ہیں۔

ہم عمر کی جس سطح سے بھی ہوں، ہماری خود شناسی تخلیقی تصورات کو پروان چڑھانے اور بہتر بنانے کیلئے زندگی میں آگے بڑھنے کے راستے خود بخود کھولتی جاتی ہے۔ یہ تخلیقی خود شناسی تعلیم، تفریح، قیادت، سیاست، تحریر، تقریر، سائنس، آرٹس اور خدمت کے شعبوں میں کام کرتی ہے اور فنون لطیفہ اور کبھی سائنس میں آگے جانے والے استاد اپنے سکول میں ہی نئے نئے تجربات کرنے لگتے ہیں، ماڈل بنانے لگتے ہیں، تقریریں کرنے میں ماہر ہوکر انعام جیتنے لگتے ہیں۔ کھیلنے کا شوق ہو تو وہاں ہم

عمروں سے آگے نکل جاتے ہیں۔

آپ کے لیے یہ بات دلچسپی کی حامل ہوگی کہ آج کے تھیٹر کے تمام مشہور اداکار جو مزاح پیدا کرنے والے مشہور ہیں اور پھکڑ بازی اور جگت بازی کے "گرو" بن گئے ہیں۔ تعلیم کی ابتدائی دنوں سے ہی سکول سے بھاگ کر اس طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ وہ پڑھائی مکمل کرنے میں دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ کسی نے قلفیاں بیچیں (ظفری) کسی نے پنکچر لگائے (افتخار ٹھاکر) اور کسی نے گلی محلے میں ڈرامے کر کے شوق پورا کیا۔ یوں وہ اپنی عام بول چال میں بھی جگتیں مارنے کے ماہر بنتے گئے یہاں تک کہ کسی ایک کو مشہور ہونے کا موقع ملا پھر دوسرے کو۔ بالآخر وہ سبھی ایک ہی کلاس کے فنکار تو مشہور ہو گئے مگر ان کی گفتگو اور جگتوں نے سوسائٹی کو شدید اخلاقی بحران کا شکار کر دیا۔ مزاح کے نام پر لوگ انہیں دیکھتے رہے اور وہ مشہور ہوتے گئے، ان کی تعریف ہوتی رہی، تالیاں بجتیں رہیں۔ اب جب یہ بوڑھے ہو رہے ہیں تو مطالبے کر رہے ہیں کہ ہمارے فن کی قدر نہیں کی جاتی تب انہیں جواب ملتا ہے کہ تالیاں بجا تو دی تھیں تمہارے فن کی داد کے لیے۔ اس تخلیق کی اتنی ہی قدر ہوتی ہے۔ یہ تخلیق کی ایک ہلکی سطح ہے

دوسری طرف تعلیم کے میدان میں ایسے بچوں نے شہرت پائی جو تخلیقی سطح پر بہت اعلیٰ تھے۔ راولپنڈی کے علی معین نوازش کے اولیول ایگزام میں 21 اے لینے سے جو شاندار آغاز ہوا تو محنت کر کے نام بنانے والوں کی لائنیں لگ گئیں۔ راولپنڈی، لاہور کے کئی بچوں نے 20 سے زائد ایز لیے 2014۔ میں فیصل آباد میں ایک مزدور کے بیٹے نے ایم بی اے میں گولڈ میڈل لیا۔ اس کے اپنی والدہ کے پاؤں کو بوسہ دینے کی تصویر اخبارات کی زینت بنی۔ 2012 میں ایک ایسے لڑکے کی شہرت ہوئی تھی جس نے تنور پر روٹیاں لگاتے لگاتے بی اے کے پیپرز کی تیاری کی اور پھر ٹاپ کر گیا۔ اسے وزیرِ اعلیٰ شہباز شریف نے انعام میں نقد رقم ہی نہیں گھر بھی دیا۔

پنجاب حکومت کئی سال سے بورڈز میں اول آنے والوں کو گورنر ہاؤس مری میں گارڈ آف آنر پیش کر رہی ہے انہیں دنیا کی تمام بہترین یونیورسٹیوں میں سرکاری خرچ اور مہمان داری کے

ساتھ لے جایا جاتا ہے جہاں وہ خود کبھی جانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ ان کی تخلیقی خودشناسی کی تحسین بھی ہے اور اس طرف متصل توجہ دینے کی ترغیب بھی۔

پنجاب بھر میں ایک لاکھ سے زاید ذہین ترین طلبہ کو لیپ ٹاپ دیئے جا چکے ہیں۔ بغیر مطالبے اور سفارش کے جب کسی لڑکے یا لڑکی کو اس کے گھر اطلاع ملتی ہے اور وزیر اعلیٰ پنجاب فون پر اس سے بات کرتے ہیں تو اس کی خوشی، اعزاز اور فخر دیکھنے والا ہوتا ہے۔ آنے والے کل یہی بچے نئے اعزاز پائیں گے، نئی رفعتیں دیکھیں گے۔ 2015ء میں انڈیا کی ایک لڑکی کو اس کی ذہانت اور تخلیقی صلاحیتوں کے باعث فیس بک نے دو کروڑ روپے ماہانہ کی جاب آفر کی ہے۔ لڑکی ابھی پڑھ رہی ہے وہ تعلیم مکمل کر کے یہ جاب کرے گی۔ ہر جگہ لوگ ایسے بچوں کے اساتذہ کا ضرور نام لیتے ہیں جنہوں نے انہیں اس مقام پر پہنچایا ہوتا ہے، استاد تخلیقی ذہن کا ہوگا تو ہی تو اس کا بچہ نامور ہوگا، آپ کو ارفعہ کریم کا نام یاد ہوگا قوم نے اس کی بہت عزت افزائی کی اور اسکی وفات پر بے پناہ دکھ کا اظہار بھی کیا۔ میں نے اس کے والد سے پوچھا آپ تو فوج میں تھے پھر کس نے اسے کمپیوٹر سکھایا اور اس کا ماہر بنایا تو انہوں نے بھی اس ٹیچر کا ہی نام لیا جس نے فیصل آباد میں ہوتے ہوئے اسے دنیا کی سے کم عمر مائیکروسافٹ سرٹیفائیڈ کا اعزاز دلوادیا۔

تخلیقی خودشناسی کیسے جنم لیتی ہے

یہ والدین اور اساتذہ ہوتے ہیں جو چھوٹی عمر میں بچے کی صلاحیتیں دیکھ کر انہیں پالش کرتے ہیں۔ اس پر توجہ دیتے ہیں اور یوں اس کی مستقبل سازی کا آغاز ہوتا ہے۔ تخلیقی خودشناسی اسی عمر سے جنم لیتی ہے۔ میں پانچویں اور چھٹی جماعت میں گورنمنٹ ہائی سکول چشتیاں کا طالب علم تھا۔ بھٹو صاحب کی حکومت کا زمانہ تھا، انکے صوبائی وزیر تعلیم عبدالحفیظ کاردار ہمارے سکول کے دورہ پر آرہے تھے، جب مجھے زندگی کی پہلی تقریر لکھ کر دی گئی۔ مجھے یاد ہے کہ تقریر کرتے ہوئے بھولنے والا تھا کہ ذرہ برابر مجھ سے کام لے کر دو چار جملے گول کر کے آگے نکل گیا۔ ٹانگیں باقاعدہ کانپ رہی تھیں۔ تقریر ختم ہوئی تو یوں لگا جیسے کسی نے پھانسی کے تختے سے اتار دیا ہو۔ مقامی ایم پی اے حافظ علی اسد

اللہ تھے، نام یاد ہے۔ شکل اب ذہن میں نہیں آ رہی۔ انہوں نے اُٹھ کر مجھے شاباش دی۔ شاباش نے اور پھر پروگرام کے آخر میں تیسرا انعام ملنے کی خوشی نے ذہن کے اندر بٹھا دیا کہ یہ کام اچھا ہے، عزت بھی ہے، انعام بھی ملتا ہے اور شاباش بھی، پس پھر تقریر کرنے میں دلچسپی پیدا ہوگئی، ہاتھ ہلانے کا انداز بھی اپنا لیا۔ یہ ستر کی دہائی تھی کچھ ماہ بعد ہماری چھوٹی پھوپھو کی شادی تھی۔ 209 / مراد چشتیاں سے بیس کلومیٹر ڈاہرنوالہ تک بس پر اور وہاں سے 17 کلومیٹر نہر مراد کے ساتھ ساتھ کچی پٹڑی پر سائیکل پر بیٹھ کر جانا پڑتا تھا جہاں ہمارے چھوٹے چچا نے زمینداری کے ساتھ ساتھ پورا ساؤنڈ سسٹم بنا رکھا تھا، ان کا جونیئر پارٹنر نذیر اسے مختلف شادیوں پر لے کر جاتا۔ اس کے پاس ڈھیروں کتے کے نشان والے ریکارڈ تھے جو گراموفون پر لگا کر بجائے جاتے۔ ساتھ ساتھ لوگ سلامیاں دیتے۔ گانوں پر خوش ہو کر یا دولہے کے نام کی ویلیں دی جاتیں، یہ طے شدہ معاوضے کے علاوہ اضافی آمدن ہوتی۔ زمیندار ہوتے ہوئے بھی چچا نے اس زمانے میں اسے اضافی آمدن اور تعلقات بنانے کا کارآمد نسخہ پایا تھا۔

اب چونکہ اپنے گھر کا سپیکر تھا تو روز رات کو چلتا، ایک دن ابو نے کہا کہ ہاں بھئی سب مہمانوں کو اپنی تقریر سناؤ۔ میں نے جا کر ویلوں کا اعلان کرنے والا مائیک پکڑا اور حضرت امام حسین کی شہادت والی پوری تقریر کر ڈالی۔ آخر میں وہ شعر بھی پڑھا ''سر داد نہ داد دست در دست یزید حقا کہ بنائے لا الہ است حسین''، جس کا مطلب تب بھی نہیں آتا تھا اور شعر پڑھ کر زور سے اس مشین پر مکہ مارا جو آواز کو کم زیادہ کرتی ہے۔ اس مکے کی آواز سے گھبرا کر چارپائیوں پر لیٹے ہوئے کئی عزیز اُٹھ کر بیٹھ گئے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کئی نے حیران ہو کر، کچھ نے خوش ہو کر پیسے دیئے۔ ابو نے پورا ایک روپیہ دیا۔ ساڑھے نو روپے نقد کی آمدنی ایسی زوردار تھی کہ شادی والی رات پھر وہی تقریر خود ہی کسی بڑے سے پوچھے بغیر کر ڈالی، تب باراتوں کو باقاعدہ راتوں کو ٹھہرالیا جاتا تھا۔ اس روز بھی سوا سات روپے ملے۔ باراتیوں نے بھی خوشی کا اظہار کیا اور شاباش دی۔ آنے والے برسوں میں مجھے پبلک

سپیکر بنانے میں جن فیکٹرز نے کردار ادا کیا، اس میں شاباش اور اس ''اضافی آمدن'' کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے۔ ایس ای کالج بہاولپور میں طلبہ یونین کے الیکشن میں سب سے کم عمر ہونے کے باوجود تقریروں کا موقع ملتا رہا اور پھر اسلامی جمعیت طلبہ میں شرکت اور شہر اور ضلع کے ناظم کے طور پر شہر شہر جانے اور دوروں کے دوران تقریروں نے اس خوبی اور صلاحیت کی باقاعدہ تخلیقی طور پر پرورش کی۔ یاد رکھیئے ارفعہ کریم کو بچپن میں ملنے والی شہرت نے ہی کتنے ہی اساتذہ اور والدین کو اکسایا اور انہیں خودشناسی کے تخلیقی پہلو سے روشناس کروایا، یوں آج بہت سارے والدین، اپنے بچوں کا ہاتھ پکڑے انہیں میڈیا ہاؤسز لئے پھرتے ہیں۔ پنجاب حکومت کئی برسوں سے تقریری مقابلوں پر اساتذہ اور طلبہ کو لاکھوں اور کروڑوں روپے انعامات دے رہی ہے۔ پنجاب گروپ آف کالجز کے بعد اب سپیریئر گروپ آف کالجز بھی تعلیمی ذہانت کا مظاہرہ کرنے والوں کو کار، موٹر سائیکل اور لاکھوں روپے نقد انعام دے رہے ہیں، لمز والے ذہین بچوں کو مفت تعلیم دے رہے ہیں۔ یوں بچے اپنے اساتذہ کی راہنمائی میں اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی قدر اور پذیرائی سے مالا مال ہو رہے ہیں۔

4 روحانی خودشناسی:

سکول کے دنوں میں ہی روحانی خودشناسی کا تصور انسانی ذہن میں راسخ یعنی پختہ ہوتا ہے کہ اس کا ایک رب ہے، جو بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے اور اس نے انسانوں کی اصلاح اور ہدائت کے لئے ایک کتاب اپنے پیارے پیغمبر حضرت محمد ﷺ پر نازل کی ہے جس میں اس عظیم رب نے انسانوں کو بتایا ہے کہ انہیں کیوں پیدا کیا ہے اور انہیں اپنی زندگی کیسے بسر کرنی ہے۔ پھر اپنی مرضی پوری تفصیل سے بتائی ہے کہ وہ کس بات پر خوش ہوتا ہے اور کس پر ناراض اور یہ کہ تمام انسانوں کو اپنی زندگی کیسے بسر کرنی ہے اور کن عبادتوں کو ضرور کرنا ہے اور کن گناہوں سے ضرور بچنا ہے۔ یہ خودشناسی کوئی نہیں دیتا سوائے ایک خداشناس اور خودشناس استاد کے، جس کو خود روح اور جسم کے تقاضوں اور

ضرورتوں کا علم اور احساس نہ ہو وہ کیسے کسی بچے کو بتا اور سکھا سکتا ہے۔ بچے کو اس کمی کا ساری عمر نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ چوں کہ ہر استاد صرف جسم کی ضرورت پر بات کرتا ہے، روح پر بات نہ اس نے سنی ہوتی ہے نہ وہ کرتا ہے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بچہ پڑھ لکھ کر بڑا ہو جاتا ہے، اسے ہر چیز کا علم ہوتا ہے سوائے اپنی روح کی خوشی اور ضرورت سے، اسے آخر تک علم ہی نہیں ہوتا کہ اس کی روح کو رب نے اپنی عبادت اور انسانوں کی خدمت کے لئے بھیجا تھا، اس کے لئے صرف نماز ہی لازم نہیں کی بلکہ انسانوں کی خیر خواہی بھی اسی عبادت کی طرح لازم کی ہے۔

ہم گورنمنٹ ہائی سکول 6/132-آر ضلع بہاولنگر میں آٹھویں یا نویں میں تھے، یہ جنرل ضیاء الحق کا زمانہ تھا ضلعی افسر تعلیمات کا خط آیا کہ سکول میں سب ٹیچر اور بچے ظہر کی نماز ادا کیا کریں گے۔ گاؤں کے سکولوں میں اس طرح کا کبھی رواج ہی نہیں تھا۔ نئی صفیں خریدی گئیں۔ ایک پلاٹ کو باقاعدہ صاف کر کے وہاں وضو کے لیے لوٹے رکھے گئے۔ پانی کے لیے ایک کنواں ہوتا تھا، اس سے پانی نکال کر لوٹے بھر دیے جاتے اور بچے نماز پڑھتے، بعض ٹیچر کہتے کہ حکومت کا حکم پورا کرنا لازم ہے اس لیے وضو کے بغیر بھی جائز ہے ایک روز ہیڈ ماسٹر صاحب نے سب کو جمع کیا اور کہا کہ جسم سکول میں تو روح کا ہونا بھی لازم اور جسم عبادت میں تو روح کا ساتھ ہونا بھی لازم، عبادت وہی مانی جاتی ہے جو اس کہنے کے مطابق ہو جس کا عبادت کروانے والے نے حکم دیا ہے، یہ دونوں کا جنم جنم کا ساتھ ہے۔ ایسے نہیں ہوگا کہ پہلے روح مرتی ہے پھر جسم، جسم کی غذا الگ اور روح کی الگ، وہ کہہ رہے تھے اور ہمیں سمجھ آ رہی تھی کہ کیوں اور کس کو کہہ رہے ہیں پھر کچھ دنوں بعد باقی نمازوں کے لیے حکم آ گیا کہ نماز پڑھ کر تمام بچے اپنے والدین سے ایک رپورٹ کارڈ پر دستخط کروا کے لایا کریں، بچے عصر، مغرب اور عشا کی نمازیں اپنے اپنے والدین کو دکھا دکھا کر پڑھتے، پھر ان سے دستخط کرواتے۔ اکثر انگوٹھا لگوا کر لاتے، ان کی زیادہ قدر افزائی ہوتی۔ سچ یہ ہے کہ نماز کی عادت وہیں سے پڑی۔ اس کا اجر اس حکمران اور افسر کو ضرور جائے گا جس نے یہ سوچا اور حکم جاری کرایا اور اس کو بھی جس جس نے پورے خلوص سے اس پر عمل کروایا۔ ویسے تو یہ ہر مسلمان حکومت کا فرض ہے۔ اسی عمر میں اللہ سے محبت

کرنے، اس سے دعا، مانگنے، اس سے شرم کرنے، اس سے ڈرنے اور اس کے ناپسندیدہ کاموں سے رکنے کا تصور پہلی پہلی بار زندگی میں آتا ہے۔ پہلی پہلی غلطی ہوتی ہے جو بار بار ہو تو گناہ بن جاتی ہے۔ اللہ سے معافی مانگنے کا طریقہ اور دعا سمجھ آتی ہے اور روح شادکام ہوتی ہے۔

اچھی بُری صحبت کا فرق سمجھ آتا ہے:

اپنی ذات پر کوئی داغ دھبہ نہ لگے۔ اس کا احساس ہوتا ہے۔ بعض لڑکے لڑکیاں اپنی خوب صورتی کی وجہ سے آنکھوں کو اچھے لگنے لگتے ہیں مگر اچھے اساتذہ کے بتانے پر اور ان بچوں کی بدنامی دیکھ کر ان سے دوستی کا خیال دل سے نکالنا پڑتا ہے۔ اچھی بری صحبت کا فرق سمجھ آتا ہے۔ اچھا بُرا نظر آنے لگتا ہے اور روح داغدار ہونے سے بال بال بچ جاتی ہے۔ استاد ہی ایسے میں بزرگوں کے روح پرور واقعات سناتے ہیں اور دل کی دنیا میں تبدیلی لاتے ہیں۔ اچھی کتابوں اور رسائل سے متعارف کرواتے ہیں، ہاں جس غریب نے خود ہی کبھی نہ کتاب پڑھی ہو وہ بتائے گا کیا اور نچوڑے گا کیا۔

والدین کے آگے بولنے کی ہمت اور ان سے محبت:

سکول کے دنوں میں والدین کی باتیں ماننے کی بجائے ان سے ضد کرنے، اور ان کی باتوں اور تنقید پر آگے سے جواب دینے کی ہمت پیدا ہونے لگتی ہے پھر جیسے جیسے کوئی خودشناس استاد بتاتا ہے کہ اللہ رسول کو یہ طرزِ عمل اور اونچی آواز میں والدین سے بولنا پسند نہیں ہے اور یہ کہ والدین پر تو محبت کی نظر ڈالنا، انہیں محبت سے دیکھنا عبادت ہے۔ ان کے آگے بولنا تو گناہ ہے۔ ان کے سامنے اونچی آواز سے بولنا ایسا ہے جیسے گدھے کی سی آواز نکالنا، تو روحانی طور پر والدین سے محبت اور ان کی اطاعت پر آمادگی ہونے لگتی ہے۔ کسی استاد سے یہ جان کر کہ اللہ کے رسول ﷺ نے بڑوں کی عزت اور چھوٹوں سے شفقت نہ کرنے والوں کو مسلمانوں کے گروہ سے ہی خارج کرنے کا فرمایا ہے تو دن میں تارے نظر آنے لگتے ہیں، بہن بھائیوں سے لڑائیوں کی تعداد اور مقدار کم ہونے لگتی ہے، بزرگوں کی بار بار تنقید پر غصہ آنا کم ہونے لگتا ہے مگر یہ ہوتا تب ہے جب کوئی استاد بتاتا ہے۔ اس

عمر میں جھوٹ بولنا اچھا اور آسان لگتا ہے چونکہ بڑے اپنے بچوں سے جھوٹ کی توقع ہی نہیں کر رہے ہوتے مگر جیسے ہی علم ہوتا ہے کہ یہ ظالم جھوٹ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ خود اپنے فیصلے اور اپنی مرضی سے بار بار جھوٹ بولنے کے مواقع پا کر بھی سچ بولنے کی ہمت عادت میں ڈھلتی ہے۔ اصل میں یہ روحانی خودشناسی ہوتی ہے جو منزلیں طے کر کے زندگی کے فیصلے لینے کی پوزیشن لے رہی ہوتی ہے۔

جسم میں بڑی بڑی تبدیلیاں اور روح کی مضبوطی:

آٹھویں، نویں جماعت تک آتے آتے جسم میں بڑی بنیادی تبدیلیاں آ جاتی ہیں۔ بلوغت آ جاتی ہے۔ آواز بھاری ہو جاتی ہے۔ اچھے برے خیالات شدت سے ذہن میں آنے لگتے ہیں۔ جب جب کوئی دیکھنے والا نہیں ہوتا اور گناہ کا موقع آسان ہوتا ہے تو انسان کی روح کی مضبوطی اور خوب صورتی ہی اسے بدصورت ہونے سے بچاتی ہے۔ یہ روحانی خودشناسی کا نئی منزلوں کا سفر ہوتا ہے۔ ایسے میں کسی اچھے استاد، کسی عالم دین، کسی اچھی کتاب یا خود قرآن پاک پڑھنے اور اس کے مطلب جاننے سے روح کو طاقت ملتی ہے۔ وہ اپنی خوبصورتی اور مضبوطی کے لیے، نظروں اور خیالات کی پاکیزگی کا مطالبہ کرنے لگتی ہے۔

جسم کو روزانہ تین بار کھانا نہ ملے تو بھوک کا احساس ستاتا اور جسم کو تڑپاتا ہے۔ اسی طرح جسم کو اچھا لباس، اچھی خوشبو اور اچھی مسکراہٹ بھی چاہیے۔ روح کیسے پیچھے رہ سکتی ہے اسے اپنی غذا چاہیے جو قرآن پاک روز پڑھنے سے ملتی ہے، رب کو یاد کرنے، اسے پیار کرنے سے ملتی ہے۔ انسانوں کا اچھا سوچنے سے۔ اچھے کام کرنے سے، اچھے فیصلے کرنے سے بھی روح کو طاقت ملتی ہے، گناہ ثواب کا فرق اور خواہشوں کی تبدیلی سمجھ میں آتی ہے۔ اسی لیے ہر سمجھدار والد، استاد اور عالم چھوٹی عمر میں ہی اپنے بچوں اور بچیوں کو نیکی، بدی، خیر شر، گناہ ثواب کا فرق بتانے کو لازم تصور کرتے ہیں۔

اسی عمر میں بچے بغیر کسی دباؤ اور سختی کے اپنی مرضی اور خوشی کے ساتھ نماز باجماعت ادا کرنے لگتے ہیں۔ روزانہ قرآن پاک کو ترجمے سے پڑھنے لگتے ہیں۔ لڑکیاں سر پر دوپٹہ لینے لگتی ہیں، اپنا

سینہ ڈھانپنے لگتی ہیں۔ ان کی نگاہوں میں فطری شرم اور حیا آ جاتی ہے۔

اسی عمر کی عادتیں عمر بھر انسان کے ساتھ رہتی ہیں، ہم جان جاتے ہیں کہ روح مضبوط ہوگی تو کردار مضبوط ہو جائے گا۔ روح کمزور ہوئی تو کردار کی خرابی سب کو نظر آنے لگتی ہے اور اس پر اپنے پیارے رب کی ناراضگی کا سامنا بھی کرنا پڑے گا جو اصل میں اس روح کا مالک اور خالق ہے۔ اسی طرح ہر غلطی اور ہر چھوٹے سے چھوٹے گناہ سے روح کو داغدار ہونے سے بچانے کا مضبوط خیال طاقت پکڑتا ہے۔

خودشناسی اور خاص طور پر روحانی خودشناسی اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وقتاً فوقتاً اپنا جائزہ تنہائی میں لیا جاتا رہے کہ رب سے کس قدر محبت ہے۔ اس کے آخری اور محبوب رسول ﷺ سے کتنی محبت اور قربت ہے۔ دل میں حضرت محمدؐ جیسا بننے کی کتنی خواہش ہے۔ اسی عمر میں پتا چلتا ہے کہ اکیلے میں جائزہ لیتے ہوئے کیا ہم اپنے دل میں پوشیدہ، خوابوں اور خیالوں کو کسی پلیٹ میں رکھ کر لوگوں کے سامنے رکھنے کی ہمت رکھتے ہیں، اگر نہیں تو پھر ان خیالوں اور خواہشوں کو بدل لینے کا خیال سر اُٹھاتا ہے۔

بچپن میں روح میں سما جانے والے خیالات عمر بھر ساتھ رہتے ہیں اور بے خیالی اور بے دھیانی میں بھی آپ کی سوچ اور عمل کے گرد حصار بنائے رکھتے ہیں۔ میں بھی ان بے شمار نوجوانوں میں سے تھا کہ جنہیں نماز اتنی عزیز ہو جاتی ہے کہ فلم دیکھنے جائیں تو بھی نماز کے اوقات کا خیال ہوتا تھا کہ وہ قضا نہ ہو جائے۔ بعض دین دار لوگ اس پر ناراض بھی ہوتے ہیں، طعنے بھی دیتے ہیں مگر انسانی زندگی بہتی ندی جیسی ہے۔ زندگی کا پانی کبھی پہاڑی علاقے میں اور کبھی میدانی ڈیلٹا میں بہتا ہے۔ جگ کے پانی میں روح افزا ڈال کر آپ فوراً میٹھا اور رنگ دار کر سکتے ہیں، بہتے پانی اور چلتی زندگی کے ساتھ یہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ مگر روحانی خودشناسی کی طاقت اور قوت اپنی استطاعت کے مطابق کام کر رہی ہوتی ہے۔

80ء کی دہائی میں میں نے ائیر فورس جی ڈی پائیلٹ کے لیے اپلائی کیا۔ مجھے اے کے سی ای ۲۶ نمبر

بھی اچھی طرح یاد ہے جو کوہاٹ میں ISSB کے لیے الاٹ ہوا تھا، الحمد اللہ وہاں سے کامیاب ہو گیا، کراچی میڈیکل کے لیے رپورٹ کرنے کو کہا گیا۔ زندگی میں پہلی بار کراچی گیا۔ وہاں سے انہوں نے ایک مائنر سا اعتراض لگا کر دوبارہ آنے کو کہا، دوسری بار چھوٹے بھائی اظہر عباس کو کراچی کی سیر کے لئے ساتھ لے گیا۔ ائیرفورس بیس پر بتایا گیا کہ تین سیٹیں کم کردی گئی ہیں اس لیے ISSB کر کے آنے والوں میں سے 3 کو ڈراپ کردیا گیا، میں بھی ان میں شامل تھا، اللہ جی نے یقیناً میرے لئے بہت بہتر زندگی رکھی تھی مگر اس لمحے افسوس تو ہوا، چھوٹے بھائی کو لے کر صدر کے علاقے میں غم غلط کرنے کے لیے گھومنے نکلا، وہاں جگہ جگہ سینماز تھے۔ ہم ہر سینما میں جاتے۔ تصویریں دیکھتے اور باہر آجاتے، بھائی کی فرمائش تھی کہ کوئی انگریزی فلم دیکھی جائے، دل میرا بھی بہت چاہ رہا تھا مگر کہیں اندر سے سرخ جھنڈی لہراتی نظر آرہی تھی۔ ایک فلم لگی تھی" ریان ڈاٹر" اس زمانے کے لحاظ سے کافی بولڈ اور بے ہودہ تصاویر دیواروں پر آویزاں تھیں، فلموں کے پوسٹر دیکھتے دیکھتے اور سینما سینما گھومتے فلم شو کا وقت گزار دیا، چھوٹے بھائی نے افسوس کا اظہار کیا اور میں دل میں خوش تھا کہ اس نے تو زندگی کی پہلی فلم دیکھنی تھی، اس کی سوچ پر داغ لگانے کی وجہ میں کیوں کر بن سکتا تھا۔

روحانی خودشناسی کی مضبوطی کے لیے استاد، والدین اور دینی راہنما اگر چاہیں تو نرمی، پیار اور محبت سے بچوں کے احساسات کی دنیا میں اس تصور کو بٹھا سکتے ہیں۔

دینی معلومات کے اعتبار سے زمانہ طالب علمی بالکل کچی پکی سی عمر ہوتی ہے مگر یہ ضرور واضح رہنا چاہئے کہ اللہ کی اعلانیہ نافرمانی کبھی نہ ہو، جو جو اس کو پسند ہے، اس سے محبت ہو اور جو جو ناپسند ہے اس سے دوری رہے۔ مشکوٰۃ میں ایک حدیث پڑھی تھی کہ "خدا سے ڈرنے والوں کے لیے دولت مند ہونا کوئی تشویش کی بات نہیں اور خدا سے ڈرنے والوں کے لیے صحت دولت سے کہیں زیادہ بہتر نعمت ہے اور دل کا سرور اور اطمینان خدا کی بڑی نعمتوں میں سے ہے" اس رات جب اپنے ماموں کے گھر سونے کے لیے لیٹے تو جسم چل چل کر اکڑا ہوا تھا مگر یہ اطمینان ضرور تھا کہ غلط کام سے بچا کر لے آیا ہوں اور اس کوشش پر میں اپنے رب کے سامنے ضرور سرخرو تھا

روحانی خودشناسی کی مضبوطی اور خوب صورتی:

روحانی خودشناسی کی مضبوطی اور سب سے خوب صورتی اپنے مالک اور خالق کی پہچان اور اس کی خوشی اور احسان کا خیال رکھنے کی سوچ ہے۔ بڑوں سے ہمیشہ یہی سنتے تھے کہ ''رب راضی تے جگ راضی''۔ بڑوں کا مؤدب ہونا۔ جھوٹ اور گناہ کی باتوں سے بچنا، نماز اور عبادتوں کے لیے شوق ہونا، استادوں کا احترام، والدین کی عزت، انسانوں کی خدمت یہ لفظی باتیں نہیں، روح کی مضبوطی کا عملاً اظہار ہوتی ہیں۔

اسی عمر میں حضرت عبداللہ بن عمر سے متعارف ہوئے کہ وہ حضرت عمر کے صاحبزادے تھے انہوں نے بہت سعید روح پائی تھی۔ انہوں نے آنحضورؐ کا ارشاد بتایا کہ انسانوں کے دلوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے جس طرح پانی پڑنے سے لوہے کو زنگ لگتا ہے۔ پھر فرمایا اس زنگ کو دور کرنے کا ذریعہ اور طریقہ کثرت سے موت کی یاد اور قرآن پاک کی تلاوت ہے۔

خود اپنے بچپن میں قرآن پاک ناظرہ والدہ سے مکمل کیا کچھ حصہ مولوی صاحب سے مگر میٹرک کی چھٹیوں میں چند ماہ کے لیے والد صاحب نے مدرسہ بھیجنا شروع کیا کہ قرأت ٹھیک کرلو۔ وہاں کے ماحول میں عجیب ڈر اور خود ترسی نظر آئی کہ جس کا لازمی نتیجہ روحانی درجات کی بلندی اور بالیدگی کا منہ کے بل گرنے کی صورت نکلا۔ میں مدرسے میں چند ہفتے بھی نہ نکال سکا۔ مولوی صاحب اور ان کے شاگردوں سے ایک ٹیکنیکل اختلاف ہوگیا۔ وہ دوزانو ہوکر بیٹھنے پر زور دیتے بلکہ اصرار کرتے۔ مجھ سے ویسے بیٹھا نہیں جاتا تھا۔ میں چوکڑی مار کر بیٹھتا تھا۔ ان کی ضد اور اصرار کافی مضبوط اور قدآور تھا۔ میری معصوم قسم کی مجبوری تھی کہ مجھ سے ویسے بیٹھا نہیں جاتا تھا، یوں ان کے ساتھ تعلق بننے اور بڑھنے کی یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی اور یہاں روحانی ترقی کے امکان روشن ہونے سے پہلے ہی بجھ گئے۔ تصوف والی روحانی بلندی کی خبر کافی بعد میں ہوئی جب اشفاق صاحب سے واسطہ پڑا۔

روحانی خودشناسی کی بہت عمدہ مثال حضرت عبداللہ بن عباس کی ہے۔ جو آنحضورؐ کی خدمت

پر مامور تھے۔ رسول اللہ فوت ہوئے تو وہ تیرہ سال کے تھے۔ انہوں نے خدمت بھی خوب کی، سیکھا بھی اور آنحضور کی توجہ بھی پائی۔ انہوں نے ایک حدیث بیان کی کہ فرمایا "جس نے اس حال میں صبح کی کہ وہ ماں باپ کے بارے میں اللہ کے نازل کردہ احکامات اور ہدایات کی فرماں برداری کرنے والا تھا تو اس نے گویا اس حال میں صبح کی کہ اس کے لیے جنت کے دروازے کھلے تھے اور اگر ماں باپ میں سے کوئی ایک ہو تو گویا جنت کا ایک دروازہ کھلا ہوا تھا اور جس نے اس حال میں صبح کی کہ وہ ماں باپ کے بارے میں اللہ کے احکامات سے منہ موڑنے والا ہے تو اس نے اس عالم میں صبح کی کہ اس کے لیے دوزخ کا ایک دروازہ کھلا تھا"

ایک شخص نے کہا یا رسول اللہ ﷺ اگر ماں باپ زیادتی کر رہے ہوں تب بھی!

آپ نے فرمایا ہاں تب بھی۔

کس کی ناک خاک آلود ہوگی:

ماں باپ سے حسن سلوک، اطاعت اور فرماں برداری بھی روحانی خود شناسی کا ہی ایک پھل ہے۔ اسی زمانے میں ایک اور حدیث پڑھی کہ اس کی ناک خاک آلود ہو۔ آپ نے تین بار دہرایا کہ لوگوں نے متوجہ ہو کر پوچھ ڈالا کس کی ناک خاک آلود ہوگی۔ فرمایا جس سے ماں باپ کو بڑھاپے میں پایا اور ان دونوں کی خدمت کر کے اس نے جنت میں داخلہ ممکن نہ بنا لیا۔

اپنے بچپن کی دو کتابیں آج بھی یاد ہیں جنہوں نے اس حوالے سے راہنمائی کی۔ ایک آیت اللہ سبحانی صاحب کی مخزن اخلاق اور دوسری مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کی بہشتی زیور۔ میں سکول کے زمانے میں دونوں پڑھ چکا تھا اور کئی اسلامی تصورات واضح ہو گئے تھے مگر کئی تاریخی دھندلا ڈالے تھے۔ جن کو واضح کرنے میں نسیم حجازی کے خوبصورت تاریخی ناولوں نے بہت کردار ادا کیا۔ مثلاً داستان مجاہد، آخری چٹان، قیصر و کسریٰ، محمد بن قاسم، اور تلوار ٹوٹ گئی، یوسف بن تاشفین، قافلہ حجاز۔

نسیم حجازی صاحب کے کردار بہت صاف، خوبصورت، بہادر اور ہمت نہ ہارنے والے

تھے۔ وہ محبت بھی کرتے تو اتنی ملائمت اور معصومیت کے ساتھ کہ حجازی صاحب ایک دو جملوں میں نمٹا دیتے '' خوشگوار دھڑکنیں '' اسی زمانے میں پہلی بار سمجھ آئیں ان کے کردار اللہ رسول سے محبت اور اسلام کے لیے قربان ہو جانے کا بے پناہ جذبہ پیدا کرتے رہے۔ کچھ سالوں سے ایک کالم نگار صاحب نے نسیم حجازی صاحب کے خلاف لکھنا شروع کیا تو بہت تکلیف ہوئی۔ نسیم حجازیت تو ایک فخر۔ ایک احساس اور قوم کی نئی نسل کو اپنی تاریخ سے جوڑنے کا شاندار اور کامیاب مقام ہے۔ جھوٹے سچے کالم لکھنے سے نہ روح مضبوط ہوتی ہے نہ قوم۔ دونوں جھوٹ اور جذبات کے گندے پانیوں میں غوطے کھاتے رہتے ہیں۔

میں نے تو روحانی خود شناسی کے لیے جناب ممتاز مفتی کی کتاب ''لبیک کو بے حد مفید پایا۔ جو اللہ سے ایک بہت ہی محبت بھرے تعلق میں باندھ دیتی ہے۔ پھر ایک روز میں اپنے انتہائی عزیز دوست اکرم زبیر کے ساتھ ممتاز مفتی کے گھر چلا گیا اسلام آباد، راستے میں ان کے لیے کیک خریدا جب گھر پہنچے تو پوچھنے لگے کیوں آئے ہو۔ میں نے کہا آپ کو دیکھنے، آپ سے ملنے تو بولے میں کوئی بابا تھوڑی ہوں جو مجھ سے ملنے آئے ہو۔ ہم عقیدہ نہیں پالتے عقیدت پالتے ہیں۔ تم یہ نہ کرنا۔ باتوں باتوں میں روحانیت کا ذکر آیا کہ یہ ہے کیا بلا؟

بولے '' پہلے تو مجھے علم نہیں تھا جب پتا چلا کہ سچ کہتا ہوں میری مت ماری گئی۔ پہلے عقل پر بھروسا کرتا تھا۔ حقائق پسند کرتا تھا۔ زندگی سکون سے گزر رہی تھی۔ پھر سمجھ آئی کہ روحانیت کوئی الگ شے تو ہے ہی نہیں ایک ہی سکے کے دو رخ ہیں ایک دنیا ایک آخرت۔ ہم نے بے وجہ انہیں الگ الگ کر رکھا ہے۔ روحانیت کے چکر میں پڑ کر اب عقل پر بھروسہ نہیں رہا۔ سپر نیچرل اور روحانیت کا سراملتا نہیں بس اتنا سمجھ آیا ہے کہ ہمارے پاس قرآن ہی نہیں محمد ﷺ بھی ہیں جس طرح قرآن بے مثل کتاب ہے ویسے ہی محمد ﷺ بے مثل انسان ہیں۔ قرآن لفظوں میں اللہ کے احکام ہیں اور محمد ﷺ عمل کی شکل میں اللہ کے احکام ہیں۔ ''

روحانی تصورات صرف دنیا تک محدود نہیں ہوتے:

روحانی تصورذات صرف دنیا کی زندگی تک محدود نہیں ہوتا یہ آخرت میں جنت کے باغوں اور جہنم کے شعلوں تک جاتا ہے۔ یہ زندگی کی ساری خوشیوں، نیک ناموں اور خوش گواریوں کا احاطہ کرتا ہے۔ روح مطمئن تو جسم مطمئن، گناہوں کے بوجھ اور احساس کے ساتھ روح خوش نہیں رہ سکتی۔ اپنی ذات کو بچانے، روحانی طور پر طاقتور بنانے کا تصور ہوتو ہی عمل ویسا ہو پاتا ہے۔ اور زندگی میں نتائج اور کامیابی کا معیار ویسا ہی ہوگا۔

جن کے بچپن میں خیالات کی انتہا پسندی آ جاتی ہے وہ نہ صرف دوسروں کو قبول نہیں کرتے بلکہ دوسروں کے خیالات کی عزت اور احترام کرتے بھی نہیں کرتے۔ روحانی طور پر مضبوط تصور رکھنے والوں میں برداشت کی خوبی بہت زیادہ ہوتی ہے۔ چونکہ انکا ایمان ہوتا ہے کہ روح کی غذا اور مضبوطی تو انہیں اپنے مالک اور خالق سے جڑنے اور اسکی باتیں ماننے سے حاصل ہوتی ہے۔

خودآگاہی رکھنے والے کا ذکر کیسے ہوگا:

خودآگاہی ہی ایک استاد کو اس طرز عمل کی تفہیم اور تیاری پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ کسی گروہ، گروپ، ادارے، ملک اور یہاں تک کہ دنیا سے رخصتی کے بعد اپنے لیے کیا تاثر یعنی لیگیسی (Lagacy) چھوڑ کر جانا چاہتا ہے۔ لوگ اسے ایک خوددار، خودآگاہ اور مفید و کارآمد، استاد کے طور پر یاد کریں گے یا اس کے برعکس اس کی کمزوریوں کے حوالے سے اپنی رائے بنائیں گے۔

ایک خودشناس استاد کے طور پر اس کا ذکر ہوگا یا ایک ناکام و نامراد، نوکری پیشہ انسان کے طور پر کہ جس نے نہ اپنے آپ کو جانا' نہ اپنے عہد کے تقاضوں کو سمجھا اور نہ آنے والی زندگی کی ضرورتوں کا احساس کیا، اور اس ناسمجھی اور بے خبری میں اپنی عمرعزیز کا سارا دورانیہ ضائع کر بیٹھا۔

''گھر، خاندان، سکول، دفتر اور معاشرے میں لوگوں سے تعلقات، معاملات، ڈیلنگ اور قربت و دوری کے روابط کے تعین کی بنیادیں بھی خودآگاہی ہی طے کرواتی ہے''۔

☆..........☆..........☆

3

باب سوم

تصور کامیابی کا تعین

"خود شناسی ہی استاد کے تصور کامیابی اور ناکامی کا تعین کرتی ہے۔ اس کا فرق واضح کرتی ہے۔ ایک عام آدمی کے لیے جو چیز کامیابی ہوگی، ایک خود آگاہ استاد کے لیے ممکن ہے وہ گھاس کے سوکھے تنکے یعنی پرِ کاہ جیسی بھی نہ ہو۔ اس کا درست تصور، ہی کامیابی کی شکل، منزل اور حدود کی وسعت کا تعین کرتا ہے۔ ہر کامیابی کی ایک قیمت ہوتی ہے۔ خود آگاہی ہی ایک استاد کی راہنمائی کرتی ہے کہ اس کامیابی کی خواہش کو پورا کرنے کے لیے ضروری قیمت کیسے ادا کی جاسکتی ہے یا صرف اس کا خواب دیکھ کر افسوس سے ہاتھ ملتے رہنے والی کیفیت پر گزارا کرنا کافی ہوگا۔

خود شناس استاد کی شخصیت کیسے آزادانہ ہوتی ہے:

ایک خود شناس استاد کی شخصیت ہی اس وصف اور خوبی سے آراستہ ہوتی ہے جو اسے اپنے اندر کسی بھی بڑے خواب کو حاصل کرنے، اسکی قیمت ادا کرنے کے لیے ضروری محنت کرنے پر اکساتی، تیار کرتی اور راستہ دکھاتی ہے، اسی لیے تو کہا جاتا ہے جسے لمبا فاصلہ طے کرنا ہو اسے رات کے پہلے پہر سفر کا آغاز کرنا چاہیے۔ بڑی کامیابی کے لیے محنت بھی زیادہ کرنا ہوتی ہے اور صلاحیتوں کا استعمال بھی مگر یہ تبھی ہوتا ہے جب اس منزل اور کامیابی کا تصور واضح ہو اور جس راستے پر جا کر اسے حاصل کرنا ہے۔ اس کے خدوخال بھی نمایاں ہوں۔

خود آگاہی کی راہ میں حائل 4 رکاوٹیں:

1۔ تحقیق یہ بتاتی ہے کہ خود آگاہی کی راہ میں حائل سب سے بڑی رکاوٹ انسان کے اندر کا خوف ہے۔ یہی خوف عام طور پر انسانی زندگی کے بڑے فیصلوں کو کرنے نہیں دیتا۔ آگے بڑھنے، نیا کام کرنے، نئی بات سوچنے، یہاں تک کہ اپنے دل میں آئی اچھی بات کہنے میں حائل ہو جاتا ہے کہ لوگ کیا کہیں گے!۔

"میں یہ نہیں کر سکوں گا!"

"میں ناکام ہو جاؤں گا!"

"پہلے یہ کام کوئی اور کرے پھر میں کروں گا"

جیسے خیالات اور جذبات ذہن کو درست فیصلہ کرنے سے روکتے ہیں۔

2۔ خود آگاہی کی راہ میں دوسری بڑی رکاوٹ انسان کا اپنی زندگی کے اصل مقصد سے ناواقف اور وژن سے بے خبر ہونا ہے۔ وژن انگریزی کا لفظ ہے جو زندگی کے سب سے بڑے تصور کا احاطہ کرتا ہے۔ یاد رکھئے وژن ہمیشہ مشن اور مقصد سے بڑا ہوتا ہے۔ یہ زندگی کا وہ خواب اور خیال ہوتا ہے جو کسی بھی بڑی سوچ، بڑے منصوبے، علم، فہم اور بڑے کام کی وجہ بنتا ہے۔ مشن اس کو پانے، حاصل کرنے کا ایک طریق کار ہوتا ہے جس میں ساری باتوں کا حصول ممکن نہیں ہوتا۔ خود آگاہ آدمی کا وژن زندگی سے ہمیشہ بڑا ہوتا ہے۔ وژن کی غیر موجودگی اصل میں خود آگاہی کی طرف اٹھنے والے قدموں کو ہی روک ڈالتی ہے۔ مالی کا بیٹا مالی ہی رہے گا اگر وہ اس باغ کا مالک بننے کیلئے اعلیٰ درجے کی پڑھائی کا نہیں سوچتا۔ اتنی آمدن کا طے نہیں کرتا جو اسکے خاندان کی حالت بدل دے۔ اس کے خیالوں کی قیمت ادا کر سکے۔

3۔ تیسری بڑی رکاوٹ انسانی فہم کی محدودیت ہے۔ انسان جو کرتا ہے۔ صرف اسی کو مکمل اور بہتر جانتا ہے۔ اس سے بہتر سوچ، مختلف طریق کار کو چونکہ اس نے آزمایا نہیں ہوتا، اس لیے آسانی سے آزمانے پر تیار بھی نہیں ہوتا اور اکثر اسے ناقابل فہم ہی نہیں ناقابل عمل سمجھ کر چھوڑ دیتا ہے اور اس موضوع پر سوچنے، بات کرنے اور ماننے پر اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر پاتا۔ یوں خود آگاہی کا ایک نہایت قیمتی موقع گنوا دیتا ہے۔ جیسے آپ نے بہت سے لڑکوں کو نصاب کے منتخب حصوں کی تیاری کر کے میٹرک کرتے دیکھا ہوگا۔ آپ کا ذہن بھی ایسا ہی کرنا چاہتا ہے کہ پاس تو ہو جاؤ گے مگر پوری تیاری کر کے دیکھو گے تو اعلیٰ درجے کی کامیابی مل سکتی ہے۔ پوزیشن آ سکتی ہے۔ جو آنے والے ہر دن کام آتی ہے۔

4۔ چوتھی وجہ بڑی دلچسپ بھی ہے اور فکر وتدبر پر آمادہ کرنے والی بھی۔1962ء میں سماجیات کے استاد اور محقق ہایا کاوا(Haya Kawa) نے کہا کہ زندگی کا پہلا اصول "اپنی حفاظت اور بچاؤ Self Preservatiron نہیں ہے بلکہ اپنی ذات بارے، اپنے دل میں موجود تصور یعنی (Self Image) کو بچانا ہے۔" اس بات نے سوچ کے نئے دروازوں کو کھولا ہے۔

مغربی مفکر براہم میسلو (Braham Maslow) جس نے مشہور تھیوری آف نیڈز دی تھی جو آج تک دنیا بھر میں رائج ہے اور مانی جاتی ہے، نے بھی1962ء ہی میں کہا "خود آ گاہی اصل میں ساری عمر اپنے بارے میں عظمت کے تصور اور احساس کے خلاف لڑنا ہے۔"

"This is the struggle against our own greatness"

عظمت کے جھوٹے احساس سے بھرے استاد:

ہم نے زندگی میں بار بار دیکھا ہے کہ اپنی عظمت کے جھوٹے احساس سے بھرے اور چھلکتے استاد کبھی بھی حقیقت حال دیکھنے، ماننے اور جاننے پر تیار نہیں ہوتے۔ آپ سو بار سمجھائیے۔ بتائیے ،وہاں سے ایک ہی جواب ملے گا کہ وہ بہتر سمجھتے ہیں جو کرتے آئے ہیں وہی ٹھیک ہے۔ ہمارے بزرگ اور بڑے بھی یہی کرتے اور کہتے رہے ہیں ہم ان سے مختلف کیوں ہوں۔ ہم، ہمارا خاندان ،ہماری سوچ ہی سب سے اعلیٰ ہے۔ آج تک تو اسے کسی نے چیلنج نہیں کیا، تم کہاں سے ہمیں سمجھانے آ گئے ہو ہم خود زندگی کو بہتر سمجھتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ اس کی ایک عملی مثال ہمارے شاہد آفریدی جیسے ان کھلاڑیوں کی ہے جو ہمیشہ ایک جیسی غلطی کر کے ایک ہی طرح کی بال پہ، ایک ہی طرح کی غلط شارٹ کھیلتے ہوئے آؤٹ ہوتے ہیں اور اپنے کوچ کی نہیں مانتے کہ میں ایک ہیرو! میں اتنے سال سے اسی مہارت کے ساتھ کھیل رہا ہوں، کیسے بدل لوں اپنے آپ کو! اساتذہ کی اکثریت کے ہاں بھی یہی سوچ خود آ گاہی کی راہ میں چوتھی بڑی رکاوٹ بنتی ہے۔

چند برس قبل آزاد کشمیر کے شہر باغ میں ای ایل ایم کی کلاس پڑھا رہا تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور ایک صاحب نے کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا کہ سر میرے سکول کے بچے باغ آئے ہیں ان کی اسسٹنٹ کمشنر سے ملاقات ہے مگر اس سے پہلے میری خواہش ہے کہ آپ کی ان سے ملاقات ہو جائے، سامنے زیادہ تر سکولوں کے پرنسپلز ہی بیٹھے تھے، بچے ترتیب سے اندر آنے لگے، ہاتھ ملاتے میں ان سے حال احوال لیتا پھر وہ آگے بڑھ جاتے، ایک دو بچے ایسے تھے کہ ان کی پتلونوں کے پائنچے کئی کئی انچ اونچے تھے، ایک کا ناک بری طرح بہہ رہا تھا، اس وقت ہمارا موضوع ٹوٹل کوالٹی آف ایجوکیشن چل رہا تھا، میں نے اسی حوالے سے ایک بچے کو گود میں لے کر میز پر کھڑا کر دیا اور پوچھا کہ اے سی سے ملنے کیوں جا رہے ہیں ٹیچر سے جواب نہیں ملا، میں نے وضاحت کی کہ یقیناً اپنے بہتر تعارف، برانڈنگ اور بچوں کے ایکسپوژر کے لئے جا رہے ہوں گے، تینوں وجوہات مضبوط تھیں، قابل تعریف تھیں، مگر کوالٹی کا اظہار بے حد کمزور تھا، یہ سکول کے سربراہ سے زیادہ اس ٹیچر کی سوچ کی کوالٹی بہتر کرنے کا مرحلہ تھا جو بچوں کو لیکر جا رہا تھا، ان کے کپڑے، ان کے ناک گندے ہوں گے تو جس کام کے لئے جا رہے ہیں اس کے برعکس نتائج ملیں گے اور الٹا تاثر بنے گا۔ بات ختم ہوگئی بچے چلے گئے، شام کو جا کر کلاس ختم ہوئی، ابھی آرام کرنے بیٹھا تھا کہ کچھ لوگ ملنے آ گئے، وہ سخت ناراض تھے کہ میں نے بچوں کی توہین کی ہے اور مجھے ایک بچے کو میز پر نہیں کھڑا کرنا چاہیے تھا، میں نے بڑی معصومیت سے پوچھا پھر آپ کو آپ کی تعلیم کی کوالٹی کیسے بتاتا، جو کمی کوتاہی تھی وہ کیسے دکھاتا، ان کا اصرار جاری رہا، میں نے البتہ افسوس اور صدمے کے باعث چپ سادھ لی، کج بحثی مجھے کبھی بھی محبوب و مرغوب نہیں رہی۔ خودشناسی کے حامل ہوتے تو ایسا کبھی نہ کرتے، وہ نہ صرف اپنی رائے پر قائم رہے بلکہ انہوں نے مقامی روایات کے مطابق ہیڈ آفس ایک درخواست بھی ڈال دی کہ یہ ہماری عظمت پر انگلی اٹھانے جیسا تھا اور یہ حیرت کی بات بالکل نہ تھی کہ یہ سارے ہی استاد تھے۔

خودشناسی کے خلاف مزاحمت کی چھ وجوہات:

خودشناسی سے انکار اور اس کے خلاف مزاحمت کی چھ بڑی ٹھوس وجوہات ہوتی ہیں۔

استاد پورے دل سے سمجھتا ہے کہ خود آگاہی اصل میں اس کی کافی بڑی دشمن ہوسکتی ہے۔

کیونکہ وہ اسے خود پسندی کی اس ظالمانہ کیفیت سے نکالتی ہے۔

1۔ اپنی زندگی کے بہترین ہونے (کی غلط فہمی سے)

2۔ اپنے ٹیلنٹ اور خوبیوں کو سب سے بہتر جاننے (کی خوش فہمی سے)

3۔ اپنے خیالات کو سب سے اعلیٰ اور مقدم سمجھنے (کی خوش گمانی سے)

4۔ اپنے اندر کی چھپی قابلیتوں کے ناقابلِ عمل تصورات (کی خود گرفتاری سے)

5۔ اپنے عقائد، افکار، انداز اور اعمال کو سب سے مختلف اور ناقابل اصلاح جاننے کے (جھوٹے مغالطے) سے

6۔ اور اپنے آپ کو اعلیٰ درجے کا استاد جاننے اور بہترین تخلیق کار سمجھنے (کی کوتاہ بینی سے)

خود پسندی حقیقت پر مبنی سچ کے انکار پہ آمادہ کرتی ہے، شخصیت کی صحیح تصویر بنانے میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔ اس لیے خود آگاہی کیونکر آسانی سے قابل قبول ہوسکتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس لئے فرمایا تھا کہ خود پسندی تمہیں اپنی غلطیوں سے غافل نہ کردے، ان پر نظر کرنے سے روک نہ دے۔

پاپی دل کیسے مان جائے!

حقیقت یہ ہے کہ خود آگاہی تو زندگی بھر سنی سنائی، اور ادھر اُدھر سے پڑھی پڑھائی باتوں کی مدد سے اپنے من مندر میں اپنی خوب صورت سی مورتی بنانے اور اس پر روز نذرانے چڑھانے سے روک دیتی ہے۔ حقیقت حال دکھاتی اور زندگی کی پوری تصویر دکھاتی ہے تو ایسی سوچ انسانی ذہن کیوں کر آسانی سے قبول کرسکتا ہے جو اس کے دل میں سالوں سے آباد ایک خیالی اور تصوراتی گھروندے کو

اتنی آسانی سے ڈھا دے، حقیقت کو آئینہ بنا کر سامنے کر دے اور اپنے ہی دل کو اپنی پسند کی نبض کے ساتھ ساتھ چلنے کی آسانی اور مزے سے محروم کر دے۔

بے شک خود آگاہی سے لحاتی فیصلوں کی بجائے کھلی آنکھوں سے عمروں کے فیصلے کرنے کی راحت ملتی ہے مگر پاپی دل اتنی آسانی سے کیسے مان جائے! اس کے پاس سو سو دلیلیں ہوتی ہیں

خودشناسی پہ دل کیوں نہیں مانتا!

انسانی زندگی کی تمام خوبیوں، خامیوں، مہارتوں، کامیابیوں، ناکامیوں، رکاوٹوں، عادتوں حتیٰ کہ خوابوں اور خیالوں کا براہ راست تعلق بھی خود آگاہی اور خودشناسی سے ہے۔ ایک خود آگاہ انسان لازمی طور پر اس بات کے لیے کوشاں ہوگا کہ اپنی بہترین اور مکمل صلاحیتوں کے احساس اور ادراک کے بعد ان کا بھرپور استعمال کرے۔ خود آگاہی اسے مجبور کرتی ہے کہ ہر آنے والا لمحہ اس کی زندگی میں نیا علم، نیا ہنر اور نئی خوبی کی نوید لے کر آئے۔ وہ نہ صرف مسلسل سیکھنے کے عمل سے گزرتا ہے بلکہ خود آگاہی اسے اپنا جائزہ لیتے ہوئے مسلسل بہتری کی خواہش کو زندہ اور توانا رکھنے پر اکساتی ہے۔

ایک استاد کے لیے اس کی ضرورت اور اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ اس کی تو تمام سوچوں، اعمال اور کاموں کی بنیاد ہی خود آگاہی کو بننا ہے۔ یہ اس کی اصل قوت اور پہچان بنے گی ورنہ یہی کمزوری، مشکلات کی اس دلدل تک لے جائے گی جہاں سے نکلنا بے حد مشکل ہو جاتا ہے اور ساری خوشی غارت ہو جاتی ہے۔

خود آگاہی کیوں اور کہاں ضروری ہے:

خود آگاہی کا علم یہ بتاتا ہے کہ اس کا فہم اور ادراک براہ راست انسانی ترقی سے جڑا ہے۔ پہلی بار خود آگاہی پر تحقیق و جستجو کے بعد 1956ء میں مشہور محقق فرنڈ (Frnd) نے اس کی ایک تعریف متعین کی۔ اس نے اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔

''نئے علم کو جاننے اور پہچاننے سے خود آگاہی کا گہرا اور لازم تعلق ہے۔ دوسروں کو ان کی خوبیوں اور خامیوں سمیت قبول کرنا خود آگاہی کا حصہ ہے۔ یہ علم انسان کو اس بات کی طرف متوجہ

کرتا ہے کہ انسانوں کو بدلا اور بہتر بنایا جا سکتا ہے۔اس پر بھی قائل کرتا ہے پہلے ان کو ان کی موجودہ شخصیت کے ساتھ ہی قبول کرنا لازم ہوگا پھر ہی بہتری کی کوئی حکمت عملی تیار ہو سکے گی۔''

خودآگاہ کی ترقی:

ذاتی ترقی کے اہداف کی تیاری اور تعین بھی خودآگاہی کا حصہ ہے۔دنیا میں کس طرزِ عمل کے ساتھ جینا ہے اور اس دنیا کے بعد آنے والی دنیا میں ایک خودآگاہ استاد کو کیا مقام اور مرتبہ درکار ہے اس کے لیے اسے اس زندگی کے درمیانی وقفے میں کس قدر سمجھداری کے ساتھ اپنے شب و روز گزارنے ہیں کہ یہ اوقات سرمایہ کاری ثابت ہوں اور آخرت کے بعد ناختم ہونے والی طویل زندگی پوری خوشی اور آسودگی کے ساتھ بسر ہو سکے۔

شخصی احترام کی ضرورت اور فرق:

ہر انسان کی شخصیت کی ایک بنیادی ضرورت اس کی شخصیت کا احترام ہے۔خودآگاہ استاد اپنی شخصیت کے احترام و اکرام کے دائرے سے بھی آگاہ ہوگا اور ضرورتوں سے بھی، تمام کمزوریوں اور ان باتوں سے بھی واقف ہوگا جو اس کے احترام کے لیے نقصان دہ ہو سکتی ہے اور یہ بھی کہ اسے کہاں کہاں سے کیسے بچنا ہے۔مئی ۲۰۱۵ کے پہلے ہفتے کراچی کے اسسٹنٹ کمشنر کو اس لئے معطل کر دیا گیا کہ وہ اپنی بیٹی کو نقل کروانے کیلئے سنٹر پر موجود تھا

سائیکالوجی کے ماہرین تو یہاں تک کہتے ہیں کہ بے شک دوسروں کی نگاہوں میں آپ کی عزت ایک بنیادی انسانی ضرورت ہے مگر یہ عزت ایسی چیز ہے جو خود کمانی پڑتی ہے۔اپنی نگاہوں میں اپنی عزت ایک الگ چیز ہے اور دوسروں کی نگاہوں میں آپ کے لیے عزت اس سے بالکل مختلف اور علیحدہ چیز ہے۔خودآگاہ استاد دونوں کے بنیادی فرق اور ضرورتوں سے بھی آگاہ ہوتا ہے اور انہیں ہمیشہ اپنے طرزِ فکر اور طرزِ عمل میں ملحوظ خاطر رکھتا ہے اور اسی کو تعلیم کرتا ہے۔

یہ اصل میں ایک والد اور استاد ہی ہوتا ہے جو اپنے بچوں کو اچھی صحت سیر، کھیل کود، نصابی و ہم نصابی سرگرمیوں کے فوائد اور فضائل کو بیان کرتا ہے۔اپنی مثال دیتا ہے۔آنے والے برسوں میں

بچے اسی تعلیم و تفہیم کو اپنی زندگی کا حصہ بناتے ہیں۔

جو استاد سکول اور قصبے میں ہونیوالی مثبت اور صحت مند سرگرمیوں کروانا تو دور کی بات، ان میں ریک بھی نہیں ہوتا، لائبریری جانے کا شوق نہ اخبار پڑھنے کی رغبت، تو سکھائے گا کیا اور بتائے گا کیا۔ جس استاد کی اپنی صحت خراب ہوگی وہ صحت کی خوبصورتی پر لیکچر نہیں دے سکتا۔ جو سیر کا عادی ہو وہ سیر کی خوبیاں کہاں بتائے گا۔ جو کتابیں پڑھنے کی خوشی اور لذت سے محروم ہوگا وہ چار حرف لکھنے کی صلاحیت سے بھی بہرہ مند نہیں ہوسکتا۔ جو اللہ کی محبت سے محروم ہوگا وہ اس موضوع پر بات ں کیونکر کر پائے گا۔ وہ کسی بچے کو اللہ کی محبت سے کیسے جوڑ پائے گا۔ جو خود آنحضور ﷺ کی محبت سے سرشار نہیں درود پڑھنے اور آنحضور ﷺ کی پیروی کرنے پر کیسے بچوں کو بتائے گا۔ آذان کے قت ٹانگیں پھیلا کر بیٹھنے والا استاد کسی بچے کو نماز نہ پڑھنے پر ڈانٹ کیسے سکے گا؟ سمجھا کیسے سکے گا۔ قرآن سے استاد کا تعلق اپنا محبت بھرا نہیں ہوتا تو بچے کا کیسے ہوگا؟ خالق کی کتاب سے دوری قاری کے سبق سے عمر بھر ختم نہیں ہوتی ہاں استاد کی تعلیم سے ہو جاتی ہے

☆ ☆ ☆

4

باب چہارم

ہم اپنا فائدہ
کیوں نہیں کر سکتے!--
احتسابِ نفس /
احتسابِ ذات

مغربی دنیا میں ایک دانشور گزرے ہیں سینیکا نام کے۔ ان کا کہنا تھا کہ دوسرے لوگوں کی غلطیاں اور گناہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں۔ البتہ ہمارے اپنے ہماری اپنی پشت کے پیچھے چھپے ہوتے ہیں۔ بے شک یہ بات سولہ آنے سچ ہے مگر پھر بھی ہمارے دل اسے پوری طرح ماننے سے انکاری رہتے ہیں۔ بچپن سے اپنے والد محترم سے ایک بات سنی تھی۔

''عقل مند وہ ہوتا ہے جو اپنی غلطیاں اور کمزوریاں خود جان لیتا ہے۔ ورنہ لوگ یہ کام کرتے ہیں۔''

گزشتہ تین دہائیوں سے میرا ذاتی اور شعوری مشاہدہ تو یہ ہے کہ ہم بھی دوسروں کے احتساب میں مکمل طور پر خود کفیل ہیں۔ یوں کسی دوسرے کو اپنا احتساب کرنے کی نہ حاجت رہتی ہے نہ ضرورت، دوسروں کا احتساب کرنے میں نہ صرف لذت اور مزہ ہے بلکہ ایک معصوم اور بے نام سے تکبر کی انسانی ضرورت بھی خوب پوری ہوتی ہے۔ پھر انسان اپنے احتساب سے بھی بچ نکلتا ہے۔

کیا طلبہ، والدین، رشتہ دار، محلے دار، اہل مدرسہ و مسجد، سیاسی راہنما اور کیا سماجی راہنما، کون ہے جو اس بہتی گنگا میں ہاتھ نہیں دھوتا۔ بعض تو بیچارے اس گنگا کے اندر ہی بیٹھے ہر وقت دوسروں پر چھینٹے اڑاتے رہتے ہیں۔

اسلامی تہذیب ہو یا مغربی دنیا، ہر جگہ اہل علم نے سیلف ایگزامینیشن یعنی احتساب ذات کی طرف بار بار توجہ دلائی ہے۔ یہ الگ بات ہے ہمارا دھیان ہی ادھر نہیں جاتا۔ ہم دوسروں کے احتساب پر ہر لمحے تیار بلکہ ادھار کھائے بیٹھے ہوتے ہیں۔

ادھر شیکسپیئر کو لیجئے۔ اہل مغرب اسے علم و ادب کے سب سے اونچے تخت پہ بٹھاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے۔

''ہم یہ تو جانتے ہیں کہ ہم کیا ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ ہم کیا ہو سکتے ہیں''

اس جملے کو آپ خود احتسابی کے لفظ کی سخت روئی کی بجائے اپنی ذات کے جائزے کی ٹھنڈی روشنی میں دیکھیں تو کیفیت مختلف ہوگی۔ ہم واقعی نہیں جانتے کہ ہم کیا ہو سکتے ہیں۔

خود احتسابی کا ایک پسندیدہ پہلو:

خود احتسابی کا جو مفہوم اور پہلو مجھے پسند ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنا تجزیہ کر سکیں۔ اپنی خواہشات کو جان اور جانچ سکیں اور بہتری کی راہیں تلاش کر سکیں۔ اسلامی تاریخ میں امام جعفر صادق کو بڑا فقیہ اور عالم مانا جاتا ہے۔ ان سے کسی نے اپنے آپ کو جانچنے اور آزمانے کے بارے میں سوال کیا تو ان کا جواب ایک نیا اور بالکل مختلف زاویہ' Dimention' لیے ہوئے تھا۔ کہا

''کبھی جو تمہیں اپنے دل کے اندر چھپی سب خواہشوں اور آرزوؤں کو کسی پلیٹ میں رکھ کر کسی محفل میں بیٹھے لوگوں کے سامنے پیش کرنا پڑے تو اصل میں وہ لمحہ طے کرے گا کہ تم اندر سے کیسے آدمی ہو، ایسی خواہشوں پر شرمندہ ہو یا کچھ اور محسوس کر رہے ہو۔''

آسان اور قابل عمل طریقہ:

خود احتسابی کا اس سے آسان اور قابل عمل طریقہ اور بھلا کیا ہو سکتا ہے۔ چند لمحوں میں پوری شخصیت، اس کے خدوخال، خواب اور جائزے کسی بہتر ترمیم و تبدیلی کے لیے سامنے آ جائیں گے۔ یہ کام اکیلے میں اپنے کمرے میں، دوسروں کو بلائے اور بتلائے بغیر ہو تو زیادہ مفید ہوگا۔ زیادہ بہتر نتائج دے گا مگر اس کے لیے پہلے اپنے آپ کو آمادہ کرنا پڑے گا۔

خود احتسابی کے حوالے سے ایک میرا نقطہ نگاہ بھی ہے کہ انسان اپنی خوبیوں کی ایک لسٹ بنائے۔ وہ خوبیاں جن پر اسے خود اطمینان ہو اور وہ بھی جن کا اس کے آس پاس کے لوگوں، دوستوں، عزیزوں نے اس کے حوالے سے اظہار کیا ہو اور وہ اسکی ایک عمومی شہرت بن گئی ہو، جیسے مشہور شاعر صوفی تبسم کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ نہ صرف شاعر بہت اچھے تھے بلکہ گورنمنٹ کالج لاہور میں بطور استاد بھی ان کی بے حد عزت کی جاتی تھی۔ مگر ایک کمال خوبی اس کے علاوہ تھی جو ان کی دوسری پہچانوں پر بھاری تھی کہ وہ اپنی جان پہچان کے لوگوں کی بیٹیوں کی شادی کے موقع پر پہنچ

جاتے اور کھانے کا سارا انتظام سنبھال لیتے، جتنے بھی لوگ آ جاتے، اب یہ گھر والوں کی فکر نہ ہوتی، اسے صوفی صاحب دیکھتے اور حل نکالتے۔

صوفی تبسم کی اصل شہرت کچھ اور تھی:

مشہور دانشور اور افسانہ نگار جناب اشفاق احمد نے ایک بار اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھے پھیکی چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے ہمیں بتایا کہ جن دنوں وہ گورنمنٹ کالج لاہور کے طالب علم تھے ان کے استاد صوفی تبسم صاحب نے ایک دن اپنے ففتھ ایئر (Fifth year) کے طلبہ سے کہا چلو بھئی فلاں گھر میں بارات آنے والی ہے، جا کر کھانا برتانا ہے۔ بھاٹی دروازے میں بتیاں والی سرکار کے پیچھے ایک گھر تھا، وہاں پہنچے، کچھ دیر بعد نائی دیگیں بھی لے آئے۔ گھر والے خوش اور مطمئن تھے کہ اب صوفی صاحب آ گئے ہیں فکر کی کوئی بات نہیں۔ بارات میں 80 لوگوں کا بتایا گیا تھا۔ جب وہ لوگ اترے تو 160 سے بھی زیادہ تھے۔ صوفی صاحب کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے اور ناک تک آ گئے۔ انہوں نے قریب موجود اشفاق احمد سے کہا۔

''اشفاق ھن کی کریئے'' (اب کیا کریں)

اشفاق احمد نے اپنی طالبعلمانہ سمجھ سے کہا

''دیگوں میں مزید پانی ڈال دیتے ہیں۔ سالن کا ہی مسئلہ ہے وہ بڑھ جائے گا۔ سب کو پورا آ جائے گا''

انہوں نے گھبرا کر ایک چپت لگائی اور بولے۔

''احمق لڑکے! پانی ڈال کر مرنا ہے۔ سالن تو اور بھی جلدی ختم ہو جائے گا۔ اب طریقہ یہ اختیار کریں گے کہ سالن میں گھی کا پورا ''پیپا'' یعنی 16 کلو کا پورا ٹین ڈالیں گے۔ جب سالن گھاڑا ہو جاتا ہے تو کھایا نہیں جاتا۔''

پھر اسی طریقے سے کھانا تیار ہوا۔ لڑکوں نے بھاگ بھاگ کر کھانا سرو (serve) کیا۔ وہ اندر سے ڈر بھی رہے تھے کہ کھانا کہیں کم نہ پڑ جائے آخر عزت کا سوال تھا۔

باراتیوں سے پوچھتے بھی جاتے تھے کہ اور لائیں! اور لائیں، ادھر کھانا ختم ہونے والا تھا جب اچانک باراتیوں میں سے کسی نے آواز لگائی ''بس جی'' پھر باقی ہر طرف سے بھی یہی آوازیں آنے لگیں۔ لوگ ہمیشہ کسی پہلی آواز کے منتظر ہوتے ہیں۔ صوفی صاحب کے ہاتھ میں کپڑا اور کڑچھا تھا، وہ اندر سے خدا جانے کتنے پریشان تھے۔ جونہی یہ آواز آئی وہ تیورا کر زمین پر گرے۔ وہاں ایک بڑا سا لوہے کا کڑھاہا پڑا تھا۔ شکر ہے اس سے ان کا سر نہیں ٹکرایا۔ شاگردوں نے بھاگ کر اٹھایا، لٹایا، ٹانگیں دبائیں، پاؤں کی مالش کی اور وعدہ لیا کہ خدا کے واسطے ایسی ٹینشن کا کام دوبارہ نہیں کرنا۔ انہوں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور کہا:

''میری توبہ! آج تو پریشانی نے مار ہی دیا تھا''

وہاں سے نکلے تو استاد آگے آگے اور شاگرد پیچھے پیچھے چل رہے تھے، کچھ دور گئے تھے کہ ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ اصل میں زندگی میں ہونے والے یہ واقعات اور حادثات ہی کسی انسان کی پہچان کے لیے معیار بنتے ہیں۔ پندرہ بیس قدم چلنے کے بعد ایک گھر سے ایک مائی نکلی۔ اس نے صوفی صاحب کو دیکھا اور دور سے پکاری ''لو غلام مصطفےٰ! میں تینوں لبھدی پھرنی آں، کڑی دی تاریخ رکھ دیتی اے۔ تیرہ بھادوں کی'' (میں تو آپکو تلاش کرتی پھر رہی تھی بیٹی کی شادی کی تاریخ طے ہوگئی ہے۔ بھادوں کی تیرہ تاریخ طے ہوئی ہے) صوفی صاحب جو تھوڑی ہی دیر پہلے توبہ کر کے نکلے تھے۔ کہنے لگے'' کاغذ لاؤ یہ لو پنسل اور لکھو تیرہ سیر گوشت، اک بوری چول (چاول) اسی پہنچ جاواں گے۔''

کبھی صوفی تبسم نے بھی تو اپنی سیلف ایگزامی نیشن کی ہوگی۔ تبھی تو استاد ہوتے ہوئے دوسروں کے لیے بڑے آرام تسلی سے تنور پر روٹیاں لگانے بیٹھ جاتے تھے۔ ایسی خوبیاں جو ذات کا حصہ بن جائیں اور پھر دور و نزدیک پہچان ٹھہریں۔ ذاتی تجربے کے نتیجے میں ان میں اور نکھار آتا ہے۔ ان پر پیار آتا ہے، شرمساری نہیں ہوتی۔

باباجی نور والے کی حیران کرنے والی بات:

لاہور سے تعلق رکھنے والے ممتاز درویش باباجی نور والے کے حوالے سے ایک حیران کن بات

کہی جاتی ہے۔ کسی نے پوچھا ''باباجی! مسلمان کون ہوتا ہے'' بولے ''مسلمان وہ ہوتا ہے جس کا دل صاف اور ہاتھ گندے ہوں''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' سوال کرنے والے نے حیرت سے انہیں دیکھا'' بولے

''جو بھائیوں کے کام کرتا رہے گا اس کے ہاتھ تو گندے ہوں گے اور جو آرام سے بیٹھا رہے گا دستانے پہن کر، اس کا کیا خراب ہونا ہے۔ مسلمان تو وہ ہے جو مشکل اور کام کے وقت دوسروں کا گارا بھی لگائے گا، اینٹ بھی اٹھائے گا۔ لکڑیاں لا کر دیتی ہیں تو وہ بھی لا کر دے گا۔ آنسو پونچھنے پڑیں تو وہ بھی پونچھے گا۔ ایسا ہوتا ہے مسلمان! ہاتھ گندے کیوں نہیں ہوں گے اس کے۔''

لطف کی بات یہ ہے کہ اس سونے جیسی بات کو سمجھنے کی بجائے ہم نے واقعی ہاتھ گندے کر کے ثابت کرنا شروع کر دیا کہ ہم بھی مسلمان ہیں۔

خوداحتسابی کیسے فائدہ پہنچاتی ہے:

(1) خوداحتسابی کا سب سے پہلا اور بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہم اپنی حقیقی تصویر دیکھنے اور بنانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

(2) دوسرا یہ کہ اصل سچ ہم پہ واضح اور صاف ہو کر منکشف ہو جاتا ہے۔

(3) تیسرا یہ کہ اپنے تجزیے کے بعد ہم اس نتیجہ پر آسانی سے پہنچ جاتے ہیں کہ کون سی خوبیاں اور کس کس کام کے لیے ہمیں فوری درکار ہیں۔ یوں صورتحال کو دیکھنے، محسوس کرنے اور پھر اسے تصوراتی دنیا سے عملی نقشے پر اتارنے میں بے حد سہولت ہوتی ہے۔ یعنی جیسے انگریزی میں کہا جائے گا:

It would help to visulise, realise & actulise those strengths & traits which are required.

(4) چوتھا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسانوں کو عام طور پر یہ الزام دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی کمزوریوں کو جاننے میں زیادہ اچھے نہیں ہوتے۔ مگر خوداحتسابی کے عمل سے وابستہ رہنے سے یہ کمزوری دور

ہو جاتی ہے۔ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بیتے ماہ و سال کا جائزہ کتنی ہی خامیوں اور کوتاہیوں کو سامنے لا کر بٹھا دیتا ہے۔ جن کی وجہ سے سرخروئی سے محرومی رہتی ہے۔

اپنی سونے جیسی خوبیوں سے بے خبر لوگ:

ہم نے کئی بار مشاہدہ کیا ہے کہ کتنے ہی انسان ہوتے ہیں کہ جن کی سونے جیسی سوچ ہوتی ہے مگر وہ اپنی اس خوبی سے بے خبر ہوتے ہیں۔ اور اس کے مقابلے میں ہمیں ایسے لوگ زیادہ کثرت سے ملتے ہیں جو بے معنی لفظوں کو ہیرے بنا کر پیش کر دینے کے ماہر ہوتے ہیں مگر ان کے اپنے گھر ، در اور دل سب خالی ہوتے ہیں۔ اسی لیے فرمایا گیا ''ایسا نہ ہو کہ خود بینی تجھے دوسروں کے عیوب پر نظر کرنے والا بنا دے۔ جس عیب میں خود مبتلا ہو اس کے بارے میں دوسروں پر غصہ نہ کرنا''

(طبرانی، جامع صغیر)

ایک حقیقی شخصی خود احتسابی اور اپنی ذات کے مثبت و منفی پہلوؤں کا بے تعصب تفصیلی جائزہ اس کمزوری پر قابو پانے میں یقیناً معاونت کر سکتا ہے، زندگی اور سوچ بدل سکتا ہے، ہاں راتوں رات تبدیلی کا امکان کبھی بھی نہیں ہوتا۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ جب کسی کو مشکل میں دیکھو تو فرشتہ بن جاؤ اور اس کی مدد کو لپکو، تفتیش کرنے اور الزام دھرنے مت بیٹھ جانا کیونکہ کسی کو مشکل میں دیکھ کر عام طور پر انسانی نفس کو ایک کمینی (Mean) سی خوشی ملتی ہے جو نہ صرف سارے اجر کو ضائع کر دیتی ہے بلکہ زندگی میں بھی خود غرضی کو غالب آنے کا موقع دیتی ہے۔ احتساب نفس کی بالکل درست راہنمائی کے لیے احتساب نفس کے دو مزید حصے ہیں جو اس کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔

تصور احتساب کے دو حصے

خود ساختہ تصور	حقیقی آئینہ / حقیقتِ نفس
اپنا بنایا ہوا جعلی امیج عکس	اصل وجود، اصل خوبیاں
اپنی ہی باتوں پر اصرار	دوسروں کو سمجھنے کی خوبی
اندر موجود کمزوریاں	اندر کی مضبوطی

خامیوں کی چھپانے کی عادت	اپنا جائزہ لینے کی خوبی
اصل جانتے ہوئے بھی نہ ماننے کی عادت	اپنا اصل جاننے کی آگاہی

جعلی عکس کے ذیل میں آنے والی سب روٹس (Sub roots) وہ رکاوٹیں ہیں جو سیلف ایگزیمینیشن کو مکمل ہونے نہیں دیتیں۔ اپنا بنایا ہوا جعلی عکس، ہر بار دھوکا دیتا ہے۔ دماغ میں محفوظ کیا گیا یہ امیج اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ اصلی جیسا لگتا ہے۔ اپنی ہی باتوں پر اصرار، دوسروں کی حقیقت بیانی سے انکار، خامیوں کو نہ ماننے کی راہ دکھاتی ہے۔ یوں انسان اصل جانتے ہوئے بھی نہ ماننے کی اداکاری کرتے کرتے اسے ہی حقیقت سمجھ بیٹھتا ہے۔ اس کی سچائی کی جھوٹی قسمیں کھانے لگتا ہے اور دل سے سمجھتا ہے کہ وہ سچا ہے۔

اپنی غلطی نہ ماننے والے لوگ:

آپ نے زندگی میں بار بار ایسے لوگ دیکھے ہوں گے جو اپنی غلطی مان کر نہیں دیتے۔ ان کے پاس ہر غلطی کا جواز اور جواب ہوتا ہے اور سارا الزام بڑی آسانی کے ساتھ دوسروں پر دھر کر ان کے ذمے لگا کر بے نیازی سے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

دورانِ تعلیم اگر ناکامی کی وجہ استاد نہیں طالب علم ہے تو پھر کامیابی کی وجہ بھی تو استاد کی بجائے طالب علم کو ہونا چاہیے۔

اگر ہر خرابی کی جڑ حکومت ہے تو اس کی طرف سے ملنے والی عزت، سہولت، نوکری بھی تو اتنی ہی خراب ہونی چاہیے۔ کام نہ کرنے والوں کے پاس اپنی ناکامی کو چھپانے اور جعلی عکس ڈالنے کی بظاہر بڑی مہارت ہوتی ہے۔ مگر سچ یہ ہے کہ اپنی غلطی کو صرف وہ نہیں مان رہے ہوتے باقی ساری دنیا جانتی اور مانتی ہے۔ سیاسی اور دینی مزاج کے حامل کارکن اور راہنما بھی یہ سہولت بڑے آرام سے استعمال کر کے ہر ناکامی لوگوں پر ڈال دیتے ہیں اور خود بطخ کی طرح ناکامی کے گہرے پانیوں سے یوں پر جھاڑتے ہوئے ساحل پر آجاتے ہیں کہ کسی پر پڑنا ناکامی کے پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں ہوتا۔

کچھ لوگوں کو احتساب نفس کا فائدہ کیوں نہیں ہوتا:

بچوں اور بڑوں کی تعلیمی اور کیریئر کونسلنگ کرتے ہوئے میں نے بار بار محسوس کیا کہ

''آپ کسی کو خود احتسابی پہ آمادگی کے لیے مدد دینے میں کامیاب ہو جاتے ہیں مگر اس کا رتی بھر فائدہ اس لیے نہیں ہوتا کہ وہ آدمی خود اپنی مدد کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس طرح آپ سیڑھیاں چڑھنے کے لیے کسی ایسے آدمی کی مدد کر ہی نہیں سکتے جو خود اپنے آپ کو سیڑھیاں چڑھنے پر آمادہ نہیں پاتا۔'' افسوس والی بات یہ ہے کہ ایسے لوگوں سے واسطہ بار بار پڑتا ہے۔

خود احتسابی۔ زندگی کے مقاصد کے حصول میں کیسے معاون بنتی ہے:

خود احتسابی ہمیشہ سے ان لوگوں کی مدد کرتی ہے جو اپنی کمزوریوں کا جائزہ لے کر ایک عملی طریق کار طے کرتے ہیں۔ جن کے سامنے ان کی زندگی کے مقاصد، اہداف اور ٹارگٹس واضح نہ ہوں خود احتسابی ان کے کسی کام نہیں آتی۔ اور جو اس کو ایک عزم اور پختہ ارادے کے ساتھ حاصل کرنے کی جستجو کرتے ہیں۔ خدائے رحمٰن ان کے لیے بے حد آسانی کر دیتا ہے۔

وزیر جب اپنی بے عزتی کا سوچ کر رو پڑے:

2006ء میں آزاد کشمیر میں سکولز کی سب سے بڑی چین (Chain) ریڈ فاؤنڈیشن کے 300 بچوں کی لیڈرشپ ٹریننگ کے ایک سالہ پروگرام YLDP پر کام کر رہا تھا تو سال بھر کام کرنے کے بعد ہم نے 100 بہترین بچوں کا انتخاب کیا اور انہیں ایک روز کے لیے مظفر آباد لائے۔ وہاں انہیں پارلیمنٹ ہاؤس لے کر گئے۔ پریذیڈنٹ ہاؤس کی سیر کے علاوہ انہیں آئی جی پولیس سے ملوایا' ریڈیو کے لائیو پروگرام میں بھی شریک کروایا۔ آزاد کشمیر کے چیف جسٹس (تب جسٹس ریاض اختر چوہدری) سے ملے۔ آخری ملاقات وزیر تعلیم قمر صاحب سے طے تھی وہ راولاکوٹ سے تھے اور ان کے ساتھ ملاقات بے حد دلچسپ رہی۔

انہوں نے خود احتسابی کے حوالے سے ایک یادگار واقعہ سنایا جس نے اس کی زندگی کا نقشہ ہی بدل ڈالا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ '' کالج میں تقریری مقابلہ تھا۔ تقریر کرتے ہوئے میں تقریر بھول گیا

وہاں ہوٹنگ شروع ہوگئی کوئی اور ہوتا تو اس بے عزتی کو بھول جاتا، میں نے اس بات کو دل پہ لے لیا اور سوچا کہ کسی کا کیا قصور، غلطی میری اپنی ہے۔ میری تیاری اچھی ہوتی۔ میرے اندر زیادہ اعتماد ہوتا۔ تو کسی کی کیا مجال تھی کہ میرا مذاق اڑاتا۔ اور میرے بولنے پر تالیاں بجاتا۔''

انہوں نے بتایا کہ میں نے گھر جانے سے انکار کردیا اور کالج سے نکل کر ایک پہاڑ پر چلا گیا۔ وہ چیخ چیخ کر تقریر کرنے لگا۔ اس دوران بے عزتی کا سوچ سوچ کر رو بھی پڑا مگر وہیں طے کیا کہ میری زندگی میں شرمندگی کا ایسا لمحہ پھر کبھی نہیں آئے گا۔ پھر یوں ہوا کہ انہی پہاڑوں میں نہ صرف اردو بلکہ انگریزی میں تقریر کرنے میں مہارت حاصل کرنے کے بعد بھی سیکھنا بند نہیں کیا۔ بہتر سے بہترین کا سفر جاری رکھا۔ یہاں تک ایک وقت آیا کہ یہ تقریریں ہی میری پہچان بن گئیں اور پہلے طلبہ نے پھر عوام نے مجھے اپنا نمائندہ چن لیا اور میں اسمبلی کا حصہ بنا، وزارت تعلیم کی ذمہ داری مجھے دی گئی۔''

خود احتسابی، ایک خوابیدہ قوت:

خود احتسابی اصل میں تو انسان کے اندر پائی جانے والی وہ خوابیدہ قوت ہے جو اس کی خود داری اور خودی کی پرورش کرتی ہے۔ اسے خود شناس اور خود بیں بناتی ہے۔ جس طرح کسی عمارت کی تعمیر سے پہلے زمین کی تیاری، برابری اور کھدائی کا کام ضروری ہوتا ہے۔ اسی طرح خود احتسابی سے کسی انسانی شخصیت کی تعمیر ممکن ہوتی ہے۔ اسی لیے خود آگاہی کے پودے کو انسانی شخصیت کی تعمیر اور بنیاد سمجھا اور مانا جاتا ہے۔ یہ خود شناسی کی مضبوط جڑ کہلاتی ہے۔

خود احتسابی۔ ایک آسان راستہ یہ بھی ہے:

خود احتسابی کا ایک نہایت کارگر اور آسان راستہ ڈھونڈنے کیلئے ایک تربیتی ورکشاپ میں یہ تجویز کیا تھا کہ بطور دعا کہ اگر آپ کو اپنے منہ سے نکلنے والے ہر اچھے جملے پر سو روپے ملیں مگر شرط یہ ہے کہ آپ کی جملے ہر سننے والے کو آپ کی دعوت، فکر اور سوچ سے ہم آہنگ کر دیں آپ شام کو گن سکو کہ آج کا دن کامیاب رہا اور اتنے نئے لوگوں کو موثر انداز میں خیر کی دعوت دی، اسلامی فکر سے

روشناس کروایا۔ انسانی تاریخ سے اچھی باتیں، اچھے واقعات کو اپنی دعوت کے دلائل کے طور پر استعمال کیا۔ تو بہت جلد آپ امیر ہو جائیں گے، اور اگر اسی کلیے میں یہ اضافہ بھی کر دیا جائے کہ ہر بُرے اور غیر متعلقہ جملے اور لفظ کی ادائیگی پر جو سیاسی حالات، شخصیات، اخباری خبر، کالم یا ٹی وی ٹاک/شو کے حوالے سے معلومات کے نام پر اپنا اور دوسرے کا وقت ضائع کرنے کا باعث بنا ہو، اپنا اور دوسرے کا دل خراب کرنے کی وجہ ٹھہرا ہو سخت، بے فائدہ اور دل آزاری کرنے والی باتوں سے دل جیتے نہیں جاتے۔ دعوت پھیلتی نہیں بلکہ سمٹ جاتی ہے۔ پانچ روپے واپس لے لیے جائیں تو ایک محتاط اندازہ یہی ہے کہ اکثریت کا معاملہ بہت جلد قلاش ہونے والا ہوگا۔ یہ کلیہ چند دنوں کے لیے اپنے آپ پر لگا کر ضرور دیکھ لینا چاہیے، اچھے نتائج آئیں تو دعاؤں میں مجھے یاد کر لیجیے۔ نتائج اچھے نہ آئیں تو ہمت ہارے بغیر پھر ایک ہفتے کے لیے کمر ہمت کس لیں۔

زبان کو ایک سرکش گھوڑے سے تشبیہ دینا نامناسب نہیں ہوگا۔ بچپن سے ہی ایک خود شناس بچے کو اسے احتیاط سے استعمال کرنے کی تربیت بے حد ضروری ہے کیونکہ گھوڑا جب اچانک سرپٹ بھاگتا ہے تو بہت بری طرح منہ کے بل گراتا ہے۔

زبان کو ایک تیز دھار آلہ بھی کہا جاتا ہے، جو سرجن کے پاس ہو تو آپریشن کرنے والا نازک اور قیمتی نشتر ہے اور اناڑی اور خود احتسابی کے پورے عمل سے بے خبر انسان کے پاس ہو تو خنجر سے کم نہیں ثابت ہوتا۔ اسے یہاں وہاں اپنوں کے دلوں کے ہی کشتوں کے پشتے لگانے میں دیر نہیں لگتی۔ شاید اسی لیے برطانیہ کے سیاسی راہنما اور ادیب چرچل نے کیا خوب کہا تھا نازیبا الفاظ نگل لینے سے آج تک کسی کا معدہ خراب نہیں ہوا۔''

سقراط کی کہی خوبصورت بات:

اس کے ساتھ ساتھ ایک انتہائی خوب صورت بات جو مشہور فلاسفر سقراط نے کہی تھی وہ جاننے سے خود آگاہ زندگی کی اس دوسری اہم بنیاد کی نہایت عمدہ تصویر سامنے آتی ہے۔ اس نے کہا

"The unexamined life is not worth living"

یعنی جس زندگی کا جائزہ نہ لیا جائے احتساب نفس نہ کیا جائے وہ اس قابل ہی نہیں ہے کہ اسے گزارا بھی جائے۔

اپنے آپ کو پہچاننا بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی زندگی اور اس کی حقیقت کو پالے۔ خود آگاہی دنیا اور آخرت دونوں میں کامیابی کے اعلیٰ تصورات کے ساتھ ہم آہنگی کا سبب بنتی ہے۔ انسان زندگی بھر اور زندگی کے بعد بھی کسی ناکامی کے لیے تو سرگرداں نہیں ہوتا۔ اس کی کوئی چھوٹی سے چھوٹی آرزو بھی ناکامی کے حصول کے لیے نہیں ہوتی۔ اسی لیے خود آگاہی خدائے رحمٰن کی دی گئی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے۔ یہ تیرنے کی وہ خوبی ہے جو آپ کو زندگی کے دریا میں کبھی ڈوبنے نہیں دیتی۔ ہمیشہ گہرے پانیوں سے پہلے ہی خبردار کر دیتی ہے اور اس کے مطابق ڈھالتی ہی نہیں ہے عملاً تیار بھی کر دیتی ہے۔

مجھے اس پر ضرور حیرت ہوتی:

ستمبر 2014ء کی ایک صبح ہائی پوٹینشل آئیڈیاز کے آفس آتے ہوئے میری اہلیہ نے ایک لفافہ میرے حوالے کیا۔ میں نے دفتر آتے ہی اسے کھولا اور پڑھا وہ اسکی وصیت تھی۔ اپنے بچوں کے نام اپنے تمام اثاثوں کی اس نے تقسیم کر دی تھی اور مجھے گواہ بنا کر قانونی وارث بنا دیا تھا۔ ساتھ کچھ نصیحتیں تھیں کہ بچے باہم کیسے برتاؤ کریں۔

مجھے اس پر ضرور حیرت ہوتی اگر تاریخ کے مطالعہ اور اہل علم وفہم کی تحریروں اور ان کے معمولات سے آگاہ نہ ہوتا۔ ہماری علمی تاریخ میں تو ہر اہم استاد اور عالم نے اپنی اولاد کو تحریری وصیت کی ہے۔ یہ وصیت مال و دولت سے زیادہ ان کے اخلاق و کردار کی بہتری اور دنیا و آخرت میں کامیابی کے لیے باپ کی آرزوں کا خوب احاطہ کرتی ہیں۔ ہماری حالیہ تاریخ میں ایک بہت خوبصورت وصیت ہمارے ہی عہد کے ایک فاضل انجینئر مصنف اور دانشور جناب خرم مراد کی سامنے آئی ہے۔ اللہ نے انہیں اولاد بھی بہت اطاعت گزار عطا کی، وہ دل کے عارضے میں مبتلا تھے جب تیسرے آپریشن کے لیے برطانیہ گئے تھے جہاں یہ ان کی زندگی کا آخری آپریشن ثابت ہوا اور

وصیت آخری تحریر، یہ بڑی خاصے کی چیز ہے۔ ادارہ منشورات نے اسے شائع کیا ہے۔

تاریخ کے صفحات سے لسان الدین بن خطیب کا ایک خط ملتا ہے۔ جسے" الوصایا الخالدہ کے مصنف عبدالبدیع باقر نے اپنی کتاب کا حصہ بنایا تھا۔ انہوں نے ایک دلچسپ واقعہ درج کیا ہے کہ ایک رات وہ اپنے والد محترم شیخ علی بن عبداللہ الثانی کی خدمت میں عباسی خاندان کی تاریخ پڑھ کر سنا رہے تھے۔ جب وہ اس مشہور وصیت پر پہنچے جو طاہر حسین نے اپنی اولاد کو کی تھی۔ یہ وہی پر اثر اور مشہور نصیحت ہے جسے مامون الرشید نے اپنی اولاد کو تعلیم کیا تھا۔ شیخ عبدالبدیع نے اس موقع پر اپنے بیٹے سے کہا۔" کتنا اچھا ہو کہ تم اس قدر اہم وصیت کو افادہ عام کے لیے چھپواؤ"۔ بیٹے نے نہ صرف اس وصیت کو رسالے کی شکل دی بلکہ اور بھی بلند پایہ نصیحتوں کو جمع کیا اور ایک انتہائی عمدہ اور جامع کتاب ترتیب دے ڈالی۔

خود آگاہ اور خود بین عظیم لوگوں کی دنیا:

یہ وہ سارے خود آگاہ اور خود بین عظیم لوگ تھے جن کے ناموں سے بھی ہم واقف ہیں اور خدمات سے بھی۔ ایسی تمام تحریریں لکھنے والے کے ذہنی رجحان ہی کی نہیں اس کے اعتقادات، عقائد، اقدار اور اہداف کا بھی احاطہ کرتی ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے کلام کو ہی لیجئے تو وہ ایک ایسے بلند پایہ خلیفہ ہوتے ہوئے اپنے رسول سے محبت کے اس اعلیٰ ترین درجے پر فائز تھے کہ جہاں ان کی اطاعت ہی ترجیح اول تھی۔ ان کے کلام وصیت میں مستقل نوعیت کی واضح ہدایات ہیں۔ حضرت عمرؓ کے کلام میں خدا کا خوف، تقویٰ، پاکیزگی، بے نیازی اور امت کی بہتری کے انتظامات کی ایسی شاندار اور واضح سوچ سامنے آتی ہے جو کسی لمحے بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتی تھی۔ حضرت عثمانؓ کے فرمودات میں اپنے عہد کے فتنوں اور اخلاقیات کی کمزوری پر افسوس اور دکھ موجود ہے اور اس سے نکلنے کی راہیں تلاش کرنے کی کوشش اور سوچ سامنے آتی ہے۔ حضرت علیؓ کے کلام میں اعتماد، فہم و تدبر پر مبنی اور لالچ و طمع کے خلاف اور اچھے اخلاق کی قدر و اہمیت پر کلام ملتا ہے۔

ہر دور کے اہل علم کی نصیحتوں سے ان کی سوچ اور خود شناسی روز روشن کی طرح واضح ہوتی ہے۔

عظیم شخصیات جو گمنامی کے گھاٹ اتر گئیں:

بہت سے ایسے علماء اور اساتذہ کو آج ہم جانتے بھی نہیں جنہوں نے اپنے علم کو مجسم نہیں کیا۔ اپنے بچوں اور شاگردوں کے لیے اسے تدوین کرنے میں ناکام رہے یا اس طرف توجہ نہیں دی۔ وقت اور تاریخ نے ان کو بھلا دیا اور اپنے اپنے عہد کی بلند مرتبہ اور عظیم شخصیات موت کے بعد گمنامی کے گھاٹ اتر گئیں کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی کے حاصل خیالات کو اپنی اولاد اور اپنے طلبہ کو یوں لکھ کر نہیں دیا۔

اللہ کے رسول کا فرمان، احتساب نفس کی پوری کتاب:

ہم بحیثیت مجموعی غور کرنے کے کبھی عادی نہیں رہے ورنہ ہمارے امام حضرت محمد ﷺ سے زیادہ خود آگاہ اور خود شناس کون ہوگا۔ ان کے صحابی حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے ایک بار ان سے نصیحت کی گزارش کی۔ فرمایا اپنے عیبوں اور گناہوں پر نظر رکھو تاکہ دوسروں کی عیب جوئی سے بچے رہو اس ایک جملے میں احتسابِ نفس کی پوری کتاب کا مضمون موجود ہے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر مزید نصیحت چاہی۔ جواب میں فرمایا میں تمہیں اللہ سے ڈرنے کی (خشیت الٰہی کی) نصیحت کرتا ہوں۔ اس خوبی کے اختیار کرنے سے تمہارے ہر کام میں زینت اور خوش نمائی پیدا ہو جائے گی۔"

حضرت ابوذرؓ مزید نصیحت کے لیے درخواست گزار ہوئے تو آنحضور ﷺ نے فرمایا

"قرآن پاک کی تلاوت اور اللہ عزوجل کا ذکر اپنے اوپر لازم کرلو، ایسا کرنے سے آسمانوں میں تمہارا ذکر کیا جائے گا اور زمین میں یہ عمل تمہارے لیے نور اور روشنی کا باعث ہوگا۔"

ایک لمحے کو تصور کیجئے جس آدمی کے تصور نفس کی بنیاد اس حقیقت افروز راہنمائی پر رکھی گئی ہو، اس کی ذات کیسی عمدگی سے پروان چڑھے گی اور اس کی شاخوں پر کیسے کیسے عمدہ پھول کھلیں گے

☆——☆——☆

5

بے عزتی سے بہت
فرق پڑتا ہے جناب!---
عزتِ نفس /
تکریم ذات

"عزت نفس ایک سادہ مگر خوب صورت ترکیب ہے۔ بظاہر یہ دولفظوں عزت اور نفس (یعنی انسانی ذات کی عزت وتکریم) سے تشکیل پانے والی ایک ترکیب ہے مگر سچ تو یہ ہے کہ انسانی زندگی کے تمام اعمال کی خوب صورتیوں اور مضبوطیوں کے پس پردہ کارفرما سب سے مضبوط قوتِ محرکہ ہے۔ خودشناسی کے درخت کی پانچ بنیادوں میں سے ایک ہے۔

.....وقت پر کام کرنے والوں سے لے کر سب سے عمدگی کے ساتھ کام کرنے والے

..... سب سے پہلے کام مکمل کرنے والے،

.....دوسروں کی توقعات سے بڑھ کر کام کرنے والے،

..... تخلیقی قوتوں کا اچانک اظہار کرنے والے،

..... تنہائی میں بھی اعتبار کو قائم رکھنے والے،

..... اعتماد نہ توڑنے والے،

..... ہر موقع پر قابل بھروسہ ساتھی بننے والے،

.....بہترین اور مخلص دوست، ماتحت اور خیر خواہ آفیسر ثابت ہونے والے،

..... کھیل کے میدان میں اپنی جان لڑا کر کامیابی پانے والے،

..... بے ہمتی کی بجائے ہمت دکھانے اور بہادری کا مظاہرہ کرنے والے،

.....دنیا میں بے وسیلہ اور کمزوروں کی دستگیری کرنے والے،

.....اپنے رشتوں، دوستوں اور اساتذہ کے سامنے سرخروئی پانے والے،

..... اور آخرت میں اللہ اور اس کے رسول کے سامنے شرمندگی سے بچنے کے لیے کردار کو مضبوط بنانے والے کمزوری کے لمحوں سے بچنے والے کس قدر خوش کن بات ہے کہ کبھی چھوٹوں بڑوں کے

اندر ایسے کام کرنے کیلئے سب سے مضبوط، بنیادی جذبہ اور طاقت، عزتِ نفس کو ہی پایا گیا ہے۔

بارہ سالہ بچی کا تصورِ عزت:

2014 کے آخری ہفتے ایک حیران کن واقعہ سے واسطہ پڑا۔ صبح آفس آنے کے لیے میں گاڑی میں بیٹھ چکا تو ہماری میڈ (ملازمہ) نے گیراج کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

''صاحب! رکیے گا بیٹی، آپ کے ساتھ آفس جائے گی''

کچھ ہی لمحوں بعد انشراح بھاگتی ہوئی آئی اور میرے ساتھ والی نشست پر بیٹھ گئی۔ اس نے بتایا کہ کل اس کا 5th کلاس کا پیپر ہے اور وہ سکون سے میرے آفس بیٹھ کر پڑھنے کی خواہش مند ہے۔ میں نے مسکراتے ہوئے اسکی پڑھائی کا پوچھا اور کسی مشکل یا مسئلے کے بارے میں دریافت کیا، اس کا جواب نفی میں تھا۔ آفس آکر میں اپنے کام میں مصروف ہو گیا اور وہ اپنی پڑھائی میں لگ گئی۔ کئی گھنٹے بعد جب ہم دوپہر کو کھانے پہ اکٹھے ہوئے تو اس نے بتایا ''میں نے اپنی کاپی پر 60 صفحات مکمل طور نئے لکھے ہیں۔'' میں نے صفحات اور ان پر کیا ہوا کام دیکھتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا تو اس نے کہا ''اصل میں صبح مما (والدہ) نے میری کاپی پھاڑ دی تھی۔ میں روئی، افسوس بھی ہوا پھر خیال آیا کہ ٹیچر پوچھے گی تو کیا وجہ بتاؤں گی کہ والدہ نے آخر کس بات پر اتنا غصہ کیا اور کاپی پھاڑ دی''۔ میں خاموشی سے اس کی بات سن رہا تھا اور خود بھی وجہ جاننا چاہتا تھا اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''بابا! اب بھلا کلاس ٹیچر اور کلاس فیلوز کے سامنے تو اپنی بے عزتی نہیں کروائی جاسکتی ناں! وہ سنیں گی تو کیا سوچیں گی کہ مما نے مجھے صبح نماز فجر کے لیے اٹھایا تھا اور میں نے منع کر دیا۔ اتنی گہری نیند جو آئی ہوئی تھی کیا کرتی! ایک تو غلطی کی پھر مما خوب ناراض ہوئیں اور میری کتاب کاپی الگ پھٹی۔ اب اوپر سے کلاس میں جا کر اپنی بے عزتی بھی کرواؤں، یہ تو نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے جتنا کام دو ہفتوں میں کیا تھا وہ چند گھنٹوں میں دوبارہ کر لیا ہے''۔ میں حیرت سے اسے دیکھ اور سن رہا تھا ایک گیارہ بارہ سال کی لڑکی بھی اپنی عزتِ نفس کی اہمیت جانتی ہے اور اس میں کمی گوارہ کرنے پر

تیار نہیں۔

انسان کی سب سے بڑی دولت:

مجھے اچھی طرح یاد ہے ہمارے ابو (ہم انہیں پیار سے بابا سائیں کہتے تھے) بتایا کرتے تھے کہ عزتِ نفس انسان کی سب سے بڑی دولت ہے۔ اس کو کبھی داؤ پہ نہیں لگنے دینا۔ جس قدر عزتِ نفس زیادہ ہوگی اسی قدر انسان کامیاب اور کامران زیادہ ہوتا ہے''۔ یہ بات وہ عام طور پر شام کو سیر کرتے ہوئے انگریزی کے ٹینس سکھاتے ہوئے بیچ بیچ میں کرتے۔ ایک بار انہوں نے بتایا تھا'' اچھا انسان وہ ہے جس کے پاس پیسے تھوڑے بھی ہوں مگر وہ کسی دوسرے کے مانگنے سے پہلے، اس کی ضرورت کے حساب سے اس قدر دے کہ اسکی عزت کو خراب ہونے سے، ہاتھ پھیلانے سے بچائے، ایسے انسان کی عزت کی حفاظت خود خدا کرتا ہے۔''

بڑے ہوکر خود اپنے تجربے اور مشاہدے سے یہ جانا کہ کوئی بچہ ہو یا بڑا جس کو اپنی عزتِ نفس کا جتنا زیادہ خیال ہے وہ بڑا ہوکر اتنا ہی باعزت بنتا ہے۔ جو سوچتا ہے کہ بے عزتی ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے، اس کی سوچ اعمال میں اس طرح ڈھلتی ہے کہ وہ بار بار بے عزت ہوتا ہے اور پھر بے عزت ہوکر ہی رہ جاتا ہے۔ کہنے کو تو عزتِ نفس ایک لفظ ہی ہے مگر اس کے اثرات سے انسانی شخصیت کے تمام احاطے، شعبے اور رخ بجا طور پر متاثر ہوتے ہیں عزتِ نفس انسانی رویے، شخصیت، لباس، پہناوے اور تعلیم سب پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہے۔

نگاہوں سے گرنے کا خوف:

انسانی عمر کے ہر حصے میں اہم ثابت ہونے والا عزتِ نفس کا لفظ، بچپن، جوانی اور بڑھاپے میں دوسروں کی نگاہوں میں اپنے لیے عزت بڑھانے سے جڑا ہوا ہے۔ اپنوں اور پرائیوں سے باعزت ہونے کی گواہی پا لینے کو ہمیشہ ایک بڑی کامیابی مانا جاتا ہے۔

سماجیات کے ماہرین تو یہ کہتے ہیں کہ بچپن میں جو والدین اپنے بچوں کو آپ کہہ کر مخاطب کرتے ہیں ان کے اندر اگنے والا عزتِ نفس کا پودا بہت گھنا اور سایہ دار ہوتا ہے۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ

زمین پر گر کر اٹھنا آسان ہے۔ کسی اپنے کی نگاہوں سے گر کر اٹھنا بہت مشکل اور صبر آزما ہوتا ہے۔ یہ جملہ ایک پورے دبستان کی نمائندگی کرتا ہے۔ جہاں دوسروں کی نگاہوں سے ہمیشہ اٹھنے اور عزت پانے کا ہدف سامنے رہتا ہے اور کسی ایسی کمزوری، اور شخصی کمی سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے پر نظر رہتی ہے جو دوسروں کی آنکھوں سے گرنے کا باعث بنے، کئی بار ہم یہ جملہ سنتے ہیں۔ ''نہیں! وہ ایک باعزت آدمی ہے وہ ایسا گھٹیا کام نہیں کر سکتا۔''

''میں سب کچھ کر سکتا ہوں مگر ایسا گھٹیا کام کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا جو مجھے آپ کی نظروں سے گرا دے''۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسکی نگاہ میں عزتِ نفس کی اہمیت کس قدر زیادہ ہے۔

آنحضور ﷺ کے سامنے شرمندگی:

ہر خاندان کے بڑے بزرگ خاص طور پر دادا، دادی یا نانا، نانی جس سے ہمیں واسطہ پڑا ہو، تعلق رہا ہو وہ چھوٹی عمر سے ہی ایک بات ذہن سے راسخ کر دیتے ہیں کہ ایسا کام نہ کرنا جو آخرت میں تمہاری آنحضور ﷺ کے سامنے نظریں نہ اٹھ سکیں۔ آنحضورؐ سے تعلق، محبت دنیا میں سب سے زیادہ ہونا بے شک ہمارے ایمان کا حصہ ہے۔ مگر اس احساس اور یقین کے بنا بھی یہ مکمل نہیں ہوتا کہ قیامت کے پاس روزِ آخرت جب حشر برپا ہوگا اچھے اور سچے اعمال والوں کو ہی حوضِ کوثر پر آنحضور ﷺ کی زیارت نصیب ہوگی۔ ان کے ہاتھوں پانی نصیب ہوگا۔ یہاں تک کہ اللہ کے حضور، کائنات کے خالق اور مالک کی مرضی اور اجازت سے آنحضورؐ شفاعت کی درخواست بھی کر سکیں گے۔ وہاں یہ بھی ہے کہ دنیا میں برے اعمال کرنے والوں کی نگاہیں شرمندگی سے جھکی ہوں گی اور وہ اپنے اللہ کے رحم اور اس کے محبوب رسول ﷺ کی شفاعت سے محروم رہ جائیں گے۔

کمرہ امتحان میں کیا گیا ایک تجربہ:

یونیورسٹی میں پڑھاتے ہوئے ایک نہیں کئی بار میں نے امتحانات کے دنوں میں یہ تجربہ کیا کہ طلبہ وطالبات سے یہ کہا کہ آپ جانتے ہو فائنل پیپرز میں بورڈ کے زیرِ اہتمام ہوں یا یونیورسٹی کے، باہم بات چیت مکمل بند ہوتی ہے۔ آپ اشاروں سے بھی بات نہیں کر سکتے، ایک دوسرے سے پوچھ

بھی نہیں سکتے۔ خلاف ورزی پر سب کے سامنے بے عزتی ہوتی ہے۔ اس "عزت افزائی" کے ساتھ ساتھ پیپر واپس لے لیا جاتا ہے اور معاملہ زیادہ سیریس ہو تو نقل کا کیس بھی بن جاتا ہے۔ اس لیے ایک چھوڑ دو دو نگران کمرہ امتحان میں نگرانی پر متعین ہوتے ہیں مگر میں ایک نیا تجربہ کرنے لگا ہوں۔ اور مجھے سو فیصد یقین ہے کہ آپ جیسے باعزت بچے کبھی میرے یقین کو نہیں توڑیں گے۔ کمرہ امتحان میں کسی نگران کی موجودگی کے بنا آپ اپنا پیپر کرو گے اور اس ساری پابندیوں کو خود سے ملحوظ خاطر رکھو گے جو نگران کے ہونے سے رکھی جاتی ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی، یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی، یونیورسٹی آف لاہور، رفاہ یونیورسٹی اور سپیریر یونیورسٹی میں اپنی کلاسز فائنل امتحان کے دوران میں یہ تجربہ پورے یقین سے کرتا رہا اور الحمدللہ اکا دکا معمولی سے انحراف کے علاوہ کسی جگہ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں نے میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔ وہ میرے اس اعتبار پر پورے اترے جوان کی شخصیت پر اور ان کے باعزت ہونے پر کیا تھا۔

عزت نفس کی کمی (Low self esteem) کا اظہار کیسے ہوتا ہے؟

- جسے اپنی عزت کا پاس نہ ہو اس کے لیے سب کی عزت بے عزتی برابر ہو جاتی ہے۔
- دوسروں کی نگاہوں میں اپنی عزت میں ہوتی کمی کا احساس ہی نہیں ہوتا۔
- جب کوئی دوسروں کے ایمانیات اور عقائد کے احترام سے انکار کرے۔
- دوسروں پر تبصروں سے ان کی بے عزتی کرنے لگے یا انہیں بے وقعت سمجھنے لگے۔
- لوگوں کے مزاج اور شخصیت کے فرق کو مد نظر نہ رکھتے ہوئے اختلافات کا اظہار کرے
- اپنی بات پر اصرار دوسروں کی ہر بات سے انکار سے بھی اسی کیفیت کا اظہار ہے۔

ان میں سے ہر نقطے سے ایک پوری زندگی کی تصویر بنتی ہے۔ عزت نفس کی کمی ایک مکمل سوچ کی نمائندگی کرتی ہے۔ اس کے نتیجے میں تمام اعمال، عقائد، روایات اور معاملات کا نقشہ ہی بدل جاتا ہے۔

کبھی غور کیجئے۔

۔ کسی کے سامنے زمین پر گرنے سے کیوں شرمندگی ہوتی ہے؟۔ کسی کے سامنے ڈانٹ پڑے تو زیادہ برا کیوں لگتا ہے؟۔ اساتذہ اکیلے میں سمجھائیں یا سب کے سامنے کیا ڈانٹ کھانے والے کے جذبات یکساں ہوتے ہیں؟

۔ امتحان میں ناکامی کے بعد بچوں میں خودکشی کی تعداد دن بہ دن کیوں بڑھ رہی ہے؟۔ کسی کی عزت لٹ جائے تو دنیا اندھیر کیوں ہو جاتی ہے؟۔ کسی پہ عزت لوٹنے کا الزام لگ جائے یا بری نگاہ ڈالنے کا الزام لگے تو لوگ شرم سے زمین میں کیوں گڑھ جاتے ہیں؟۔ آپ کا سکول میچ آپ کی وجہ سے ہار جائے تو کیسے احساسات ہوتے ہیں؟

۔ جن سے آپ کو محبت یا عقیدت ہے، ان کی بے عزتی ہونے پر اپنی بے عزتی ہوتی کیوں محسوس ہوتی ہے؟

۔ اخبار میں کسی کے خلاف خبر چھپ جائے تو قیامت کیوں آجاتی ہے؟

۔ کسی کو سب کے سامنے جھوٹا، منافق، دھوکے باز یا بے کردار آدمی کہنے کے بعد کیا صرف تعلقات ہی ختم ہوتے ہیں یا بدمزگی بھی انتہا کو پہنچتی ہے؟

۔ جیل میں بند اکثر سزا یافتہ لوگ اپنی عزت نفس پہ آئے داغ کو دھونے کے لیے جرم کرنے کی اصل وجہ کیا بتاتے ہیں؟

۔ کیا ایک عزت دار آدمی اور ایک بے عزت بے حس آدمی برابر ہو سکتے ہیں؟

غور کیجئے آپ کو اس سوال کا جواب خود مل جائے گا کہ عزت نفس میں کمی کا احساس کہاں کہاں کیا کیا رنگ لاتا ہے؟

ان کی ہر جگہ بے عزتی ہوتی رہی:

چند برس پہلے حکومت نے یونیورسٹیوں میں کریئر ڈویلپمنٹ کا ایک الگ شعبہ بنایا جس میں بعض جگہ ایک اور بعض جگہ دو کیریئر کونسلر یا کیریئر ڈویلپمنٹ آفیسر مقرر کیے گئے۔ ان کی تربیت کا پہلا کورس مسلم ٹاؤن لاہور میں واقع ایک سرکاری ادارے (GRAP) میں منعقد ہوا۔ مجھے اس میں

ماسٹر ٹرینر کے طور پر مدعو کیا گیا۔ اس ٹریننگ کے کچھ عرصہ بعد اس ٹیم نے پنجاب یونیورسٹی میں جینڈر ڈویلپمنٹ کے شعبہ میں ایک سیمینار رکھا، میں مقررہ وقت پر وہاں پہنچا۔ اس روز صابر چوہدری میرے معاون کے طور پر ساتھ گئے تھے۔ وہ ہمارے ادارے کے سٹال کے انعقاد میں مصروف ہو گئے۔ پروگرام شروع ہوا تو شعبہ کے ہیڈ ڈاکٹر طاہر نے استقبالیہ کلمات کے لیے پہلے خطاب کیا۔

شومئی قسمت کہ انہوں نے چھوٹتے ہی اپنی بات کا آغاز اس بات سے کیا کہ زندگی میں عزت بے عزتی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ ان کا کہنا تھا کہ گھر میں میرا بیٹا میری بے عزتی کرتا ہے۔ میں امریکہ میں پڑھنے گیا وہاں بھی جگہ جگہ میری بے عزتی ہوتی رہی مگر میں نے کبھی پرواہ نہیں کی اور آج آپ کے سامنے ہوں۔ ان کی باتوں پر ان کے طلبہ ہنس رہے تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے مگر وہ اپنی دھن میں مست اپنی زندگی کے بے عزتی سے بھرے واقعات مزے لے لے کر سنا رہے تھے۔ اور اس پر اصرار فرما رہے تھے کہ نوکری کے دوران جتنی مرضی بے عزتی ہو۔ اس پر کبھی عزت بے عزتی کا جھگڑا نہیں کرنا۔ اس کا کوئی فیدا (فائدہ) نہیں۔ وہ بے عزتی کو بھی مسلسل (دستی) کہتے رہے۔ اور ان اعلیٰ درجے کے خیالات کے اظہار کے بعد منتظر رہے کہ لوگ تعریف کریں اور حق گوئی کی تحسین کریں۔

ان کے بعد لیکچر کے لیے جونہی مجھے بلایا گیا تو سچی بات یہ ہے کہ دکھ اور تکلیف کے باعث میں نے پہلے سے طے شدہ موضوع ایک طرف رکھا اور یونیورسٹی کے مختلف شعبوں سے آئے ہوئے ان طلبہ اور طالبات کے مرجھائے ہوئے چہروں پر نظر ڈالی جو اپنے مایوسی سے بھرے نیم ڈوبے مستقبل کے لیے روشنی لینے، راہنمائی لینے وہاں موجود تھے۔

کتنے ہیں جن کی بے عزتی انہیں بُری نہیں لگتی؟

میں نے ان سے پوچھا آپ میں سے کتنے ہیں جن کے لیے عزت اور بے عزتی برابر اہمیت رکھتے ہیں۔ کتنے ہیں جن کی سب کے سامنے بے عزتی ہو اور پھر بھی ان کو برا نہ لگے۔

پورے سیمینار روم میں ایک بھی طالب علم یا طالبہ ایسی نہیں تھی جس نے اثبات یعنی ہاں میں

جواب دیا ہو مگر وہ اپنے چیئرمین کے احترام میں خاموش تھے۔

میں نے انہیں بتایا غریب سے غریب آدمی بھی اپنے بچے کو سب کچھ بیچ کر کیوں پڑھاتا ہے؟ کیوں وہ اپنے بچے کو بڑا آدمی بنانے کی آرزو کرتا ہے؟ کیوں اچھی نوکریوں کے لیے نوجوان مارے مارے پھرتے ہیں؟ کیونکہ ہر ڈگری عزت سے جڑی ہے۔ کیا نوکری کے بعد ملنے والی عزتِ نفس کسی بے روزگار اور بار بار ٹھکرائے نوجوان جیسی ہو سکتی ہے؟

بے عزتی سے بہت فرق پڑتا ہے جناب:

کیا لوگ رشتہ لیتے، دیتے ہوئے عزت دار گھرانے اور عزتِ نفس رکھنے والے کی تلاش کرتے ہیں یا بدنام، بے عزت اور رسوائی کے پلندے ڈھونڈتے ہیں۔

ہر اس آدمی کو جو پروفیسر صاحب کا ہم خیال ہو، اپنا خیال رکھنے کا حق ہے مگر یہ کہنے کا قطعی نہیں کہ عزتِ نفس اور بے عزتی برابر ہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

فرق پڑتا ہے جناب۔ تھوڑا نہیں، بہت فرق پڑتا ہے۔ فوری اور زندہ ثبوت چاہیے تو نروس بریک ڈاؤن کروا کر پاگل خانے میں رہنے والے نوجوانوں کی بڑھتی تعداد دیکھ لیں۔ جو کسی کے ہاتھوں بے عزت ہونے، کسی کے ہاتھوں مسترد کر دیئے جانے یا مسلسل ناکام ہو جانے کے بعد اپنی عزتِ نفس کے پھولوں کو بکھرتے اور پاؤں تلے آ کر مسلتے دیکھنا نہ سہہ سکے۔

سکولوں میں کتنے بچے ہیں اساتذہ کی مار سے نہیں بار بار کی بے عزتی کے ہاتھوں تنگ آ کر عمر بھر پڑھائی چھوڑنے کے فیصلے کرتے ہیں۔ اور کبھی کبھار اساتذہ کی عزت پر ہی سر بازار دھول ڈال بیٹھتے ہیں۔

اندھی زندگی گزارنے کا فیصلہ کیوں ہوتا ہے؟

اپنے گھروں سے بھاگنے والے لڑکے ہوں یا لڑکیاں، کسی سرکاری دارلامان میں، کسی یتیم خانے میں پناہ لینے والے بچے ہوں، پوچھیے کس بات نے انہیں گھروں سے بھاگنے اور ایک بدترین، خوف زدہ کرنے والی اندھی زندگی گزارنے کے لیے مجبور کیا............ یہ بے عزتی ہی

ہے جو جیتے جاگتے انسانوں کو مار دیتی ہے یا لاشوں سے بدتر بنا دیتی ہے۔

اپنی عزت۔اپنے ہاتھ:

جس طرح اپنی ہمت اور طاقت آپ خود ہوتے ہیں بالکل اسی طرح اگر اندر سے مضبوط ہیں تو کسی کی جرات نہیں ہو سکتی ہے کہ آپ کی عزت کی طرف آنکھ بھی اٹھا کر دیکھ سکے عزت نفس آپ کی ترجیح ہو تو ایک انوکھا حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے اور حوصلہ کیسے جھک سکتا ہے۔عزت سے جینے اور اپنی عزت بچانے کی آرزو کیسے رک سکتی ہے!

منزل مشکل تو کیا دھندلا رستہ ہے تو کیا تنہا یہ دل ہے تو کیا

میں وہ منظر کیسے بھول سکتا ہوں جب سید پور اقبال ٹاؤن سٹاپ پر میری آنکھوں کے سامنے پنجاب یونیورسٹی کی ایک طالبہ نے وین سے اُترتے ہوئے کنڈیکٹر کے جان بوجھ کر چھو لینے پر بلا توقف اسے تھپڑ رسید کیا پھر جوتا اتار کر اسے مارا اس کے بعد وہاں وجود جس جس کو بھی موقع ملا اسے مکوں اور تھپڑوں کی زد پر رکھ لیا۔

اہم سوال بھی یہی ہے اور جواب بھی کیا آپ اپنی عزت نفس کے لیے کھڑے ہو سکتے ہیں۔مسئلہ آپ کا ہے۔اس کا خیال کرنا، لحاظ کرنا اور اس کے لیے کھڑے ہونا آپ پر ہی واجب ہے۔دنیا ڈرنے والوں کو ڈراتی ہے۔عزت نفس والے انسان کو لڑکا ہو یا لڑکی کوئی روٹی کہہ کر کیسے نگل جائے۔

آپ کو اپنی عزت نفس کی کتنی ضرورت ہے:

.....آپ اس لیے اپنا کام ادھورا چھوڑ سکتے ہیں کہ کیا ہے ذرا سی ڈانٹ ہی پڑ جائے گی۔

.....آپ اس لیے جھوٹ بول سکتے ہیں کہ کیا ہے اگر پکڑا گیا تو ذرا سی بے عزتی ہی ہو جائے گی۔

.....آپ کسی مقابلے میں حصہ لینے سے پہلے سوچ لیتے ہو کہ کیا ہے ہار جاؤں گا تو لوگ مذاق ہی اڑائیں گے۔

.....کیا اپنے رب کے ساتھ کیے وعدے اس لیے توڑ سکتے ہیں کہ کل دوزخ کی سزا ابھی ٹل جائے گی۔

انسانی کردار کی کچھ منزلیں:

ایک منزل تو دل میں اتر جانے کی ہے اور دوسری اس کے بالکل برعکس دل سے اتر جانے کی ہے۔ دونوں حقیقت میں اور دونوں ہی انسان کی اپنی مرضی۔ منشا اور پسند پر مبنی ہیں۔ اور دونوں کی بنیاد میں عزت نفس کا احساس پورے وجود کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ کسی ایسے فرد کو اپنے دل میں بس جانے کی اجازت آپ دے سکتے ہو جس کی عزت ہو نہ اسے اپنی عزت نفس کا پاس ہو۔ عزت نفس کی کمی کا شکار لوگوں کو کبھی کسی اصولی بات، معاملے کے لیے بھی آپ کھڑ ہوتا نہیں دیکھیں گے۔ عزتِ نفس کی کمی کے باعث چھوٹے بڑے جتنے بھی کام ہوتے ہیں وہ کبھی نظروں سے گرنے اور دل سے اتر جانے والے ہوتے ہیں۔

☆..........☆..........☆

6

باب ہفتم

خوف کو
ہرانا آسان نہیں---
تصورِ خوف

"یہ ایک بُرا تحفہ ہے جو بڑے عام طور پر اپنے بچوں کو دیتے ہیں۔ 16 سال کی عمر تک اس کے اثرات اس قدر پختہ ہو جاتے ہیں کہ پوری شخصیت ہی بگڑ کر رہ جاتی ہے۔ اس تحفے کا نام خوف ہے۔ اچھے بھلے خوب صورت، معصوم اور صحت مند بچے کو جب چاہے کسی ان دیکھی، اَن چھوئی اور ان جان چیز سے خوف کا تحفہ دے دیجئے۔ پھر آنے والے ہر دن اس خوف کو بڑھتا اور پوری شخصیت کو داغدار کرتا، بزدل بناتا اور خوبیوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے نگلتا دیکھیں۔ تصورِ خوف، خود آگاہی کی وہ چوتھی بنیاد ہے جس سے آگاہی میں کمی ہو تو شخصیت داغدار ہو جاتی ہے۔ اس کی آگاہی کتنے ہی بند راستے کھولنے کا باعث بنتی ہے۔

خودشناسی کا دشمن:

یہ خوف شخصیت کی خودشناسی اور خود آگاہی کی بنیادوں میں ایسا بیٹھتا ہے کہ ہر چیز سے ڈرا کے رکھ دیتا ہے۔ استاد کی شخصیت جیسے دھیرے دھیرے مکمل ہوتی ہے۔ خوف اس کے اندر بڑے بڑے خلا رکھ دیتا ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں خودشناسی کا دشمن یہ خوف کیا کیا گل کھلاتا ہے؟؟

☆......5-6 سال کی عمر کے بچے کے دماغ کی نشوونما میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔

☆......بچہ اکثر اپنی شخصیت کا اعتبار کھو بیٹھتا ہے۔ ......اعتماد کی کمی کا شکار ہو جاتا ہے۔

☆......کسی بھی معاملے میں آگے بڑھ کر کام کرنے اور فیصلہ کرنے سے خوف اسے روک دیتا ہے۔

☆......اپنے جیسے انسانوں پر اعتبار ختم ہو جاتا ہے۔ ......تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے۔

☆......جس فرد نے خوف سے ہم کنار کیا ہوتا ہے، اس کی وجہ سے اس جیسے دوسروں سے بھی خوف آنے لگتا ہے۔ ......حالات اور واقعات، غیر متوقع طور پر ملنے والے صدمات اور حادثات کا باعث بننے لگتے ہیں۔ ...... دوسروں کے رویوں کے منفی اثرات سامنے آنے لگتے ہیں۔ ...... والدین کی

طرف سے کسی وقتی مصلحت اور فائدے کی خاطر استعمال کیا گیا خوف کا یہ ہتھیار بدقسمتی سے عمر بھر ساتھ رہتا ہے اور کمزور شخصیت کا عنوان بنتا ہے۔...... کبھی کبھی تمیز و تہذیب سکھانے کے لیے والدین کا دیا ہوا یہ تحفہ حد سے بڑھ جائے، کسی دوسرے کے سامنے بے عزت کر جائے تو نہ صرف والدین کی باہم بول چال بند کرنے کا باعث بن جائے بلکہ بچے کو ہی ایسا نظر انداز کروا دیتا ہے کہ تو اس خوف سے برسوں جان چھڑوانا مشکل ہو جاتا ہے۔

☆......اندھیرے کا خوف، کتے، بلی کے کھا جانے کا خوف، کسی دیو، بلاء، جن، بھوت اور چڑیل کا خوف بچوں کو واقعی سکون سے سونے نہیں دیتا۔ رات کو پڑھنے اور سوچنے نہیں دیتا۔ اندھیرا بذات خود ایک جن بن جاتا ہے۔ اور خوب ڈراتا ہے۔

KILANI LIBRARY

شخصیت کی روح کھینچنے والا:

کتنے ہی اساتذہ سے مجھے واسطہ پڑا جن کے بچوں کا رات بستر پر پیشاب نکل جاتا ہے۔ کوئی خواب دیکھتے ہوئے، کسی کا سامنا کرتے ہوئے۔ ڈر اور خوف ایسا ظالم احساس ہے جو پوری شخصیت کی روح کھینچ لیتا ہے۔ رات سوتے میں بچے چیخیں مار کر اٹھ بیٹھتے ہیں۔ کسی دوسرے کے گھر جا کر مذاق کا نشانہ بنتے ہیں۔...... کبھی شیر، چیتے یا ریچھ کے چیر پھاڑ کھانے کا خوف ذہن میں ایسا بیٹھتا ہے کہ عمر بھر نہیں جاتا۔

......کسی بدشکل مائی، بوڑھی جادوگرنی، بردہ فروش یعنی بچے بیچنے والا پٹھان۔ کوئی بڑی بڑی مونچھوں والا ڈاکو، کوئی بدمزاج پولیس کا سپاہی۔ بے شک یہ ایسے ایسے ''مفید'' کردار، ثابت ہوتے ہیں جو بچوں کی شخصیت کی مضبوط بنیادوں کو ہی مسمار کر دیتے ہیں۔...... ماہرین کی تحقیق یہ کہتی ہے کہ 18 ماہ کے بچے پر خوف کے اثرات ہونے لگتے ہیں جبکہ 24 ماہ کا بچہ باقاعدہ اظہار خوف کر کے بتانے لگتا ہے۔

یہ خیال سو فیصد غلط ہے:

یہ خیال سو فیصد غلط ہے کہ سارے بچے ہی ڈرتے ہیں۔ یاد رکھیے بچے آگ سے جلتے ہیں تو

ڈرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آگ کا ذرا سا بھی خوف ہوتا تو انگارہ اُٹھا کر منہ میں نہ رکھ لیتے۔

☆...... ہماری مساجد میں بچے نماز کے لیے چلے جائیں تو ہر نیک آدمی خاص طور پر پرانے اساتذہ ان کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ جیسے کوئی شیطان مسجد میں آ گیا ہو۔ اس بیچارے کو ڈانٹ کر، گھور کر، اس زور سے اگلی صفوں سے نکالا جاتا ہے کہ کم ہی کسی مہربان روح کے روکنے پر اسے کسی صف میں کھڑے ہونے کی اجازت، تحفظ اور اطمینان ملتا ہے ورنہ اتنے لوگوں کے سامنے نقد بے عزتی کرواتے اگلی صفیں چھوڑتے پیچھے ہی پیچھے جاتے، لوگوں کے مسکرانے اور بے عزت ہونے کا احساس مستقل خوف بن کر مسجد میں آنے سے ہی روک دیتا ہے۔

کبھی غور کیجیے آنحضور ﷺ کی نماز کے دوران نواسے حسن و حسین رضی اللہ عنہما آ کر ان کی کمر پہ سوار ہو جاتے۔ کندھوں پر بیٹھ جاتے تو وہ سجدہ لمبا کر دیتے۔ کسی حدیث مبارک میں کبھی کوئی ایسا جملہ ملا ہو کہ آپ ﷺ نے بچوں کو ڈرا کر گھر بھجوا دیا ہو یا حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے شکایت کی ہو کہ بچے مسجد نبوی کیوں آتے ہیں یا حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سمجھایا ہو کہ بچوں کو گھر پہ رکھا کریں۔ حتیٰ کہ آنحضورؐ کے غلام کا بچہ اُسامہ بھی آپ کی گود میں اطمینان سے بیٹھ جاتا۔ آنحضور ﷺ کا دس سالہ خدمت گار انس بھی ان کی محبت اور شفقت کی گواہی دیتا ہے۔ حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ غلام تھے اور آنحضور ﷺ کی محبت کے باعث اپنے والدین کے ساتھ نہیں گئے تھے۔ ایک بار ایک صحابی نے حیرت سے سوال کیا تھا یا رسول اللہ ﷺ آپ بچوں کو پیار کرتے ہیں۔ چوم لیتے ہیں۔ میرے تو دس بچے ہیں میں نے تو کبھی پیار کا ایسا اظہار نہیں کیا۔ دل بھی نہیں چاہا۔ آپؐ نے اسے اللہ سے محبت بھرا دل مانگنے کا مشورہ دیا۔

بے خوفی کا فیض پانے والے:

☆...... میں نے دیکھا ہے کہ اکثر گرنے کا خوف ہی گرنے کا باعث بنتا ہے۔ شخصیت کو کمزور بناتا ہے۔ اور ذات پہ اعتبار و اعتماد سے محروم کرتا ہے۔ انسانوں سے ڈرنے والے بچے، بڑے ہو کر دوسروں کا سامنا نہیں کر پاتے۔ لوگوں، افسروں کا خوف کسی خوفناک جن کی طرح گھر، سکول،

مدرسے، مسجد، معاشرے یہاں تک کہ دفتروں میں بھی پیچھا کرتا ہے۔ اپنے ہی افسروں سے چھپتے پھرتے ہیں۔ کسی بڑے آدمی سے ملتے ہوئے جان جاتی ہے۔ میرے ساتھ (1990-2003) سرکاری، غیر سرکاری، اعلیٰ و ادنیٰ ہر قسم کے سکولز کے بچے پھول ٹیم میں کام کرتے تھے۔

ایک بچے کا نام ارشد ورک تھا۔ تب وہ ساتویں کا طالب علم تھا۔ جو کام اسے کہتا وہ بلا خوف پورے یقین سے کہتا ''میں کر کے لاتا ہوں۔'' آپ اندازہ کریں کہ وہ صوبائی اسمبلی کے سپیکر میاں منظور وٹو کے گھر سے جا کر پھول کے لیے پیغام لے آیا۔ کسی پروگرام کے لیے بلانا ہوتا وہ سیدھا ناک کی سیدھ میں جاتا اور وزیر صاحب کو بلا لاتا۔ کئی بار تو چھوٹے چھوٹے سے پروگراموں میں دو دو وزرا، کو لے آیا۔ پھر وہ ریڈیو کے پروگرام میں جانے لگا۔ اسکے ایف اے مکمل کرنے تک میں اسے بچوں کے لیے شائع ہونے والے اخبار پھول اخبار کا ایڈیٹر مقرر کر چکا تھا۔ بعد میں وہ چینل 5 ٹی وی کا نیوز ڈائریکٹر بنا۔ آج وہ ایک ایسا مؤثر شرارتی صحافی ہے جس کے تعلقات اور دوستیاں بے شمار ہیں۔ وہ ڈنمارک جا کر بھی ایک اخبار کا ایڈیٹر رہ چکا ہے۔

1994-95 ، میں میری ٹیم میں ایک بچہ شیخوپورہ سے آتا تھا۔ عظیم شوکت ، صاف ستھرا۔ پر اعتماد۔ تب وہ ساتویں، آٹھویں ہی میں تھا۔ اس کا جوش اور جذبہ اس کے ابو کی شخصیت اور تربیت اور ماں کے اعتماد کے باعث تھا جو اکثر اس کے ہمراہ لاہور آ جاتیں وہ ریڈیو پہ جاتا۔ ٹی وی پہ جاتا۔ حتیٰ کہ پھول شو کا مین کمپیئر بننے لگا مجھے کبھی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا تھا کہ کس سے کمپیئرنگ کروانی ہے۔ ہر ٹیم ممبر کو اتنا ہی حوصلہ اور بے خوف بنا ڈالا تھا۔ آج وہ پاکستان میں پینے والے پانی کا ایک نمایاں کنسلٹنٹ ہے۔ کئی ملکوں کے دورے کر چکا ہے اور ایک بین الاقوامی کمپنی کے واٹر ڈویژن کا ہیڈ ہے۔

☆...... آمنہ اعظم نے کبھی زندگی میں تقریر نہیں کی تھی۔ وہ پھول فورم کی انچارج بنی۔

☆...... ماریہ مجید نویں جماعت میں تھی جب ہماری ٹیم کا حصہ بنی، اسے پڑھنے کا شوق تھا۔ مطالعہ اور ذہانت نے اسے سمجھدار ہی نہیں قابل اعتماد بھی بنا دیا۔ وہ پورے صوبے میں پھول کہانی گھر کی صدر

بنی پھر پورے پاکستان کے 100 سے زائد شہروں میں قائم کہانی گھروں کی صدر بنی۔ اس نے ایم اے کے بعد ایڈورٹائزنگ میں اچھا کام کیا۔

☆......عرفان الحق میں ایک فطری شرمیلا پن تھا۔ بولنے میں تھوڑی دقت تھی۔ وہ پھول کلب کا سیکرٹری اطلاعات اور دفتر کا انچارج بنا۔ آج وہ ہائی کورٹ کا کامیاب وکیل ہے۔ کئی کتابیں لکھ چکا ہے جسے بڑے بڑے وکیل پڑھتے ہیں۔ اس نے اپنی کمزوری کو سمجھ لیا اور اسے اپنی قوت بنالیا۔

☆......عقیلہ اقبال کا تعلق گجرات سے تھا۔ اس میں سچی لگن تھی وہ پھول سوشل سروس کی صدر بنی۔ اس نے بچوں کے لیے بہت خدمات سرانجام دیں۔ تھر سے لے کر کشمیر تک امداد جمع کی اور پھر پوری پوری ٹیم وہاں جا کر امداد تقسیم کر کے آتی۔ آج وہ چلڈرن ہسپتال میں فارماسسٹ ہے۔

☆......سید غضنفر علی اکلوتا بیٹا تھا۔ اور بالکل اکیلا۔ والد نہیں تھے، والدہ بیمار تھی اور خاندان نامہربان۔ اس نے ہر خوف کا مقابلہ کیا۔ ایم بی اے کیا، کالم لکھے۔ الٹے سیدھے شعر کہے اور شاعر بن گیا۔ آج کل ایک بنک میں منیجر ہے۔ وہ اتنا تنہا اور ڈرا ہوا ہوتا تھا کہ پوری دنیا میں صرف ایک آدمی سے بات کرتا تھا وہ بھی اس کی قبر پر جا کر۔ گھنٹوں بیٹھ کر پورے دن کی روداد، لوگوں کا سلوک، ناکامیاں، کامیابیاں سبھی کچھ اپنے ابا کو سناتا جو قبر میں سوئے ہوئے تھے۔ سوچیں آج بھی وہ اسی طرح ڈرا ہوا ہوتا تو زندگی کب کی اسے کچل کر گزر چکی ہوتی۔ البتہ اس کے قریبی عزیز آج بھی اس سے ویسا ہی تکلیف دہ سلوک کرتے ہیں جیسے بچپن میں اُسے سامنا کرنا پڑتا تھا...... اور وہ خاموشی سے سہتا ہے ان کے مقابلے کی ہمت نہیں پاتا۔ اس معاملے میں اس میں بہادری نہیں آ سکی۔

☆...... مزنہ لطیف کی والدہ بہت محبت کرنے والی تھیں۔ اسے خود بھی پڑھنے کا شوق تھا مگر والد صاحب ساتھ نہیں تھے۔ والدہ ٹیچر تھیں۔ زندگی آسان نہیں تھی مگر اپنی تمام ہم عمر لڑکیوں سے زیادہ سمجھدار، سلجھی ہوئی بات سمجھنے والی۔ اچھے اشعار کہنے والی تھی۔ پھول کہانی گھر کی کامیابی میں اس کا بے حد اہم کردار تھا۔ وہ میری ٹیم کا بے حد قیمتی اور عزیز حصہ تھی۔

☆......شاذیہ کا تعلق گوجرانوالہ سے تھا۔ بے حد شرمیلی اور گھبریلی لڑکی تھی اس نے پھول میں پہلی بار لکھنا شروع کیا اور پھر بڑی عمدگی سے اپنی جگہ بناتی چلی گئی۔ آج وہ پی آئی اے میں قانونی شعبے

میں خدمات سرانجام دے رہی ہے۔

☆..... محبت سے کام کرنے والے پھولوں کی ایک ایسی لڑی سامنے ہے کہ لکھتا جاؤں تو ایک کتاب مکمل ہو جائے۔ عبدالصمد مظفر اب تو بے شمار کتابوں کا مصنف ہے کبھی وہ اپنے شرمیلے پن اور والدہ کے آنکھوں میں لگائے گئے سرمے سے پہچانا جاتا تھا آج رابعہ بک ہاؤس میں اپنی ذہانت اور سمجھداری سے ادارے کے مالک کا دایاں بازو ہے۔

☆..... گوجرانوالہ سے قاسم گورایہ جو اپنی معصومیت میں پھول کلب کا آئیڈیا لایا۔ وہ کلب 60 شہروں تک پھیل گئے۔ آج ایک اہم بنک میں منیجر ہے اور اچھا کام اسکی پہچان ہے۔

خواجہ مظہر انور صدیقی ایک مخلص اور سلجھا ہوا نوجوان تھا جو حرم گیٹ میں اپنے دادا کی شوشاپ پر معاونت کرتا تھا۔ اس کی صلاحیتوں نے اسے ملتان اور پھر پورے پنجاب کے پھول کلبوں کا صدر بنایا۔ آج وہ ارتقاء آرگنائزیشن کا سرپرست ہے۔

ان سب نے اپنے آس پاس سے ملے ہر خوف کے تحفے کو واپس کیا اور بے حد مضبوطی اور سمجھداری سے اپنے آپ کو پہچانا۔ اپنی خوبیوں کو جانا۔ اپنی شخصیت کی اس طور تعمیر کی کہ آج بھی دیکھنے سننے والے بھی تعریف کرتے ہیں۔

خوف کو ہرانا آسان نہیں ہے:

خوف کو ہرانا آسان نہیں ہے مگر ناممکن بھی نہیں ہے۔ خوف کو علامتوں سے پہچانا جا سکتا ہے۔ طرز عمل سے جانا جا سکتا ہے۔ خوف ایسا برا تحفہ ہے جو جہاں جہاں سے ملے اسے واپس کر دینا چاہیے۔ بچوں کی شخصیات کے اندر چھپ کر بیٹھے خوف ڈھونڈ نکالنے چاہیئے اور اس کام میں برس ہا برس نہیں لگانے چاہئیں۔ ورنہ یہ بڑا ہو کر ہر شخصیت کے دروازے پر ہی بیٹھ جاتا ہے اور کسی بھی اچھائی، خوبی اور صلاحیت کو اندر آنے سے روک دیتا ہے۔ ڈرا کر بھگا دیتا ہے۔

شہری اور دیہی لوگوں کے الگ الگ خوف:

شہری اور دیہی بچوں کے خوف الگ الگ ہوتے ہیں۔ لڑکے اور لڑکیوں کے خوف جدا جدا

ہوتے ہیں۔ سوتے، جاگتے جذبات، ہیجان کے خوف، ٹوٹے جڑتے، نئے پرانے رشتوں کے خوف اسکول کے اساتذہ کی ڈانٹ ڈپٹ کا خوف، پڑھائی کا خوف، سمجھ نہ آنے کا خوف، مار پڑنے اور بے عزت ہونے کا خوف، فیل ہونے کی بدنامی کا خوف، سکول چھوڑنے کا خوف، گھر میں رہنے اور بھاگنے کا خوف، جسمانی کمزوری کا خوف، دوسروں کی اچھی، خوب صورت شکل کا خوف، بچھڑ جانے، گم ہو جانے، بہہ جانے، پیچھے رہ جانے، عزت گنوانے، کسی کی زیادتی کا شکار ہونے اور بالآخر مر جانے کا خوف۔

سوچیے! ایک بچے کی شخصیت کس کس خوف کا سامنا نہیں کرتی؟

ہر خوف کو اگر وقت پر دور نہ کر لیا جائے تو بچے کی شخصیت کی ناکامی میں کافی زیادہ حصہ ضرور ڈالتا ہے۔..... جن بچوں پر بھولنے کا خوف غالب آ جائے وہ امتحانات کے دوران لازماً بھول جاتے ہیں۔..... جن کو پیچھے رہ جانے کا ڈر ستائے وہ منزل کے قریب جا کر بھی ہار جاتے ہیں۔ جیتا ہوا میچ ہروا دیتے ہیں۔..... دوران تقریر بھول جانے کے خوف میں مبتلا طالب علم تقریر کرنے کی جرأت ہی نہیں کرتے حتیٰ کہ افسر بن کر بھی تقریر کرنے سے اس کی جان نکلتی ہے۔..... بچوں کے چھوٹے چھوٹے خوف ان کی ذہنی، جذباتی، جسمانی، نفسیاتی ہی نہیں روحانی صحت پر بری طرح اثر انداز ہوتے ہیں اسی لیے چھوٹی عمر میں اس کا سدِ باب کرنا لازم ہے۔

چھپکلی کا خوف کیسے دور ہوا؟

میری بے جی یعنی والدہ نے ہمارے ذہن سے چھپکلی کا خوف نکالنے کے لیے اعلان کر رکھا تھا کہ جو چھپکلی مار کر لائے گا اسے ایک روپیہ ملے گا۔ چھپکلی عجیب مکروہ سی چیز ہے۔ لڑکیاں تو اس سے بہت ہی خوف کھاتی ہیں۔ ہم بہن بھائی لکڑی کی سوٹیاں، ڈنڈے جو ہاتھ میں آتا لیکر بھاگ کھڑے ہوتے۔ کوئی ہتھیار نہ ملتا تو اپنے جوتے اتار کر دیوار پر نشانے لگانے لگتے۔ وہ بھی بڑی تیز ہوتی ہے۔ جوتے کھا کر تو نہیں مرتی۔ ہاں اکثر اپنی دم چھوڑ کر بھاگ جاتی۔ اب کٹی دم پر تو انعام نہ ملتا مگر یہ ہوا کہ کاکروچ، چھپکلی اور چوہے کا خوف دل سے ہی نکل گیا۔ ہاں البتہ کتے اور سانپ کا خوف

آج بھی مجھے تنگ کرتا ہے۔ یہ دونوں ہی مجھے بُرے لگتے ہیں۔ کتے کے خوف کا حل تو یہ نکالا ہے کہ درود شریف پڑھنے لگتا ہوں اور سانس روک کر اپنے آپ کو نارمل کر لیتا ہوں۔ سائنس یہ کہتی ہے کہ ڈر بھی جسم سے کسی بو یا خوشبو کی طرح نکلتا ہے اور جس جانور سے خوف کھا رہے ہوں، اس کو جا کر بتا دیتا ہے کہ یہ تمہارا آسان شکار ہے۔ ڈرومت، حملہ کر کے ڈرا دو۔

ٹی وی پہ ڈسکوری چینل اور نیشنل جیوگرافک پر بعض لوگوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے جو اپنے بچپن سے ہی بے خوف تھے۔ کس قدر آسانی سے ہر قسم اور ہر سائز کے سانپ ایسے پکڑ لیتے ہیں جیسے وہ سانپ نہ ہو کینچوا ہو، مگر مچھ کا منہ پکڑ کر لڑنے بیٹھ جاتے ہیں ہم جیسے ڈرنے والے تو ان مناظر کو دیکھ کر ہی توبہ توبہ کر رہے ہوتے ہیں۔ کبھی کوئی انعام بھی دے تو میں سانپ کو آج بھی پکڑنے یا ہاتھ لگانے پہ آمادہ نہیں ہوں گا۔

بچپن کا بہادر ہی بہادری دکھاتا ہے:

گولی دھماکے پٹاخے سے جن بچوں کو خوف آتا ہے وہ کم ہی بڑے ہو کر بہادر فوجی بن پاتے ہیں، اب دشمن کو دیکھ کر آنکھیں بند کر کے اوئی اوئی تو نہیں کہا جا سکتا ناں..... بچپن کا بہادر ہی بڑا ہو کر بہادر بنتا ہے۔ ایک دو بار چوٹ لگوا کر گھر گئے تو والدہ نے لفٹ ہی نہ کرائی خیال تھا ہمدردی کریں گی، چومیں گی۔ بولیں بھی تو کیا'' اول تو لڑ کے مت آنا۔ اور لڑائی ہو جائے تو پٹ کے مت آنا۔ مجھے مار کھا کر آئے بچے کی مرہم پٹی کا کوئی شوق نہیں۔''

میں نے ماں کی پہلی بات پر ہی ہمیشہ عمل کیا۔ پانچویں جماعت میں تھا تو ہم نئے نئے چشتیاں شہر میں منتقل ہوئے۔ کمہاروں کی آویوں کے قریب ابو نے کرائے پر گھر لیا۔ گھر معقول تھا البتہ آس پاس کے لوگوں میں معقولیت کی کمی تھی۔ ایک بار مسجد جاتے ہوئے ایک بڑے لڑکے (جس کا نام چٹا مشہور تھا) نے روک لیا اور لگا رعب جمانے کہ یہ ہمارا علاقہ ہے۔ تم کس سے پوچھ کر یہاں سے گزر کر جا رہے ہو۔ بالکل فلمی قسم کے ڈائیلاگ تھے۔ چھوٹا بھائی تب تیسری جماعت میں تھا۔ خود کار نظام کے تحت میں نے اپنی اور اسکی حفاظت کا فیصلہ کیا اور چلنا جاری رکھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر روکنے کی

کوشش کی تو میں نے بھائی سے چلا کر کہا بھاگو اور خود اس کا ہاتھ پکڑ کر بازو کو منہ میں دبالیا۔ ارادہ تو نہیں تھا اس کی بک بک کی وجہ سے یا شاید اندر موجود ڈر کی وجہ سے کہ کہیں وہ پیٹ نہ ڈالے۔ اس کے بازو کو ذرا زیادہ ہی کاٹ ڈالا۔ اس کی ہائے اوئی سن کر چھوڑا اور اطمینان سے چلتا ہوا مسجد چلا گیا۔ واپسی پہ گھر آ کر دیکھا کہ اس لڑکے کی والدہ جس سے پورا محلہ تنگ تھا۔ شکایت لے کر آئی ہوئی تھی کہ آپ کے لڑکے نے میرے ''چنے'' کو کاٹا ہے۔ ہماری والدہ بہت شیریں قسم کی ماں تھیں۔ اطمینان سے بولیں ''اس نے آج تک یہ کارنامہ کیا تو نہیں ہے۔ اپنے چنے سے ہی پوچھ لیں آخر کچھ تو ہوا ہوگا اس کے بعد ظاہر ہے ان کی شکایت اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔ اگر میری پیاری ماں نے بہادری نہ سکھائی ہوتی، ڈر کے ساتھ پالا ہوتا تو یقیناً ایک ''دبو'' قسم کی خوفزدہ شخصیت بنتی۔

تکلیف کا سامنا کیوں کرنا پڑتا ہے:!

جب تک بچے کو کسی تکلیف دہ چیز یا شئے سے واسطہ نہیں پڑا ہوتا وہ بے خوفی سے سانپ بھی پکڑ کر کھیلنے لگتا ہے۔ آگ میں ہاتھ ڈال دیتا ہے۔ چاقو سے ہاتھ پیر پر چیرا ڈال لیتا ہے، ٹوٹے ہوئے گلاس کا ٹکڑا اطمینان سے منہ میں ڈال لیتا ہے۔ وہ تو جب منہ سے خون نکلنے لگتا ہے تو پتا چلتا ہے کہ کچھ غلط ہو گیا۔

جب تک کسی ایسے نامہربان آدمی سے واسطہ نہ پڑا جس نے جسم کو چھوا ہو اور زبردستی کی ہو اور اپنے گھٹیا ہونے کا ثبوت دیا ہو تب تک لوگوں پر اعتبار قائم ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہی خوف آنے لگتا ہے۔ اگر والدین کی محبت کا یقین ہو، بڑے بہن بھائی سے تحفظ ملنے کی امید ہو تو بچے کو خود آ کر ایسی بات بتانے میں کوئی جھجک نہ ہوگی، اور یہی اشتراک احساس اسے بزدل بننے سے روک دے گا۔ اس تکلیف دہ صورت پر اسے کوئی الزام نہیں دے گا۔ جس میں اس کی غلطی اور قصور ہی نہ تھا۔ ایسے کمینے اور جرائم پیشہ لوگ جو 90 فیصد اپنے قریبی عزیزوں میں سے ہوتے ہیں ''گھر والوں کو بتادوں گا'' کا خوف دلا کر خاموش رہنے پر اصرار کرتے ہیں۔ حالانکہ جو بچہ ڈر کر خاموش ہو گیا وہ انہی کے ہاتھوں بار بار ایسے ناخوشگوار حادثات اور سلوک کا نشانہ بنتا ہے۔ ایسے حادثات کے بعد ماں باپ کی

ڈانٹ اور بے عزتی کے باعث بچوں کو گھروں سے بھاگتے اور معاشرے میں رُلتے بھی دیکھا۔

ہم نے اپنے ابو کو بچپن میں بار بار دیکھا وہ گورنمنٹ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، کبھی ٹرانسفر سے نہیں ڈرتے تھے۔ چشتیاں سے ان کا ٹرانسفر، فیروزہ لیاقت پور ہوا وہ آرام سے وہاں چلے گئے، پھر نور پور نورنگا بہاولپور، پھر 132 / 6 آر۔ بہاولنگر پھر ضلعی افسر تعلیم بنے تو رحیم یار خان، بہاولپور، ساہیوال ان کو پریشان نہیں دیکھا تو بڑے ہو کر نہ نوکری چُھٹ جانے کا خوف آیا، نہ ٹرانسفر کا، خود میرے اکثر تین تین سال بعد ادارے بدلتے رہے اور میں بریف کیس اٹھا کر نئے ادارے کی جان بن جاتا...... ٹرانسفر کے خوف اور نوکری چلے جانے کے خوف سے میں نے بار ہا لوگوں کو پریشان ۔حراساں اور خوفزدہ دیکھا چونکہ انہوں نے اپنے بڑوں کو اس پریشانی میں دیکھا تھا۔ مجھے میرے مہربان رب نے اس تکلیف اور آزمائش سے بچائے رکھا کہ کبھی کسی کو کہنا پڑے۔

انسانی ذہن کی ایک خاص حالت خوف کا باعث بنتی ہے جب وہ کسی ناخوشگوار واقعے اور حادثے کو دیکھتا اور یاد رکھتا ہے اس میں کسی نہ کسی طرح عدم تحفظ کا احساس بھی شامل ہو جاتا ہے۔

دوسروں کے تلخ رویے، ناموافق باتیں اور نتائج اندوھناک واقعات، سانحات، حادثات۔ اکثر بچہ اپنے خوف کی فوری وجہ نہیں سمجھ پاتا۔ جس وجہ سے اسے ذہن سے کھرچ کر پھینکنے میں تاخیر ہو جاتی ہے اور خوف اس شخصیت کی خوبصورتی کو نقصان پہنچاتا ہے۔

پشاور آرمی سکول کے بچوں کی شہادت خوف کیوں نہ بن سکی:

16 دسمبر 2014 کو جن بچوں نے پشاور آرمی سکول میں اپنے ساتھیوں کو دہشت گردوں کے ہاتھوں مرتے دیکھا۔ گولیاں چلتی دیکھیں، اپنی استاد کو جلتے دیکھا۔ وہ ڈر اور خوف کے مارے میزوں کے نیچے، دیواروں سے ہوتے ہوئے روشن دانوں میں جا چھپے۔ یہ دردناک مناظر انہیں مدتوں تنگ کرتے رہیں گے۔ ان شکلوں کے لوگ دیکھ کر، گولیاں چلتی دیکھ کر سوتے میں ہی وہ سہم کر اور ڈر کر اٹھ بیٹھیں گے۔ ان کی کونسلنگ نہ ہوئی تو پھر یہ احساس فوبیا بن کر مدتوں ان کو ڈراتا رہے گا۔ اسی بات کو سمجھتے ہوئے کہ پشاور میں ہونے والے حادثے نے عام بچوں اور والدین کو بھی اپنی سلامتی

اور اپنے بچوں کے مستقبل کے حوالے سے شدید خوف میں مبتلا کر دیا ہے، اسلام آباد میں مقیم دو محب وطن بہادر سپاہیوں نے اس واقعے کے حوالے سے اپنے جذبات کو انتہائی خوبصورت، دل پر اثر کرنے والے نغمے کی صورت میں ڈھال دیا، لاہور کے ایک نوجوان موسیقار سے اس کی دھن تیار کروائی اور چند روز کے اندر ملیر کراچی میں جا کر اس کی شوٹنگ مکمل کی، ایڈیٹنگ کر کے ریلیز بھی کر دیا۔ جلد ہی اس نغمے نے نئے قومی نغمے کا درجہ پا لیا، "لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری" کی طرح یہ سکول میں پڑھا جانے لگا۔ فیس بک پر ملک میں سب سے زیادہ شیئر کیا جانے والا یہ ترانہ اور نغمہ اصل میں خوف کو ختم کرنے اور دلوں میں گھس آنے والے ڈر کا بہادرانہ مقابلہ کرنے کی ایک بے انتہا کامیاب کوشش تھی، اس ترانے کے بول ایسے زوردار ہیں کہ کیا چھوٹا اور کیا بڑا روح تک پر اس کے اثر کو روک نہیں سکتے، یکم جنوری 2015 جب یہ ترانہ ریلیز ہوا تو پورا مہینہ میری بیٹیاں سکول جانے سے پہلے اسے میرے موبائل پر بار بار سنتی، دہراتیں اور بالآخر یہ زبانی یاد ہو گیا۔ عینک والے بچے کی کہانی بھی بڑی دلدوز تھی، اسکی والدہ بھی شہید کر دی گئی تھی۔ تبھی تو وہ کہتا ہے کہ ابھی میرا باپ بھی زندہ ہے اور میرا بھائی بھی۔ وہ میرے سارے خوابوں کو مکمل کرے گا۔ میں نے اپنے ایک بے حد عزیز دوست کے ذریعے ترانے کے لکھاری تک رسائی پا لی، اسکی بے پناہ محنت اور اعلیٰ درجے کے کام پر شاباش اور محبت کا پیغام پہنچایا، اس نے بتایا کہ گانے والے بچے کا نام ہم جان بوجھ کر نہیں دینا چاہتے تھے کہ کہیں دہشت گرد اس کو نقصان نہ پہنچائیں۔ اس واقعے میں اس بچے نے ہیرو کا درجہ پایا جو دہشت گردوں کی فائرنگ سے بچ کر حفاظت سے باہر آ گیا تھا مگر پھر اسے اپنی بہن کی محبت نے ایسا بے چین کیا کہ وہ خوف سے بے نیاز ہو کر دوبارہ اندر چلا گیا۔ وہ اپنی بہن کو بچانے میں بے شک کامیاب ہو گیا مگر خود اپنی جان قربان کر گیا۔ ایسے بہادر بچے ہی ہمیشہ قوموں کی عزت اور وقار بڑھاتے ہیں جو اپنے خوف پر قابو پا کر بے خوف بہادر کہلاتے ہیں۔ اس شاندار نغمے کو پڑھ کر آپ ان جذبات کو زیادہ بہتر طور پر جان پائیں گے۔ جو اس نغمے کی ریلیز کے بعد پوری قوم کی رگوں میں خون کی طرح دوڑنے لگا تھا۔ لکھنے والے کے ذہن، قلم اور جذبے کی تحسین آج ہی نہیں آنے والے کل بھی کی جاتی رہے گی۔

میں ایسی قوم سے ہوں جس کے وہ بچوں سے ڈرتا ہے
بڑا دشمن بنا پھرتا ہے جو بچوں سے لڑتا ہے
پتہ کیا پوچھتا ہے وہ کتابوں میں ملوں گا میں
کیے جو ماں سے ہیں میں نے
اُن وعدوں میں ملوں گا میں
میں آنے والا کل ہوں وہ مجھے کیوں آج مارے گا
یہ اُس کا وہم ہے وہ ایسے خواب مارے گا
تمھارا خون ہوں نا میں اس لیے اچھا لڑا ہوں میں
بتا آیا ہوں دشمن کو کہ اُس سے تو بڑا ہوں میں

میں ایسی قوم سے ہوں جس کے وہ بچوں سے ڈرتا ہے
بڑا دشمن بنا پھرتا ہے جو بچوں سے لڑتا ہے

وہ جب آتے ہوئے مجھ کو
گلے تم نے لگایا تھا
امان اللہ کہا مجھ کو
بڑا بیٹا بلایا تھا
خدا کے امن کی راہ میں
کہاں سے آ گیا تھا وہ
جہاں تم چومتی تھی ماں
وہاں تک آ گیا تھا وہ

میں ایسی قوم سے ہوں جس کے وہ بچوں سے ڈرتا ہے
بڑا دشمن بنا پھرتا ہے جو بچوں سے لڑتا ہے

مجھے جانا پڑا پ
میرا بھائی کرے گا اب
میں جتنا نہ پڑھا وہ تب
میرا بھائی پڑھے گا اب
ابھی بابا بھی باقی ہیں
کہاں تک جاسکو گے تم
ابھی وعدہ رہا تم سے
یہاں نہ آسکو گے تم

میں ایسی قوم سے ہوں جس کے وہ بچوں سے ڈرتا ہے
بڑا دشمن بنا پھرتا ہے جو بچوں سے لڑتا ہے

خوف کی دوسری قسم فوبیاز:

خوف کی دوسری قسم فوبیاز کہلاتی ہے۔ اس میں سوشل فوبیا بھی ہوسکتا ہے۔ یہ معاشرتی رویوں کی خرابی یا ناہمواری سے جنم لیتے ہیں۔ ایگورا فوبیا کسی خوفناک ماحول یا صورتحال میں پھنس جانے سے جنم لیتے ہیں۔ فوبیاز میں ایک تیسری قسم بھی ہوتی ہے۔ مختلف چیزوں، جانوروں، آوازوں کا خوف، آسمانی بجلی کی چمک دیکھ کر آج بھی اکثر بچے خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ابھی وہ بجلی مجھ پر آ گرے گی۔ سانپ، بچھو۔ کتے کا خوف کئی بار ٹی وی میں دیکھا کہ چڑیا گھر میں کسی شیر نے بچے کا باز دکھالیا اور اسے کھینچ کر جنگلے میں لے گیا اور چبا ڈالا۔ یہ خوف کئی شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ دیہاتی علاقوں میں ایسے واقعات کسی اونٹ یا بیل سے وابسطہ ہوتے ہیں کہ جس نے اپنے مالک کو ناراض ہوکر سینگوں سے لٹکا کر مار دیا یا اونٹ نے اس کے اوپر بیٹھ کر اسکی ہڈیاں پسلیاں توڑ ڈالیں۔ اکثر بچے سرنج دیکھ کر ہی رونے لگتے ہیں۔ ٹیکا لگنے کا خوف ڈاکٹر کے پاس جانے، کڑوی دوا لینے کا ڈر، آپریشن ہونے، جسم کی چیر پھاڑ کا خوف بھی اکثر فوبیا بن جاتا ہے۔

خوف، سوچ، صلاحیت اور قوت کو متاثر کرتا ہے:

خوف اور فوبیا سوچ، صلاحیتوں اور کام کرنے کی قوت کو بری طرح متاثر کرتے ہیں۔ خوف زدہ اور کسی فوبیا میں مبتلا بچے راہنمائی کے منصب پر فائز نہیں کیئے جا سکتے۔ موت کے خوف سے کبھی انہیں چکر آنے لگتے ہیں۔ الٹیاں بھی ہو سکتی ہیں۔ اور سانس بھی ناہموار ہو سکتے ہیں۔ بار بار ان کیفیات میں مبتلا ہونے والا بچہ صحیح طور پر سوچنے کا فیصلہ کرنے، اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے اور اعلیٰ درجے کے ہمت بھرے فیصلے کرنے سے ہی محروم ہو جاتا ہے۔ اصل میں یہ موت یا موت آنے کا خوف سب خوفوں کی ماں ہے۔ اور یہ بیسیوں شکلیں بدل کر بچوں کو ڈرا ڈرا کر ہی کمزور کر دیتا ہے۔ کچھ خوف وقت اور سمجھ کے ساتھ کم ہو جاتے ہیں اور کچھ طویل مدت تک تنگ کرتے ہیں۔ ان کا علاج کرانا پڑتا ہے۔

جب میں ڈوبتے ڈوبتے بچا:

مجھے ذاتی طور پر تیرنا نہیں آتا۔ ایک دو بار تیرنا چاہا تو ڈوبتے ڈوبتے بچا، ایس ای کالج بہاولپور کے زمانے میں ہمارے ایک دوست میاں ثناءاللہ نے چشتیاں کے قریب اپنے گاؤں میں کئی دوستوں کو دعوت پر بلایا پھر فورڈ نہر پر نہانے کا پروگرام بنایا۔ میں نے بار بار بتایا اور سمجھایا بھی کہ مجھے تیرنا نہیں آتا مگر انہوں نے ایک نہ سنی اور مجھے اٹھا کر نہر میں پھینک دیا اور اس سے بھی بری حرکت یہ کی کہ پھینک کر بے نیازی سے دوسرے مہمانوں سے ہنسی مذاق میں لگ گئے۔ وہ چند منٹ میں نے موت کو اپنی ناک اور آنکھوں تک آتے دیکھا۔ گہری نہر سے چھوٹے چھوٹے جمپ لگا کر کنارے کی طرف آنے میں جتنی دیر لگی اس سے زیادہ باہر نکل کر سانس درست کرنے اور اپنا غصہ اور نفرت کنٹرول کرنے میں لگی۔ سچ تو یہ ہے کہ مذاق کے نام پر کی گئی اس بدتہذیبی کو میں آج تک فراموش نہیں کر پایا۔ ان کے بارے میں میری رائے بھی زیادہ تبدیل نہیں ہو سکی حالانکہ ایم اے کے بعد وہ ریڈیو پاکستان میں ملازم ہو کر تھوڑے سوبر بھی ہو گئے تھے۔ ایسے صدمے یا ڈر کی وجہ سے آپ کا انسانوں سے اعتماد اور اعتبار ہی اٹھ جاتا ہے کہ اگر دوست ہو کر بھی اس نے خیال نہیں کرنا تو ایسا

جان لیوا مذاق دشمن تو کرنے سے رہا۔ لاہور آ کر جب میں پنجاب یونیورسٹی کا طالب علم تھا تو میں نے پانی سے اپنا خوف کم کرنے کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کی۔ ایک صبح ایف سی کالج کے پل کے قریب موٹر سائیکل کھڑی کی۔ کپڑے اتارے اور شلوار میں ہوا بھر کر نہر میں چھلانگ لگا دی۔ بُرا ہوا اس تجربے کا۔ ایک پائنچے سے ہوا نکل گئی اور دوسرے نے مجھے ڈبوڈبو کر ادھ موا کر دیا۔ وہ آدھی ہوا نہ تیرنے دے نہ ڈوبنے۔ اللہ معاف کرے صبح صبح کا وقت تھا سڑک کے دونوں طرف سناٹا تھا، نہ کوئی آدم نہ آدم زاد کہ بندہ کسی کو مدد کے لیے، پکارے۔ خیر پھر ہمت کی اور بڑی مشکل سے نہر کے دوسرے کنارے پر نکلا۔ کتنی دیر بے دم ہو کر فٹ پاتھ پر لیٹا رہا سوچتا رہا کہ اگر آج یہ ڈر دور نہ ہوا اور ذہن میں اسی طرح بیٹھا اور بڑھتا رہا تو عمر بھر دور نہیں ہوگا۔ اور واقعتاً فوبیا بن جائے گا۔ تھوڑے فاصلے پر پل تھا جس کو کراس کر کے واپس دوسری طرف جانا تھا۔ جونہی حواس درست ہوئے اور سانس میں سانس آئی۔ پھر شلوار میں ہوا بھری اور اللہ کا نام لے کر چھلانگ لگا دی۔ اس بار خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ہوا قائم رہی اور میں دھیرے دھیرے تیرنے کے نام پر ہوا بھری شلوار کے سہارے ٹانگیں بازو مارتا دوسری طرف جا نکلا۔ تھکاوٹ تو ضرور تھی مگر ایک فاتحانہ احساس بھی ہمراہ تھا کہ نہر میں تیرنے کے خوف پر کچھ قابو پا لیا تھا۔ ویسے آج بھی اس تجربے کا سوچتا ہوں تو ہنسی آتی ہے۔

گھوڑے سے گرنے کا خوف آج تک نہیں گیا:

چھوٹی عمر کی ایک حیران کن بات آپ کو بتاؤں، اس عمر کی یادیں ساری عمر آپ کے ساتھ رہتی ہیں۔ ہمارے والد صاحب سالوں پہلے اپنی گھوڑی پر جاتے ہوئے اندازے کی غلطی سے چھوٹی نہر جسے ہمارے ہاں مائنر کہا جاتا ہے (پنجابی میں یہ مینڈ رکہلاتے تھے یہ نہر مراد سے نکل کر چھوٹی نہر اور پھر کھالوں میں تقسیم ہو جاتا ہے) اپنی گھوڑی کو جمپ لگواتے ہوئے پانی میں جا گرے، مگر وہ خوف آج تک میرے اندر سے نہیں گیا۔ میں چاہنے کے باوجود گھڑسواری نہیں کر سکا۔ مجھے ہمیشہ یاد رہا کہ نفع نقصان بے شک اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر نقصان تبھی ہوتا ہے جب آپ کے اندر کسی کام کی مہارت کم ہوتی ہے اور جس کام کی مہارت کم ہو اس میں رسک لیتے ہوئے دس بار سوچ لینا چاہیے۔

ایک دو بار موقع ملا تو صرف گھوڑے پر بیٹھ کر تصویریں بنوا کر اتر آیا۔ ایک بار ہیر لکھنے والے مشہور شاعر وارث شاہ کے مزار کے قریب ایک گاؤں جنڈیالہ شیر سنگھ میں اپنے ایک طالب علم کی دعوت پر گئے تھے، وہاں ان کی گھوڑی کی سواری کی، اپنے بچوں کو بھی بٹھایا۔ تصویریں بن چکی تو اس نے اپنے مزارع سے کہا" سر کو کھیتوں کا چکر لگوا دو۔" میں اس دعوت اور آفر کا فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ خوف نے سر اٹھا کر پھر ڈرا دیا کہ ابو گر گئے تھے تم بھی گرو گے۔ اس سے پہلے جھیل سیف الملوک کی سیر کے بعد گھڑ سواری کا موقع ملا تو وہاں بھی گھوڑے کے مالک کے کہنے کے باوجود گھوڑے کو دوڑانے اور مزہ لینے سے محروم رہا۔ حالانکہ وہاں تو اچھے خاصے پیسے بھی دیئے تھے۔

استاد سے ڈرنے والے پر کیا بیتتی ہے:

استاد ایک محترم ہستی کا نام ہے مگر کبھی کبھی کوئی نامہربان شخص استاد بن جاتا ہے تو بچوں کی شامت آجاتی ہے۔ اپنے بچپن میں کتنے بچوں کو استاد کے خوف سے سکول چھوڑتے اور پھر عمر بھر گلیوں میں رلتے اور معمولی درجے کے کام کرتے دیکھا۔ ایک دو استاد ایسے تھے جو انگلیوں میں پنسلیں پھنسا کر دباتے اور بچوں کو اذیت دیتے تھے۔ ان کے آنے سے قبل ایک دو بچوں کا تو پیشاب بھی خطا ہو جاتا تھا۔ جس پر وہ مسئلہ سمجھنے کی بجائے اور ناراض ہو جاتے۔ بچیوں کو بھی ایسی سخت مزاج استانی مل جائے تو وہاں بھی ایسا ہی منظر ہوتا ہے۔ سرکاری سکولوں اور مدارس میں یہ منظر پہلے عام تھے اب شکر ہے کچھ کم ہو گئے ہیں۔ پرائیویٹ سکولوں کی اساتذہ نے ڈرانے کے اور کئی طریقے نکال رکھے ہیں۔ انہیں دیکھ بچوں کی ذہنی اور جسمانی حالت بدل جاتی ہے۔ دل تیزی سے دھڑکنے اور ٹانگیں کانپنے لگتی ہیں۔ یہاں تک کہ امتحان کی اچھی خاصی تیاری بھی دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔ یاد کیا ہوا سبق تک بھول جاتا ہے۔

بعض والدین کی سختی اور والد کی ڈانٹ ڈپٹ گھر میں بھی ایسے ماحول کو پیدا کر دیتی ہے۔ ایسے حالات کا شکار بچہ نیند میں کمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کی کنپٹیوں کی رگیں تن جاتی ہیں، ذہن ماؤف رہنے لگتا ہے، دماغ جکڑا جکڑا سا رہتا ہے۔ اعصاب تن جاتے ہیں، بھوک پیاس اڑ جاتی ہے، آنکھوں

کے آگے اندھیرا چھانے لگتا ہے کبھی کبھی تو دورے بھی پڑنے لگتے ہیں۔اس ذہنی حالت کے ساتھ شخصیت کے درخت پر دو چار مرجھائے پھول ہی کھل سکتے ہیں سارے اچھے پھول مرجھا کر اپنے آپ ہی گر جاتے ہیں۔

جس طرح بچوں کی شکلیں اور نام مختلف ہوتے ہیں ایسے ان کا ماحول اور خوف مختلف ہوتے ہیں۔عمر کے ساتھ ساتھ بدلتے اور بگڑتے جاتے ہیں۔ مجھے کئی سال گورنرز ٹاسک فورس کے ممبر کے طور پر کام کرنے کا موقع ملا۔سرکاری ادارے نگہبان بھی جانا ہوتا جہاں ریلوے سٹیشن ،داتا دربار یا بادامی باغ ،بس اڈے سے پکڑ کر لائے گئے بچے رکھے جاتے ،اکثر بچے یہی بتاتے کہ استاد کی مار اور باپ کی ڈانٹ سے ڈر کر بھاگ کر آئے ہیں۔اور یہاں آ کر روپیہ پیسہ ہی نہیں اپنی عزت اور عصمت بھی لٹا بیٹھے۔ایسے میں گھر واپسی بھی ایک خوف بن جاتا ہے۔

عادات ہی نہیں راز اور خوف بھی مشترک ہو جاتے ہیں:

خوف زدہ بچہ ہو یا بچی اپنی کمزور شخصیت کے باعث اکثر اس طاقتور دنیا کے دباؤ کا مقابلہ کرنے سے محروم ہو جاتے ہیں۔ کتنے ہی ان جانے خوف ان کی شخصیت کو چاٹ کھاتے ہیں۔کچھ جسمانی اور نفسیاتی خوف بچے اپنے ماحول اور اپنے دوستوں سے لیتے ہیں۔خاص طور پر وہ بچے زیادہ شکار بنتے ہیں جن کے اپنے گھروں میں والدین اور بہن بھائیوں سے زیادہ دوستی نہیں ہوتی 12-13 سال کی عمر میں بچے بچیاں بالغ ہو چکے ہوتے ہیں۔یہ ایسا نازک دور ہوتا ہے کہ جنسی جبلت اپنا راستہ مانگتی ہے۔عدم معلومات ،گھٹن اور دباؤ کے باعث بچے غلط فیصلے کر بیٹھتے ہیں۔اکثر اپنے ہی بعض ظالم عزیزوں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں اور پھر عمر بھر بدنامی کے خوف میں ان لوگوں کی دھمکیوں کا شکار بن جاتے ہیں۔اسی عمر میں ایک دوسرے کی عادات ،لباس اور سوچ ہی نہیں راز اور خوف بھی اپنا لیے جاتے ہیں۔

عزت صرف لڑکیوں کی نہیں ہوتی:

بچپن کی ذہانت ،اعتماد اور کردار کی مضبوطی کی حفاظت جہاں بے حد اہم ہے وہاں ان کی

بیداری بھی ضروری ہے۔عزت صرف لڑکیوں کی نہیں ہوتی ۔لڑکوں میں بھی اپنی عزت اور عصمت کی حفاظت کا خیال پوری طرح جاگزیں ہوتا ہے۔ دونوں کو چوکنا رکھنا ضروری ہے۔ یہ جہاں مناسب راہنمائی ،بہتر معلومات کی فراہمی اور دوستیاں ،تعلقات سے ممکن ہے وہاں اللہ سے محبت۔ اس کی پسندیدہ زندگی ،اس کے محبوب رسول ﷺ کی راہنمائی سے واقفیت بے حد ضروری ہے عام طور پر سب سے بڑی حفاظتی دیوار یہی تعلق بنتا ہے۔

خوف کب کب منفی جذبات میں ڈھلنے لگتا ہے:

نفرت، کراہت، بغاوت، انتقام اسی سے جنم لیتے ہیں۔گھر سے بھاگ جانا، بُری صحبت اختیار کر لینا، کسی حد، قاعدے قانون کو خاطر میں نہ لانا خوف ہی کا ردِعمل ہوتا ہے۔

ماہرین نفسیات کا اتفاق ہے کہ بچے کی شخصیت 5 سال کی عمر تک مکمل ہو جاتی ہے۔اسی عمر میں اسے اچھا ماحول، اچھی خوبیاں، اچھے دوست ،اچھی کتابیں اور اچھی تعلیمات مل جائیں تو وہ ایک باہمت، پرجوش شخصیت میں ڈھلتا ہے۔ جسے زندگی میں آگے بڑھنا ہوتا ہے، اپنا آپ منوانا اور اپنی صلاحیتوں کو آزمانا ہوتا ہے۔خود اعتمادی اس کا زیور ہوتا ہے اور قوت فیصلہ اور عزتِ نفس اس کے اثاثے اور معیار ہوتے ہیں۔اس عمر میں شخصیت میں رہ جانے والے جھول جذبات کی بے ترتیبی کا ہی باعث نہیں بنتے، ذہنی اور فکری ناہمواری کی راہ بھی ہموار کرتے ہیں۔ بچے کی عدم تحفظ کا شکار شخصیت شک وشبہ کا شکار ہو کر اپنے بچاؤ کے لیے جھوٹ اور غلط بیانی کا سہارا لینے لگتی ہے۔

شخصیت مسخ ہونے سے کیسے بچے گی؟

خود شناسی وہ عظیم نعمت ہے جو کسی بھی بچے اور بچی کو قدرت اس کے بچپن میں ہی عطا کر دیتی ہے۔ سمجھدار، ذہین بچے اس نعمت کو پہچان لیتے ہیں اور اسے اپنا سب سے قابل قدر اور قابل اعتماد ساتھی بنا لیتے ہیں۔اپنی ہر کمی کمزوری کے اسباب اور علامات سے جان لیتے ہیں، پہچان لیتے ہیں اور اس کے تدارک اور خاتمے کے لیے کوشش اور جستجو کرتے ہیں۔

میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں بچوں کی شخصیت سازی پہ نہ گھر میں کسی کے

پاس وقت ہے نہ سکول اور مدرسے میں اساتذہ کے پاس۔ ایسے میں بچوں کے اندر جمع ہوئے طرح طرح کے خوف نکالنے کے لیے بھی کم ہی لوگ آگے بڑھتے ہیں۔ حالانکہ ہر خوف قابل توجہ اور قابل علاج ہے۔

چاہے وہ کسی حادثے سے پیدا ہوا ہو۔ کسی ناکامی سے وجود میں آیا ہو، کسی بیماری یا معذوری نے اسے جنم دیا ہو، امتحان میں ناکامی اسکی وجہ بنی ہو یا کسی کی جسمانی اور جذباتی بدسلوکی نے یہ پریشانی دی ہو۔ خود شناسی اور خود آگاہی ایسی قوت اور طاقت ہے کہ قدرت نے ہر بچے اور بڑے کے اندر ایک نعمت کے طور پر ودیعت کر دی ہے۔ یعنی جسم اور ذہن کی سوچ کے اندر رکھ دی ہے۔ اگر خود سے قابو پا لیا جائے تو بہتر ورنہ بڑے ہوتے تک شخصیت مسخ ہی نہیں ہوتی باقاعدہ کسی ڈاکٹر یا نفسیات دان سے سائیکوتھراپی کرانا پڑتی ہے۔ اس علاج میں کوئی آپریشن یا دوائی نہیں ہوتی۔ اکثر سمجھایا جاتا ہے۔ خودی، خودداری، خود آگاہی اور خود احتسابی کے ساتھ ساتھ عزت نفس کے احساس کو مضبوط کیا جاتا ہے تاکہ اس کمزوری اور پیچیدگی پر قابو پایا جا سکے۔ جو انہیں جیتے جی مار رہی ہوتی ہے۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ اللہ رب العالمین پر ایمان پختہ ہو اور اس کی ذات مہربان پر یقین ہو تو بہت سے خوف اپنی موت آپ مر جاتے ہیں۔ خیالات کی پاکیزگی اور نیک طور اطوار ہی بہت بڑا سہارا ہوتے ہیں۔ بچے اگر دینی کتب بچوں کے رسائل اور اچھے لٹریچر کا مطالعہ کرتے رہیں تو نئی نئی معلومات اور مشقیں انہیں مدد دیتی ہیں۔

غلطی انسان کے بس میں نہیں:

میں نے زندگی سے سمجھا ہے کہ غلطی ہونا انسان کے بس میں نہیں ہوتا۔ یہ کسی بھی عمر میں ہو جاتی ہے۔ ہر غلطی چاہے وہ بار بار ہو، اس پر ندامت اور اظہار افسوس کے ساتھ رب سے معافی ہی اس کا حل ہے۔ احساس گناہ پال کر ہر وقت پریشان رہنا کڑھتے رہنا، ڈرتے رہنا آپ کو ایک خوفزدہ انسان بنا دیتا ہے۔ آسان طریقہ یہ ہے کہ غلطی مانئے اور اپنے رب سے توبہ کر لیجئے۔ اس کے ساتھ ساتھ اگر شرارت سے یا سوچ سمجھ کر کسی کے ساتھ زیادتی کر دی ہے۔ اس کا حق مار لیا ہے۔ اسے تنگ

کرلیا ہے تو بہادری دکھائیں اور جب خیال آجائے اس سے سچے دل سے معافی مانگ لیں۔ آپ کا احساس گناہ اور خوف دونوں ختم ہو جائیں گے۔ اس انسان سے معافی اور رب سے معافی کے علاوہ اور کوئی طریقہ ہے ہی نہیں جو آپ کو اس مشکل سے نکالے۔

کوئی اچھا لگے تو فیصلہ کس بنیاد پر کرتے ہیں:

میں نے سکول کی زندگی میں ہی یہ بات سیکھ لی تھی آپ کو بطور خود شناس استاد بچوں کو بتانا چاہیے کہ کوئی کتنا بھی اچھا کیوں نہ لگے جو آپ سے عمر میں زیادہ بڑا ہے اور کلاس میں بھی بڑا ہے، اس سے دوستی اور قربت سے بچیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو محفوظ رکھے۔ آپ کے اپنے ہی ہم عمر بدنام کرنے لگتے ہیں اور آپ بغیر کسی غلطی اور جرم کے گناہ گار ٹھہر جاتے ہیں۔ دوسروں کے مذاق کا نشانہ بنتے ہیں اور بعض اوقات تو یہ الزام آپ پر مستقل لگ جاتا ہے اور آپ اس کا کچھ نہیں کر سکتے۔

جب ہم نور پور نورنگا سکول میں تھے تو چھٹی جماعت میں پڑھتے تھے۔ ہمارا گھر سکول کے اندر ہی تھا۔ کراچی روڈ پر یہ سکول واقع ہے۔ مین گیٹ سے راستہ سکول کے اندر سے ہو کر نور پور گاؤں جاتا تھا اور اس راستے پر طلبہ بھی گزرتے تھے اور عام لوگ بھی۔ ہمارے سکول کے کچھ بچے سکول کے بعد ہمارے ساتھ فٹ بال کھیلتے۔ گھر کے باہر رکھی کرسیوں پر بھی آ کر بیٹھ جاتے۔ محمد اسلم اور شفیع کے نام ابھی مجھے یاد ہیں۔ ایک مجی یا مجیب بھی تھا۔ وہاں سے ایک خاموش طبع لڑکا گزرتا تھا۔ میں نے اپنے ہم جولیوں سے کہا اسے بھی بلا لیا کرو۔ روز گزرتا ہے مجھے اچھا لگنے لگا ہے۔ اس پر انہوں نے سمجھایا کہ آپ ہیڈ ماسٹر صاحب کے بیٹے ہو۔ عام لڑکوں سے آپ کا واسطہ ہی کبھی نہیں پڑا۔ ہر لڑکے کے ساتھ اس کی اچھی بری شہرت ہوتی ہے۔

دوستی، تعلق یا واقفیت میں ہمارے بڑوں نے یہ اصول بتایا ہے کہ بری شہرت والا لڑکا سونے کا بھی ہو تو اس کے قریب مت جاؤ، اس کا کچھ نہیں بگڑے گا آپ بدنام ہو جاؤ گے۔ تب تو شکریہ ادا کرنے کا اتنا علم نہیں تھا مگر آج میں ان کا غائبانہ شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی بتائی یہ قیمتی بات زندگی بھر کام آئی۔

آٹھویں نویں میں چہرے پہ مونچھیں داڑھی آنے لگتی ہے۔ میں بھی چھپ چھپ کر شیو کرنے لگا تاکہ جلدی بڑا ہو جاؤں۔ انسان کسی حالت میں خوش نہیں رہتا، ساتویں میں ہو تو آٹھویں کے خواب آتے ہیں، نویں میں ہو تو دسویں کے اور میٹرک پاس کر کے کالج جانے کے۔ کالج جا کر میں نے محسوس کیا کہ میں سب سے چھوٹی کلاس اور چھوٹی سی عمر کا ہوں۔ اس زمانے میں اسلامی جمعیت طلبہ کے چند اچھے اور نیک لڑکوں سے دوستی ہوگئی مگر ان کا ساتھ، ہر وقت کا ساتھ تو نہ تھا پھر بھی میں نے احتیاطاً اپنی حفاظت کے لیے داڑھی رکھ لی تاکہ بڑا بڑا لگوں، بعد میں جا کر سنت کی پیروی اور آنحضورؐ کی خوشی بھی نیت میں شامل ہوگئی۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ خود آگاہی آپ کے بہت کام آتی ہے۔ خوف سے بچاتی ہے، پریشانی اور خواری سے بچاتی ہے اور کامیابی اور اطمینان کے راستے آسان کرتی ہے۔

وہ تو خوف سے مرنے والے ہو گئے:

ایک بالکل مختلف خوف کا بھی مجھے تجربہ ہوا۔ میں نے چونکہ چھٹی ساتویں سے بچوں کے رسالے پڑھتا تھا، نویں دسویں تک سب رنگ اور اُردو ڈائجسٹ بھی پڑھنے لگا تو رائے میں ایک سمجھداری آ گئی تھی۔ دینی کتابیں بھی پڑھیں، ابو قرآن پاک کی تفسیر ''تفہیم القرآن'' گھر میں لے آئے تھے۔ اس میں سے کچھ حصہ پڑھا ہوگا۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا بھی علم تھا۔ فیروز سنز کی دو کتابیں بچوں کا قرآن اور بچوں کی حدیث بہت خوبصورت، آسان اور بچوں کی عمر کے حساب سے تھیں۔ اسی زمانے میں ایک دو جاننے والوں نے موت کا منظر مع مرنے کے بعد کیا ہوگا پڑھ لیں۔ وہ تو خوف سے مرنے والے ہو گئے ملنا جلنا بند ہو گیا۔ کمرے میں بند رہتے تھے۔ ہر وقت ہاتھ اور جسم دھوتے رہتے تھے۔ اللہ جانے احساس گناہ تھا یا خوف ان کی زندگی برباد ہو گئی۔ اسی زمانے میں ایک کتاب حسن پرستوں کے انجام کا منظر طبع ہوئی تو میں نے ان کے انجام سے ڈرتے ہوئے کتاب ہی پڑھنے سے انکار کر دیا۔

پیر صاحب کی مانو ورنہ مارے جاؤ:

بہاولپور میں ون یونٹ کالونی میں ہمارا گھر تھا۔ تب ابو محکمہ تعلیم میں ڈپٹی ڈائریکٹر تھے۔ ایف ایس سی کے امتحانات کے لیے میں ون یونٹ کی مسجد میں بیٹھ کر پڑھتا اور پڑھتے پڑھتے سو جاتا تھا۔ وہاں سیٹلائیٹ ٹاؤن سے بھی ایک لڑکا آ کر پڑھتا تھا۔ اس نے کہیں کراچی کے ایک عظیمی صاحب کا رسالہ اور کتابیں پڑھ لیں اور ان کا مرید ہو گیا۔ بہت ذہین تھا۔ ایف ایس سی ٹاپ کر سکتا تھا مگر وہ ہر وقت رنگوں کی باتیں کرتا۔ خوف زدہ رہتا، سب کو ڈراتا سمجھاتا کہ پیر صاحب کی مانو ورنہ مارے جاؤ گے۔ ایک لڑکے نے تنگ آ کر اسے کوئی سخت بات کہہ دی۔ اس نے غصے میں آ کر خود سے اعلان کر دیا کہ اب تم پر عذاب آئے گا۔ اس نے منگل کا دن اور دو بجے کا وقت بھی دے دیا۔ ظہر کی نماز 1:25 پر ہوتی تھی۔ ہم نے کہا شکر ہے باجماعت نماز پڑھ کر ہی فوت ہوں گے۔ اس نے اپنے پیر صاحب کو بھی بتا دیا تا کہ عذاب کنفرم ہو جائے۔ اب عذاب اور قیامت کے دن گننے لگا۔ تھوڑا سا ڈر تو دل میں پیدا ہوا مگر پھر بھی یقین تھا کہ قیامت اس طرح نہیں آتی۔ ہمارے دادا کہا کرتے تھے ''کوؤں کے بولنے سے بیل نہیں مرتے'' بس اسی طرح کی کیفیت تھی۔ پیر آیا تو اس کا تکبر دیکھنے والا تھا۔ اسے سمجھایا بھی کہ تم بھی تو مارے جاؤ گے پھر اتنی سی بات پر کہ ایک لڑکے نے تمہارے پیر صاحب کی شان میں گستاخی کر لی تھی۔ ہم سب کو تو مفت میں نہ مرواؤ۔ ایف ایس سی بیچاری درمیان میں رہ جائے گی۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ میں دو تین روز کے لیے جمعیت کی ڈویژنل تربیت گاہ میں چلا گیا جو ایس ای کالج کی مسجد میں ہو رہی تھی۔ اور جس کے لیے ناظم ڈویژن علی اصغر سلیمی بھائی نے ابو سے خصوصی اجازت لی تھی۔

دو دن بعد واپس آیا تو مسجد جا کر یاد آیا کہ منگل تو گزر گیا۔ ون یونٹ مسجد سب قائم تھی، اس کو ڈھونڈا تو پتا چلا کہ جب منگل کی رات تک عذاب نہیں آیا تو وہ دکھ اور پریشانی سے پاگل ہو گیا۔ گھر والوں نے اسے رسیوں سے جکڑ کر کمرے میں بند کر دیا تھا وہ بیچارہ "قیامت آ رہی ہے۔ سب مر جاؤ

گے۔ منگل آنے والا ہے۔ منگل آنے والا ہے۔ منگل کی رات آخری رات ہوگی" قسم کے جملے بولتا اور چلاتا تھا۔

قیامت کے خوف سے وہ ذہنی توازن کھو بیٹھا:

اس بچے کے ضائع ہونے کا مجھے آج تک دکھ ہے۔ پیر صاحب کو ایک مرید کے پاگل ہونے سے کیا فرق پڑتا تھا۔ انہیں اس طرح کے کئی اور مل گئے ہوں گے۔ مگر اس گھر میں جو دکھ اترا وہ ناقابل بیان ہے۔ قیامت کے خوف سے وہ ذہنی توازن کھو بیٹھا یا پیر صاحب کی پیش گوئی پوری نہ ہونے پر اسے صدمہ سہنا پڑا۔ کافی عرصے بعد ابو جی کا ٹرانسفر گورنمنٹ ان سروس پری سروس کالج بہاولپور کے پرنسپل کے طور پر ہوا تو اس بچے کا گھر وہاں ہمارے گھر کے قریب ہی تھا۔ اسی عرصے میں ایک روز وہ گھر سے نکلا اور ایک حادثے کا شکار ہو کر جان سے گیا۔

ان مذہبی باتوں کا خوف جن کی ابھی عمر نہیں ہوتی:

مذہبی انتہا پسندی ہو یا وقت سے پہلے ان مذہبی باتوں کا علم جن کی ابھی عمر نہیں آئی ہوتی وہ بھی بہت خوف کا باعث بنتی ہیں اور شخصیت کا توازن بگاڑ دیتی ہیں۔ اچھے والدین اور خود شناس استاد ہی ہوتے ہیں جو بچوں کو ان کی عمر کے اعتبار سے دینی معلومات اور احکام صحیح روح کے ساتھ بتا سکتے ہیں۔ اچھی کتابیں انہیں پڑھا سکتے ہیں تاکہ ایسے کسی خوف کا شکار ہو کر وہ غیر متوازن خیالات کا زندگی بھر کے لیے کا شکار نہ ہو جائیں۔ یہ تو چند وہ واقعات میں نے لکھ دیئے ہیں جو مجھے یاد آ گئے ورنہ ہم سب کے آس پاس ہمارے ہی کے عزیزوں اور دوستوں کی ایسی بے شمار کہانیاں موجود ہوتی ہیں جو تکلیف کا باعث بنتی ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کو پڑھنے والے میرے قارئین اور استاد اپنی زندگی کی خوبصورتی کو قائم رکھنے اور اپنے رب کی دی گئی ذہانت اور سمجھداری کی نعمتوں کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے اپنی زندگی خود آگاہی کے ساتھ گزاریں گے اور نہ صرف اپنے چھوٹے بڑے خوفوں پر قابو پا کر جئیں گے تاکہ ان کی شخصیت کے درخت پر ڈر کے پھول نہ کھلیں۔ بلکہ دوسروں کی بھی مدد کریں گے۔

غزہ کی خوف زدہ کرنے والی شام:

2014 میں غزہ فلسطین میں اپنے قیام کے دوران ایک خوفزدہ کرنے والی اس شام کو کیسے فراموش کرسکتا ہوں جب خان یونس شہر کے ہسپتال کے گیسٹ روم میں لیٹے ہوئے اسرائیلی طیارے ایف16 کی خوفناک آواز سن کر اٹھ بیٹھا تھا۔ دوسرے بیڈ پر میرے عزیز دوست ڈاکٹر انتظار بٹ سو رہے تھے۔ میں نے بیڈ سے اتر کر اپنے بیگ کے اوپر اپنا اور گھر کا پتا لکھتے ہوئے اپنے رب سے کہا تھا۔

"سر اللہ میاں! میں نہیں جانتا بمباری کے بعد لاش پہچانی بھی جائے گی یا نہیں۔ اگر ایسا کچھ ہو ہی جائے تو پھر پلیز مجھے اور میرے سامان کو میرے بیوی اور بچوں تک ضرور پہنچا دیں ورنہ نہ ان کو سکون آئے گا نہ مجھے، اور ان کے لیے جو تحفے لیے ہوئے ہیں وہ بھی ضائع جائیں گے۔ یہاں تو نہ کوئی شکل پہچانے گا نہ نام جانے گا نہ کام .... بہتر ہے اپنے ملک جا کر ہی مستقل آرام گاہ ملے۔ چار بندے فاتحہ کے لیے تو آتے جاتے رہیں گے۔" پھر اہم شہروں میں جنازے الگ سے ہو جائیں گے۔ اتنے سالوں سے پڑھنے والے اور پڑھنے والیاں دعا کرنے بھی آجائیں گی یوں کچھ بچت تو ہو ہی جائے گی۔

ابو بیگ پر پتہ کیوں لکھتے:

اس حرکت کے پیچھے مشاہدہ تھا کہ ابو جب کبھی سرکاری میٹنگ پر لاہور جاتے خاص طور پر جب وہ ڈپٹی ڈائریکٹر ایجوکیشن بننے کے بعد پرنسپل گورنمنٹ ان سروس پری سروس کالج بہاولپور ہو گئے تھے۔ تو جاتے ہوئے اپنے بیگ پر پتہ ضرور لکھتے، ایک ایڈریس والا کاغذ، اپنی جیب میں بھی رکھتے۔ پھر اپنے آپ کو اپنے سامان کو خدا کی حفاظت اور پناہ میں دیتے۔ مجھے لگتا ہے خود شناسی میں لازم ہے کہ اپنے دل و دماغ اور پسند و ناپسند پر اللہ جی کے پتے کا ٹیگ لگا ہو تو منزل پر بلا خوف پہنچنے میں بہت آسانی ہوتی ہوگی۔

جلیل عالی کی ایک غزل کے دو خوبصورت شعر اس باب کی خوب عکاسی کرتے ہیں

کیا کیا دلوں کا خوف چھپانا پڑا ہمیں
خود ڈر گئے تو سب کو ڈرانا پڑا ہمیں
اپنے دیئے کو چاند بتانے کے واسطے
بستی کا ہر چراغ بجھانا پڑا ہمیں

☆..........☆..........☆

7

اللہ ویسا ہے
جیسے آپ سوچتی ہو---
تصورِ خالق

سچ پوچھیں تو پوری انسانی زندگی میں اللہ جی جیسا مضبوط اور شاندار کوئی رشتہ، سہارا اور بنیاد موجود ہی نہیں۔ شخصیت سازی ہو، کردار سازی یا زندگی کے چھوٹے سے چھوٹا معاملہ اور بڑے سے بڑا مسئلہ، یہ تصور ہر فیصلے، تعلق، خوشی اور مسرت کی اس قدر مضبوط اور مستحکم بنیاد ہے کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔

مجھے میرے اللہ جی نے سوچنے والا دماغ اور تجزیہ کرنے والا دل نہ دیا ہوتا تو میں بھی بیشتر پڑھے لکھوں کی طرح غیروں کی کتابوں اوران کے ترجمے پڑھ پڑھ کرانہی کے لفظ اور جملے بول رہا ہوتا۔ ہمارا ہر وہ فرد جو باہر پڑھنے جاتا ہے واپسی پر انہی کی زبان بولنے لگتا ہے سوائے ان کے جن کے بچپن میں اللہ کا مضبوط تصوران کی زندگی کا حصہ بن چکا تھا۔

میں نے ذرا بڑا ہو کر اپنے اللہ جی کو ڈھونڈنا چاہا۔ ملنا چاہا، جاننا چاہا تو اس نے اپنا تعارف کروایا۔ اپنے ہونے کا بتایا، مالک اور خالق ہونے کا یوں احساس دلایا، ”میں وہ ہوں جو موت سے پاک ہوں..... اللہ هو لا الہ الا هو الحی القیومo لا تاخذہ سنۃ و لا نومo

پھر اللہ نے بتایا میں ہی ہوں جس نے تجھے تمہاری آنکھوں کا نور، منہ میں زبان، کان میں سننے کی طاقت، جسم میں ہلنے کی طاقت، ہاتھوں میں چھونے کی طاقت دی، ذائقوں، رنگوں، موسموں، مزاجوں، کتابوں، کھانوں، خرابوں، عذابوں کا علم دیا اچھے اور برے کی پہچان کو پہنچاننے کی طاقت دینے والی ذات میں ہی ہوں جس نے ساتوں آسمان کو چھ دنوں میں بنایا، یہاں دھرتی کو بچھایا اور پھر لاکھوں سالوں سے وہاں انسانوں، حیوانوں، حشرات الارض کو بسایا سمندر کو کھارے پانی سے بھرا اوران کھارے پانیوں کے اندر ہزاروں طرح کی مخلوق کو زندگی دی۔ ان کی نسلیں چلائیں، ان کو مفید بنایا کچھ کو جسمانی طاقت سے نوازا کچھ کو ذائقہ دار کچھ کو بے ذائقہ بنایا۔ کچھ کو عقل و دانش سے ہم کنار

کیا اور کچھ کو عقل سے ماورا کر دیا، کچھ کو ماپنے اور جانچنے کے کام پر لگایا اور کچھ کو انسانی فلاح کے کاموں پر لگا دیا۔

اس عظیم رب نے آسماں کی چھت کو اپنا تخت بنایا اور زمین کو ہم انسانی مخلوق کے لیے فرش بنایا۔ پھر اس فرش کو رنگوں، ذائقوں، رشتوں اور موسموں سے رہنے کے قابل بنایا۔ زمین کو خطوں اور ملکوں میں بانٹا، براعظموں میں ڈھالا اور انہیں الگ الگ موسموں سے نوازا۔

خوب صورتیوں کو ان کا حصہ بنایا۔ مستقل تبدیلیوں سے زندگی کو حسین بنایا اور آسودگی سے بھر دیا۔ نہ صرف رنگوں، خوشبوؤں سے ہم کنار کر دیا بلکہ زمین کے سینے پر پہاڑوں کو میخوں کی طرح گاڑ دیا اور پھر انہی پہاڑوں سے پانی کے چشمے پیدا کر کے ندی نالے اور دریا بنا دیے۔ کہیں خشک بنجر بے آب و گیا صحراؤں میں زندگی پیدا کی اور کہیں پہاڑوں کی کھوہ میں رہنے والے درندوں، چوٹیوں پر بسیرا کرنے والے پرندوں اور بلوں میں رہنے والے حشرات الارض کی زندگی کے اسباب پیدا کیے۔ زمین پر دوڑنے والے چوپائے اور ہواؤں کا سینہ چیرنے اور کئی کئی ہزار کلومیٹر اڑنے کی طاقت والے پرندے بنائے، کہیں چیرنے پھاڑنے والے درندے بنائے تو کہیں آنکھوں کو حیرت میں مبتلا کر دینے والے دیوہیکل جانور بخشے، کہیں چار ٹانگوں سے بھاگنے والے اور کہیں دو ٹانگوں سے اڑنے پھرنے والے شتر مرغ بنائے، عظیم رب کی مرضی، خوشی، خواہش کو اپنے بچپن سے ہر ذرے میں بولتے دیکھا۔

وہ باکمال رب کے حسن انتظام سے برف کا گرنا، طوفانوں اور سیلابوں کا آنا، بجلیوں کا چمکنا اور کہیں مہینوں تک ایک قطرہ بارش کو بھی ترسانا، درختوں کی شاخیں، شاخوں پر پھول، پھولوں پر پھل، پھلوں میں ذائقے اور رنگوں سے بھرنا، وہ اسی مٹی سے میٹھا آم اگاتا ہے اسی پہ کھٹے لیموں اور کھٹے میٹھے کینو اگاتا ہے۔ اسی میں رس بھری، آلوچا اور آلو بخارہ اگاتا ہے اور اسی پر خوبانی، آڑو، سیب اور انار کی بہار دکھاتا ہے۔ ایک انار کو سو بیماریوں کا علاج بناتا ہے۔ اس کی جلد اس کے دانے، دانوں کی ترتیب اور پردوں، کیسا تھ حفاظت اور بناوٹ کے ساتھ بے پناہ ذائقہ کیا کہیں ہو سکتا ہے ایسا

خالق ! جو اپنی ہر تخلیق میں انوکھا، نرالا اور حیران کر دینے والا، ایک ہی پھل کے دانے۔ چیلنگ پر دے، رنگ ذائقے الگ اور انوکھے۔ سبز گھاس کھاتی گائے بھینس اور بکری کے تھنوں کو سفید رنگ کے صحت بھرے سیال، دودھ میں ڈھال دیتا ہے اور اسی گھاس کو کھانے والے ہرن کی ناف کو خوشبو میں بدل دیتا ہے، کسی جانور کی مادہ بچے کو جنم دیتی ہے تو ہفتوں اس کی حفاظت کے لیے اس کے پاس قیام کرتی ہے اور کہیں مادہ اسے اپنی گود میں بنی تھیلی میں چھپا کر قلانچیں بھرتی پھرتی ہے۔ اسی زمین میں بے ضرر اور خوب صورت کیڑے بیر بہوٹیاں۔

اور اسی دھرتی پر زہر کی تھیلیاں منہ میں لے کر رینگنے والے سانپ اور خون کالا کر دینے والے بچھو موجود ہیں۔ اسی زمین پہ ہر رنگ کے پھول ہیں اور اسی دھرتی پر زہریلے اور آدم خور پودے موجود ہیں، کہیں دھوپ کے پودے الگ بہار دکھائے ہیں اور کہیں سائے کے پودے گھر کے اندر، باہر الگ الگ، دکھنے کے الگ، دکھانے کے الگ، سوسو سال عمر پانے والے بھی اور ایک ذرا چھونے سے مرجھا جانے والے بھی اس قدر کی گنتی شمار مشکل۔ رینگنے والے، بھاگنے والے اڑنے والے، اڑانے والے، ڈرنے والے، ڈرانے والے قسم قسم کے پرندے، چرندے اور حشرات الارض جگہ جگہ موجود ہیں۔

ابھی اس کی کائناتوں کا شمار ممکن نہیں:

وہ کون ہے جس کی کائناتوں کا شمار ابھی تک ممکن نہیں ہو سکا، وہ کون ہے جس نے کالے پیلے گورے، گندمی، چھوٹے بڑے ہر رنگ و سائز کے مرد و عورت پیدا کیئے کہ جو کبھی فرشتوں سے قریب اور کبھی شیطانوں سے بڑھ کر اپنا آپ منواتے ہیں۔ اپنے ہونے کا احساس دلاتے ہیں، عمر بھر غلامی میں جینے والے، ہر لمحے آزادی کے سانس لینے والے، کبھی کچھ نہ کرنے والے اور ہر لمحے کچھ نہ کچھ کرنے اور کر کے دکھانے والے ...... یہ میرا رب ہی تو ہے جو دھرتی اور انسانی ذہنوں کو زرخیزی بخشتا ہے یا انہیں بنجر بناتا ہے۔ انہیں اچھے بُرے کی تمیز سکھاتا ہے۔ انسان کی اصلاح کے لیے کتابیں، صحیفے اتارتا اور نبی اور رسول بھیجتا تھا۔ اچھے کاموں پر انعام دیتا ہے اور برے کاموں پر توبہ

کا راستہ دکھاتا ہے۔ واپس بلاتا ہے آنے والوں کو جنت کا اور نہ آنے والوں کو نافرمانی پر دوزخ کا تحفہ عطا کرتا ہے۔

انکار کرنے والوں کی زندگی:

اس رب کا تصور انسانی زندگی کی اصل بنیاد بنتا ہے۔ شخصیت کو اس کے نور سے دیکھنا آ جاتا ہے۔ رب کے بھیجے رسول ﷺ کی راہنمائی اور اتاری کتاب قرآن عظیم انسانوں کو انگلی پکڑ کر چلنا، سوچنا، بدلنا سکھا دیتی ہے۔ انکار کرنے والوں کی الگ زندگی ہے اقرار کرنے والوں کا طرز کلام اور طرز حیات الگ ہے۔ درمیان میں رہ جانے والے کبھی منافق کبھی بزدل، کبھی ہارے ہوئے تو کبھی بچھڑے اور پچھڑے ہوئے کہلاتے ہیں۔

جس بچے بڑے کی زندگی کی سب سے بڑی اصل، محبت اور بنیاد رب، مالک اور خالق بن جائے اس کی ہر سوچ، ہر رشتہ، ہر آمدن، ہر خرچ، ہر نیکی، ہر اچھائی، اسی کی خوشی رضا اور مرضی کے مطابق ہوگی اسی کی زندگی سمندر کے بیچ میں جہازوں کو راستہ دکھانے والے لائٹ ہاؤس جیسی ہوگی۔

مغرب کے اندھی پیروی کرنے والے بیچارے دانشور:

میں کتنے ہی ایسے دانشوروں اور اساتذہ کو جانتا ہوں کہ جب وہ اللہ کی قدرت، اس کے اعلیٰ ذوق اور بے مثل تخلیق کو دیکھتے ہیں تو بیچارے بہت تکلیف میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ دل پر پتھر رکھ کر کہیں گے تو یہ کہ قدرت نے یہ کر دیا، قدرت نے وہ کر دیا۔ قدرت اصل میں نیچر کا ترجمہ ہے جسے خدا کو نہ ماننے والے اپنی سہولت کے لیے لکھتے ہیں۔ اب چونکہ مغرب سے یہ لفظ آیا ہے، مغربی مصنفوں نے لکھا ہے تو ہمارے دانشوروں کا ان پر تو ایمان لانا لازم ہے، اس لیے دل کچھ اور ہی کہہ رہا ہو، روح احتجاج کر رہی ہو، پورا جسم گواہی دے رہا ہو تو بھی اللہ، رب العالمین کا نام نہیں لینا۔ اب ان کو بیچارہ نہ کہوں تو کیا کہوں۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ بہت سے معصوم اور کم فہم ان کی باتوں کی وجہ سے جب اپنے رب کی انکار کر بیٹھتے ہیں تو کیسے ان کی زندگی بے فیض ہو کر رہ جاتی ہے۔ اب جس کا خدا ہی نہ ہو اس کی زندگی کیسی ہوگی اور ہوتی ہے اس کا اندازہ لگانا کیسے مشکل ہو سکتا ہے۔ بے خدا لوگوں کا

پہلے صرف سنتے تھے اب ایسے بدقسمت دیکھنے کو بھی مل جاتے ہیں۔ گزشتہ دنوں ایک ایسے ہی آدمی سے ملاقات ہوئی تو اس نے بتایا کہ کیسے اس نے اپنی بیوی کو بھی خدا کے انکار پر قائل کیا، اس کی گفتگو سے لگا کہ اب یہ اس کی زندگی کا مشن بن چکا ہے اور ایسے ہی لوگوں سے اس کی دوستانے اور یارانے ہو چکے ہیں، خدا اپنے منکروں کو بھی کس آسانی کے ساتھ خود سے دور جانے اور جینے دیتا ہے میرے لیے اسے سمجھنا اب بھی اتنا آسان نہیں ہے۔ انسان کو جس ذات نے بنایا، اس نے اس کی ضرورتیں بھی رکھیں اور اس کے بڑھنے، پھلنے پھولنے کے انداز بھی طے کئے۔ اب بھلا کوئی مخلوق اپنے خالق کی مرضی سے ہٹ کر کیسے پروان چڑھ سکتی ہے، اپنی بنائی ہوئی فطرت سے کیسے بغاوت کر سکتی ہے۔

قبرستان میں گزری ایک رات:

انسانی شخصیت کی اساس میں اپنے مالک اور خالق کا تصور اور اس ہدایت کا عمل دخل اس قدر زیادہ ہے کہ اس کے بنا خود شناسی کا پورا تصور مکمل ہی نہیں ہو پاتا۔ ہر انسان ترقی، خوشی، خوشحالی کا خواہش مند ہے۔ خالق اس کے حصول کا راستہ بتاتا ہے۔ اپنے نفس کا تجزیہ سکھاتا ہے۔

میں ان دنوں سکول مکمل کر چکا تھا۔ جب جمیعت کے دوستوں نے بتایا کہ رات شب بیداری ہوگی، اللہ جانے شب بیداری کیا ہوگی، نہ پہلے کبھی نام سنا تھا نہ شرکت کی تھی۔ چشتیاں میں پاک پبلک ہسپتال میں پروفیسر خالد سعید، خلیل اور شفیق تینوں بھائیوں کا گھر شب بیداری کے لئے میسر تھا۔ پہلے درس قرآن ہوا۔ فکر آخرت پر اللہ کی انسانوں کی سیرت و کردار کے حوالے سے پسند ناپسند بتائی گئی پھر احادیث کی روشنی میں قیامت کی علامات، وہاں کی مشکلیں، سزائیں اور عذاب کی تفصیل تھی، اس کے بعد نوافل پڑھائے گئے، رات 12 بجے کے قریب بیس پچیس لڑکوں کے اس قافلے کو لئے ناظم صاحب خراماں خراماں ایک قبرستان کی طرف روانہ ہوئے۔

راستے میں بتانے لگے کہ الگ الگ قبر پہ جانا ہے۔ اکیلے دعا کرنی ہے۔ باہم باتیں نہیں کرنی اور قبر اگر ٹوٹی ہو تو زیادہ بہتر ہے۔ پھر اپنے رب کے آگے گڑگڑائیں۔ اس قبر والے انجان کیلئے دعا کریں۔ اپنے نفس کا تجزیہ کریں، تزکیہ کریں۔ اور اپنے حال اور مستقبل کے لیے فکر کریں۔ کیونکہ

رب رحمان نے فرمایا:

ترجمہ: ''نفس انسان کی اور اس ذات کی قسم، جس نے اسے ہموار کیا، پھر اسکی بدی اور اسکی پرہیزگاری اس پر الہام کر دی۔ یقیناً فلاح پا گیا وہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا۔ اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو دبا دیا'' الشمس (7-10)

اس وقت تو تزکیے اور تجزیے کے لفظ بڑے بڑے لگ رہے تھے اور پوری طرح مفہوم واضح نہیں ہو رہا تھا مگر قبرستان میں گزری وہ رات میری زندگی سے کبھی نہ نکل سکی۔ وہاں کچھ وقت گزارنے کے بعد زندگی کی بے ثباتی، بے وقعتی سامنے تھی۔ خوف سے رونا بند نہ ہوتا تھا۔ میں سسکیاں لیتا اور دعائیں کرتا رہا کہ مولا کبھی ناراض نہ ہونا۔ زندگی جیسی تجھے پسند ہے، بس اسی پر چلانا، غلطیاں، کوتاہیاں کسی پہاڑ جتنی بھی ہوں تو معاف کر دینا۔ نہ صرف بُرے انجام سے بچانا بلکہ اپنے ناپسندیدہ بندوں اور کاموں سے ہمیشہ بچائے رکھنا، سوچوں کو پلٹ کر رکھ دینے والی اس رات واپسی پر بھی کی آنکھیں سرخ اور سوجھی ہوئی تھیں۔ اس ایک رات نے خودشناسی کی نئی دنیا میں پہنچا دیا تھا۔

آنے والے دنوں میں اللہ سے تعلق دو مرحلوں میں بنا اور خوب بنا۔ خوف سے شروع ہونے والا یہ تعلق پھر خوف والا نہیں رہا، محبت والا بن گیا۔ اللہ تعالیٰ میرے لیے اللہ جی ہو گئے اور دنیا کی ہر چیز اور رشتے سے محبوب اور عزیز بن گئے۔ اس نئے تعلق اور تصور نے پوری زندگی بدل کر رکھ دی۔ میں نے نوٹ کیا کہ ہر نوجوان، بڑا بزرگ، جس جس کا تصور خدا واضح اور مضبوط ہے، اتنا ہی اس کی ذات کا شجر سایہ دار، گھنا اور پھل دار ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ زندگی میں کبھی غلطی نہیں ہوئی، کتنی ہی چھوٹی بڑی کوتاہیاں، غلطیاں سرزد ہوئیں مگر کبھی غلطی کا جواز نہیں ڈھونڈا۔ یہ بات بچپن میں سمجھ آ گئی تھی کہ غلطی انسانوں سے ہوتی ہے، رب کو انسانوں کا غلطی کرنا پسند ہے، ان کا غلطی سے پلٹنا محبوب ہے مگر غلطی کو نہ دہرانا عزیز ہے، غلطی ماننا عزیز ہے، اس پر ڈٹ جانے کو وہ گستاخی سمجھتا ہے اور ناراض ہوتا ہے۔ یہ کام کبھی نہیں کرنا، اس تصور نے پھر زندگی بھر یہ کام نہیں کرنے دیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کیوں رو دیں:

اس رات آنحضور ﷺ کی اہلیہ حضرت عائشہؓ کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ حدیث کی مشہور کتاب ''ابوداود'' میں اس کی تفصیل بیان ہوئی ہے کہ ایک روز حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو کچھ یاد آیا تو وہ بے اختیار رو دیں۔

آنحضور ﷺ نے پوچھا ''تمہیں کس چیز کی یاد رلا رہی ہے''

کہنے لگیں۔''اے اللہ کے رسول ﷺ! مجھے جہنم کی یاد اور آگ نے رلا دیا۔ یہ بتایئے قیامت کے دن آپ اپنی بیویوں کو یاد رکھیں گے؟''

رسول خدا ﷺ نے فرمایا'' عائشہ رضی اللہ عنہا! تین مواقع ایسے نازک ہوں گے کہ کوئی کسی کو یاد نہ کرے گا۔ یاد رکھ ہی نہیں سکے گا۔

1۔ ایک اس روز جب سب سے ان کے اعمال کا حساب لیا جا رہا ہوگا۔ اعمال تولے جا رہے ہوں گے تو ہر کسی کو فکر ہوگی کہ اس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوتا ہے یا ہلکا۔

2۔ دوسرا نازک موقع وہ ہوگا جب نامہ اعمال ہاتھ دیا جائے گا اور کہا جائے گا۔ کہ آؤ اور پڑھو اپنی کتاب زندگی، ہر ایک فکر مند ہوگا کہ اس کا نامہ اعمال داہنے ہاتھ میں دیا جاتا ہے یا بائیں ہاتھ میں پیٹھ کے پیچھے سے۔

3۔ اور تیسرا نازک موقع وہ ہوگا جب پل صراط سے گزرہو گا اور پل صراط جہنم کے اوپر رکھا جائے گا۔''

چند برسوں کے بعد قرآن پاک کی تفسیر پڑھتے ہوئے جب ''فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِیْنُهٗ فَهُوَ فِیْ عِیْشَةٍ الرَّاضِیَة '' پس جس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا وہ دل پسند عیش میں ہوگا۔ اور جس کا پلڑا ہلکا اور بے وزن ہوگا اس کا ٹھکانہ جہنم کی دہکتی ہوئی آگ ہوگا۔'' وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِیْنُهٗ فَاُمُّهٗ هَاوِیَه '' اللہ کے رسول ﷺ کی کھینچی یہ تصویر بہت کچھ سکھا گئی۔ اُمت کی ماں جس بات سے خوفزدہ ہو کر رو پڑے، اس کی اہمیت اور نزاکت کا سوچ کر انسان کیوں کانپ نہیں جائے گا۔ یہی

تصور واضح ہو تو زندگی بھر ہر سوچ اور عمل کی بنیاد بنتا ہے۔

کیوں تمہارے دل کی کیا کیفیت ہے:

ایس ای کالج بہاولپور کے اندر ایک چھوٹی سی مسجد تھی جہاں کالج کے دونوں ہاسٹلز میں رہنے والے طلبہ نماز کے لیے آتے تھے۔ یہ 80ء کی دہائی کا آغاز تھا جب ایک روز عصر کے بعد ناظم صاحب نے حدیث پڑھی۔ عصر کے بعد مطالعہ احادیث کو نظام العصر کہا جاتا تھا۔ برسوں تک جمعیت کے تحت نظام العصر قائم رہا۔ جامع ترمذی حدیث کی چھ اہم کتابوں میں سے ایک ہے، اس کا حوالہ تھا کہ حضرت انسؓ نے جو اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ اپنے بچپن سے ہی جڑ گئے تھے نے روایت کی کہ نبی مہربانؐ ایک نوجوان کے پاس ان آخری گھڑیوں میں پہنچے جب وہ مرنے کے قریب تھا۔

آپؐ نے پوچھا ''کہو تمہارے دل کی کیا کیفیت ہے''

نوجوان نے کہا ''خدا گواہ ہے اے اللہ کے رسولؐ مجھے اس رب سے رحم کی بھی امید ہے اور اپنے گناہوں سے بھی لرز رہا ہوں۔''

اللہ کے رسولؐ نے فرمایا

''موت کے ان لمحوں میں جس دل میں خدا سے رحم اور گناہوں کے خوف سے لرزنے کی یہ دونوں کیفیتیں جمع ہوں گی۔ ایسے شخص کو اللہ ضرور کچھ عطا کرے گا جس کا وہ امیدوار ہے۔ اسے ضرور عذاب سے بچائے گا جس سے وہ ڈر رہا ہے۔''

میں نے محسوس کیا کہ میرے گال گیلے ہو رہے ہیں:

اس حدیث نے اللہ کی مہربانی اور کرم نوازی کا ایک مضبوط نقشہ ذہن میں بٹھا دیا، اور میری سوچ کے دھاروں کو ایک واضح رخ عطا کر دیا۔ اس کا اندازہ مجھے چھ سات سال کے بعد تب اور بھی زیادہ ہوا جب میں پنجاب یونیورسٹی لاہور میں پبلک ایڈمنسٹریشن میں ایم اے کر رہا تھا۔ ایک روز پنجاب یونیورسٹی کے ہاسٹل نمبر 7 جہاں میں ان دنوں رہتا تھا۔ مستنصر حسین تارڑ کا ڈرامہ ''ہزاروں راستے'' کی آخری قسط دیکھ کر نکلا، موٹر سائیکل پر سوار اچھرے ہمقدم کے دفتر جا رہا

تھا جس کا تب میں ایڈیٹر تھا۔ نہر کے کنارے رات کی خاموشی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرے گال گیلے ہو رہے ہیں آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ رہے تھے۔ ڈرامے کی ہیروئن مشال (روبینہ اشرف) بیماری سے مرنے والی تھی۔ میں نے سوچا اگر مجھے علم ہو جائے کہ ایک ماہ بعد مر جانا ہے تو کیا محسوس کروں گا۔ کیا کیفیت ہوگی۔ کیا کیا کام نمٹاؤں گا، کس کس کو اطلاع کروں گا۔ دل میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا فرمان پختگی سے لکھا تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے تین دن پہلے وصیت فرمائی۔

"دیکھو! تم میں سے ہر ایک کو اس حالت میں موت آئے کہ وہ خدا سے خوش گمان ہو۔"

میں زار و قطار رو رہا تھا۔ یاماہا موٹر سائیکل پوری رفتار سے بھاگ رہا تھا اور میرا یقین، میرے خیالات سے بھی زیادہ رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ میرا دل، میری روح، پوری طرح اطمینان سے بھری تھی کہ میری تو زندگی کی سب سے بڑی محبت، یقین اور سہارا ہی میرے اللہ جی ہیں۔ میں تو خوش گمانی کے علاوہ کچھ اور افورڈ ہی نہیں کر سکتا تھا۔ اس حکم اور فرمان پر پورا اترنے کی بہر حال خوشی تھی۔ ساتھ ہی خیال نے دامن پکڑ لیا کہ ہم کتنے بھی اچھے اور نیک ہو جائیں۔ اللہ معاف کرے ہم کیا اور ہماری نیکیوں کی اوقات کیا۔ مالک اور آقا کے ساتھ جس قدر بھی محبت کی جائے، وفاداری کی جائے کم ہے۔ تعلق کا دعویٰ تو ایسا ہی ہے کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ، اس تعلق کی مضبوطی اپنی جگہ پر مگر اس کی نزاکت اور حساسیت سے بھی نظر نہیں چرائی جا سکتی۔ مالک اور خالق خدا ہے۔ اور وہ بہت بڑا ہے وہ اپنی مرضی اور منشا سے ہم انسانوں کو زندگی دیتا ہے۔ عزت دیتا ہے، محبت دیتا ہے۔ اور عمل کی آزادی دیتا ہے، اور جزا اور سزا کے فیصلے سے پہلے 70،80 سال کی عمر دیتا ہے۔ قرآن عظیم کی سورہ المعارج کی چند آیات ایسی ہیں جو دل دہلا دیتی ہیں۔ رونگٹے کھڑے کر دیتی ہیں۔

فرمایا "اور کوئی جگری دوست، اپنے جگری دوست کو نہ پوچھے گا حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھائے جائیں گے۔ مجرم چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے بچنے کے لیے اپنی اولاد کو، اپنی بیوی کو، اپنے بھائی کو، اپنے قریب ترین خاندان کو جو اسے پناہ دینے والا تھا اور روئے زمین کے سب لوگوں کو فدیہ دے دے اور یہ تدبیر اسے نجات دلا دے۔ (مگر ایسا ہر گز ہر گز ہوگا نہیں)"

یقیناً یہ ان کے لیے وعید ہے جو عمر بھر اپنے رب کو، اس کی پسند اور احکام کو بھولے رہتے ہیں۔ جن کو رب عزیز ہے۔ اس کی قربت عزیز ہے، ان کے لیے اس خالق کی مہربانی اور عطا کا مزہ، خوشی اور بدلہ ہی اور طرح کا ہوگا۔ ان کی زندگی ہی اور طرح کی ہوگی۔

ایک مختصر سی بات نے ایمان کا مزہ چکھادیا:

1980 ہی وہ سال ہے جب میں نے شعوری طور پر ایمان کا مزہ چکھا اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ بن عبدالمطلب یعنی آنحضورؐ کے محترم اور عزیز چچا کی روایت کے مطابق (یہ صحیح مسلم میں درج ہے) آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا۔

''اس شخص نے ایمان کا مزہ پالیا جو اللہ کے رب ہونے، اسلام کے دین ہونے اور محمدؐ کے رسول ہونے پر دل سے راضی اور مطمئن ہوگیا'' کے مصداق میں ایمان کے اس مزے سے ہم کنار ہوگیا اور اپنے کتنے ہی جاننے والوں کو اس سے آگاہ کیا۔ وہ دن اور آج کا دن، میری کسی سوچ، کسی خیال، کسی فکر، کسی ہدف، کسی تحریر میں اس مزے کے سوا کچھ نہیں، اس ایک مختصر سی بات نے سوچ کے دھاروں کا رخ متعین کردیا۔ خودشناسی کی نئی رفعتوں سے واقف کرادیا۔

انہی کی وجہ سے احادیث سے تعارف ہوا

نوجوان طلبہ کے لیے حدیث کی کتابیں مرتب کرنے والوں مولانا محمد یوسف اصلاحی (گلدستہ حدیث) مولانا عبدالرزاق کوڈووای (مشعل راہ) مولانا عبدالغفار حسن (انتخاب حدیث) مقبول حسین (احادیث صحیحہ) سے اللہ جی خوش ہوں انہی کی وجہ سے احادیث سے تعارف ہوا اور پھر میں نے خود بازار جاکر اپنے لیے امام مالک کی ''موطا امام مالک'' خریدی۔ مشکواۃ شریف خریدی، اس کے کچھ عرصے کے بعد مکتبہ تعمیر انسانیت کے جناب سعید اللہ صدیق نے صحیح بخاری کی تین جلدوں کا تحفہ دیا'' صحیح مسلم کی تین جلدیں میں نے خود خریدلیں یوں اللہ کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے جاننے کا قیمتی موقع اور سامان میسر آیا، صحیح مسلم کی ایک حدیث نے تو زندگی کو خوشی سے بھردیا۔

حضرت عثمان بن عفان کا بیان تھا کہ آنحضورؐ نے فرمایا'' جو شخص اس حال میں مرا کہ اسے یہ یقین تھا

کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے تو وہ جنت میں داخل ہو گیا''

میں گزشتہ چار دہائیوں سے دل کی گہرائیوں سے اس بات کی گواہی بھی دے رہا ہوں اور اسی حالت میں مرنے کا یقین بھی رکھتا ہوں۔

ایک دوسری حدیث میں لکھا تھا ''دل سے وہ اس حقیقت کو سچا مانتا تھا اور اسے یقین تھا''

''مُسْتَيقِيضاً بِهَا قَلْبُهُ صِدْقاً بِهَا قَلْبُهُ''

سو مجھے اپنے رب کے سامنے جاتے ہوئے پورا یقین ہے کہ میں نے ایمان کا وہی مزہ چکھ لیا ہے جس کا میرے پیارے رسول محترم ﷺ نے ذکر فرمایا تھا۔

صحیح مسلم میں ہی حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کی ایک روایت بھی آئی ہے۔ فرمایا

''میں نے نبی ﷺ کو فرماتے سنا جو شخص اس کی شہادت دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں، اس پر اللہ جہنم کی آگ حرام کر دیتا ہے۔''

یہ شہادت تو کلمہ پڑھنے سے شعوری مسلمان ہونے تک بھی دی اور شعور کی منزل سنبھالنے سے آخری سانس تک دیتا رہوں گا اور یہی خواہش ہے کہ میرا ہر قاری، مجھ سے محبت کرنے والا اور یہ کتاب پڑھنے والا رب کے ہاں اسی سرخروی سے ہمکنار ہو۔

خدا کا حسن سلوک:

خدائے مہربان سید ابوالاعلیٰ مودودی جناب خرم مراد، اشفاق احمد قدرت اللہ شہاب اور ممتاز مفتی پر مہربان رہے۔ ان بزرگوں نے بھی خدا کے تصور سے متعارف کروانے اور اسے گہرا کرنے کا بہت کام کیا۔ تفہیم القرآن نے تو پہلی بار سمجھایا کہ قرآن کا موضوع ہی انسان ہے۔ کسی کتاب کا موضوع سمجھ آ جائے تو کتاب سمجھنا آسان تر ہو جاتا ہے۔ خدا اپنے ماننے والوں سے کیسے خوش ہوتا ہے، کن باتوں سے ناراض ہوتا ہے؟ اسے کیسے لوگ اچھے لگتے ہیں اور کیسے برے؟ کن امتوں کو اس نے ناراض ہو کر صفحۂ ہستی سے مٹا دیا اور کن باتوں پر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا ہے؟ یہ ساری باتیں علم میں نہ ہوں تو کوئی انسان کبھی بھی تصور خدا اور تصور خالق کا صحیح ادراک نہیں کر سکتا، قرآن

پاک میں ہامان کی موت کا عبرت اثر واقعہ پڑھا تو وہ بہت سکھا گیا۔ ہامان بہت امیر آدمی تھا، مگر اس کی موت بڑی کرب ناک ثابت ہوئی۔ کیونکہ وہ انسانوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتا تھا۔ اللہ نے اپنے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے اسے متوجہ کیا تھا۔

اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ عَلَيْكَ

''جس طرح خدا نے تیرے ساتھ حسنِ سلوک کیا ہے تو بھی لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کر''

لیکن ہامان نے حضرت موسیٰ کے ذریعے ملنے والے اللہ کے پیغام کو ماننے کی بجائے بڑے تکبر بھرے انداز میں اپنے دل میں چھپی وہ اصل بات کہہ دی جس نے رب کو اس قدر ناراض کیا کہ اس نے اسے زمین میں دھنسا کر بدترین موت سے بھی ہمکنار کر دیا۔

فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ '' پس ہم نے اسے اور اس کے گھر کو زمین میں دھنسا دیا''۔ ان آیات سے سیکھا کہ خدا کو جہاں انسانوں کے گناہ ناراض کرتے ہیں وہاں ان کا گستاخانہ رویے اور تکبر بھری سوچ اس کے غصے کو بڑھانے اور آتشِ غضب کو بڑھکانے کا باعث بنتے ہیں۔

اس سرخ لائن کی طرف قدم ہی نہیں بڑھانا:

سو عمر بھر اس بات کا خیال رکھا کہ اس سرخ لائن کی طرف قدم ہی نہیں بڑھانا جس کے بعد خطرہ شروع ہوتا ہے۔ ہامون کا جواب تکبر کا وہ عظیم نمونہ ہے جو خود شناسی سے محروم کسی بھی انسان کا کلام ہو سکتا ہے۔ اپنی بدبختی کو آواز دیتے ہوئے اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جواب دیا۔

اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ

''مجھے تو جو کچھ ملا ہے میرے علم و ہنر کی بدولت ملا ہے۔ مجھ پر تیرے رب کا کیا احسان ہے؟

آنحضورؐ نے اسی لیے ایک موقع پر اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کی تربیت کرتے ہوئے فرمایا جسے ابوامامہ نے روایت کیا اور طبرانی نے اسے نوٹ کیا۔

''الف۔ لوگوں کے ساتھ حسن سلوک بری موت سے بچاتا ہے

ب۔ چھپا کر دیا جانے والا صدقہ ناراضی رب کی آتش کو بجھاتا ہے۔

ج۔اور صلہ رحمی سے عمر میں برکت ہوتی ہے''

یوں وہ سارے متکبر لوگوں کا سردار بن گیا:

حقیقت یہ ہے کہ سیکھنے اور بہترین صلہ پانے کے لیے ان تینوں باتوں میں بے پناہ کشش ہے۔ان کی خاطر انسان خوشی خوشی حسن عمل کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔کیونکہ ہر انسان کی اچھی اور بری موت کا انحصار اور دارومدار انہی پر ہے۔خاتمہ ایمان پر اور سلامتی سے ہو تو انسان کو اور کیا چاہیے۔اللہ کے رسول ﷺ نے اسی کی بشارت دی اور اس کی ترغیب،اسی طرح تکبر کی حقیقت واضح ہوئی کہ 'اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْصًا'

تکبر حق کے مقابلے میں اکڑنے اترانے اور لوگوں کو حقیر سمجھنے کا نام ہے

عَنْ عَبْدُاللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ: ''لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِيْ قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ''

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہو سکے گا۔(متفق علیہ)

''شیطان کے کردار پر بھی غور کا موقع ملا کہ وہ اللہ کو اپنا مالک خالق اور رب کہتا تھا۔رب کہہ کر بلاتا تھا مگر جب اس نے آدم کو سجدے کا حکم دیا تو تکبر اور سرکشی کو اختیار کیا،اللہ جی نے قرآن میں فرمایا: اس نے انکار کیا اور تکبر میں مبتلا ہوا۔

یوں بدقسمتی کو اس نے اپنا ساتھی بنایا اور دنیا کے سارے متکبروں اور سرکش لوگوں کا آقا جن اور سردار بن گیا۔وہ پہلا متکبر تھا آخری نہیں۔

خود شناسی کا علم یہی کہتا ہے کہ اس راستے،سوچ اور عمل کو دور سے سلام جس کے آخر میں بدبختی کھڑی ہو۔اچھا خاصا معزز فرشتہ تھا جب خالق کا تصور بدلا اور اسے لگا کہ میں بھی اپنی مرضی اور پسند سے فیصلے کرنے کا اختیار رکھتا ہوں اور خالق سے ہٹ کر مرضی چلا سکتا ہوں تو ساری پوزیشن ہی بدل گئی۔

ثابت ہوا کہ عزت جھکنے اور رب کی ماننے میں ہے۔اس کے سامنے اپنی چلانے اور اس کے

حکم کے انکار میں نہیں، ساری کی ساری نیکی مرتبہ اور مقام دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے، یہ تصور خالق ہی ہے جو انسان کو اس کی اوقات میں رکھتا ہے، چار کتابیں پڑھ کر وہ اپنے مقام اور مرتبے کو نہ بھول بیٹھے۔ جناب خرم مراد کے کہنے پر ہم لوگ ذکر کی طرف متوجہ ہوئے اور ممتاز مفتی کے بتانے پر اللہ کا ایک دوستانہ روپ نظر آنے لگا۔ جناب اشفاق احمد نے بھی بہت دلوں کو اللہ کی محبت سے روشناس کرایا، تعلق بڑھایا، اللہ جی ان سب کے لیے آسانیاں اور مہربانیاں کرے۔

اللہ کے رسول ﷺ کا خصوصی شکریہ:

جب ہم طالب علم ہوتے ہیں تو سوچ، تصور اور پسند کچھ اور ہوتی ہے اور جب ہم خود استاد بنتے ہیں تو ہر چیز مقام اور پوزیشن کے بدلنے کے ساتھ بدل چکی ہوتی ہے۔ کل جو باتیں اور شرارتیں باعث خوشی اور باعث فخر تھیں اب وہ غصہ دلانے والی اور نظروں سے گرانے والی ٹھہرتی ہیں۔

میرے ابو چونکہ استاد تھے تو میں ان کی عزت کے لیے ہمیشہ بہت پکی یعنی حساس رہا۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے کبھی زندگی میں اپنے کسی استاد سے بحث کی ہو۔ اس کی کسی بات سے انکار کیا ہو یا اس کی غیر موجودگی میں اس کی بدتعریفی کی ہو جو عام طور پر غیبت اور چغلی میں بدل جاتی ہے یہ اتفاقی نہ تھا۔ شعوری تھا۔ خود استاد بنا بچوں نے کسی کی شکایت کی تو بھی مسئلہ حل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی برین واشنگ ضرور کی، انہیں مقام اور مرتبے کی فضیلت اور فرق بتایا۔

تصور رب اور تصور خالق اصل میں مقام اور مرتبے کو سمجھنے اور پھر اپنا مقام اور پوزیشن طے کر کے زندگی بسر کرنے اور اپنی شخصیت کی تعمیر کرنے کا ہی نام ہے۔

ایک زمانہ میں یہ سمجھنا بہت مشکل لگتا ہے کہ نیکی کیا ہے۔ بدی کیا ہے، اچھا کیا ہے اور برا کیا ہے۔ کون سا برا زیادہ برا ہے اور کوئی سا برا کم برا ہے، کیسے پتا چلے کہ جو کام کیا ہے وہ نیکی ہے بھی کہ نہیں؟

اس پریشانی سے سارے ہی گزرتے ہیں۔ میں نے بھی یہ دن دیکھے پھر مسند احمد میں حضرت ابوامامہ نے یہ مشکل حل کرادی۔ ایک شخص کا واقعہ لکھا جس نے اللہ کے رسولؐ سے پوچھا تھا۔

''ایمان کیا ہے؟''

آپ نے کمال محبت سے فرمایا

''جب تمہاری نیکیوں سے تمہیں کوئی خوشی ہو اور تمہاری برائیوں پہ تمہیں ناگواری ہو تو سمجھ لو تم مومن ہو''

اِذَا سَرَّتْکَ حَسَنَتُکَ وَسَاءَ تْکَ سَیِّئَتُکَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ

کتنی ہی بار اللہ کے رسول کا شکریہ ادا کیا کہ انہوں نے اپنے خالق کی رضا کا آسان راستہ بتا دیا۔ ایک آسان اور قابل فہم پیمانہ بتا دیا کسی بھی کام کے دوران ہی اس پیمانے کے مطابق دل کی خوشی کی سوئی اوپر نیچے ہو کر بتا دیتی ہے کہ مسرت ہو رہی یا دل پر بوجھ آ رہا ہے۔

اسی طرح مسند احمد بن حنبل میں ایک اور معیار اور پیمانہ عنایت کر دیا، یہ بھی تصور خالق کی بنیاد ہے۔

فرمایا: ''اپنے ضمیر سے پوچھ لیا کرو۔ جس چیز پر تمہارا ضمیر مطمئن ہو اور دل ٹھہر جائے وہ جائز اور جس بات پر دل نہ مانے، دل میں کھٹک محسوس ہو۔ اس سے بچو چاہے لوگ تمہیں اس کے جواز کا فتویٰ ہی کیوں نہ دے دیں''

اس واقعہ نے تو مجھے اندر سے ہلا کر رکھ دیا:

زندگی میں دو تین ایسے واقعات ہوئے جنہوں نے صحیح معنوں میں مجھے ہلا کر رکھ دیا ان کا تعلق بھی تصور خدا اور اس کی اطاعت اور اپنی مرضی اور تشریح سے تھا۔ ایک سکول فیلو بے حد لمبا تڑنگا تھا۔ اس کے ہاتھ اور پیر کسی جن کی طرح لگا کرتے تھے، اس نے میٹرک بھی مکمل نہیں کیا اور بیرون ملک جا کر بڑے ٹرالر کا ڈرائیور بن گیا۔ اچھی خاصی کمائی ہوتی تھی۔ واپس آ کر اس نے ڈیرہ بنایا اور ڈاکے ڈالنا شروع کر دیے۔ تب زمینوں پر قبضوں اور اغوا برائے تاوان کا رواج نہیں تھا۔ اگر تھا بھی تو ہمیں خبر نہیں تھی۔ اس سے ایک بار گاؤں میں ملاقات ہوئی تو اس نے بڑی مضبوط دلیل دی کہ

''برا کیا ہے روزی کما رہا ہوں۔ اللہ نے بڑے بڑے ہاتھ پاؤں بنائے ہی اس لیے ہیں کہ بڑے بڑے ہاتھ ماروں، اللہ نہ چاہتا تو مجھے ایسے ہاتھ پاؤں، حوصلہ اور سوچ نہ دیتا''

تب عقل سمجھ بھی اتنی نہیں تھی۔ سن کر خاموش ہو گیا۔ بعد میں وہ ایک ڈاکے کے دوران مارا گیا۔ اس کے بڑے سے منہ پر برسٹ لگا تھا اور پورا منہ ہی اُڑ گیا تھا۔

بدقسمتی سے مزنگ بڑے بڑے ''گڑبڑ گوٹالا'' کاموں کا مرکز:

میں چاہنے کے باوجود اس منہ سے نکلی تشریح کو نہیں بھول پایا۔ لاہور آ کر ایک نوجوان سے دوستی ہو گئی۔ وہ لاہور ہی کا تھا۔ مزنگ میں رہتا تھا۔ بدقسمتی سے مزنگ بڑے بڑے ''گڑبڑ گوٹالا'' قسم کے ناجائز کاموں کے لیے مشہور ہے'' ناجائز بچوں کی پیدائش اور ان کی اموات کے مراکز بھی ادھر ہی زیادہ تھے۔ جوئے کے اڈے خاص کر کرکٹ پر جوئے کا عالم تو یہ تھا کہ عام ریڑھی والے سے لے کر کھوکھے اور دکان والا بھی یہاں پر پیسے لگاتا اور جوئے کا حصہ بنتا۔ کہا جاتا ہے کہ مشہور کرکٹر وسیم اکرم کا بھائی بھی یہیں اس غلیظ کام کا حصہ تھا۔ جس کی وجہ سے ایک زمانے میں جواریوں نے رقم نہ دینے پر اس کے گھر پہ دھاوا بول دیا تھا اور اس کے والد کے سر پر بھی پتھر لگے تھے اور انہیں گھر چھوڑنا پڑا تھا۔ بعد میں جوئے کے الزامات کے باعث وسیم اکرم پر پابندی بھی لگا دی گئی تھی۔ خیر اس نوجوان نے یہاں وی سی آر پہ فلمیں کرائے پر دینے کی دکان کھول لی۔ بے حد تمیز دار، خوب صورت اور خوش شکل تھا۔ اخلاق کا بھی اچھا تھا اور نگاہ کا بھی، آ کر بتایا کرتا کہ لڑکیاں بہت آتی ہیں، ہی ڈیز لینے، ان کے لیے الگ سی ڈیز رکھتا ہوں۔

''وہ کیوں؟'' میں نے حیرت سے پوچھا تھا۔ اس کا جواب تھا ''وہ نیوڈ فلمیں ہوتی ہیں۔ سب کو نہیں دے سکتا۔ ان کے پیسے زیادہ ملتے ہیں۔ اچھی کمائی ہو جاتی ہے''۔ میں اچھی کمائی کا لفظ سن کر کانپ کر رہ گیا تھا۔ اسے سمجھانے سے پہلے خود سمجھنا بے حد ضروری تھا کہ میرا خالق اس کمائی کے معاملے میں کیا پسند کرتا ہے، کیا چاہتا ہے اور کس بات کی ترغیب دیتا ہے۔

حدیث کی مشہور کتاب ابن ماجہ میں اللہ کے رسول کی راہنمائی ملی

''لوگو! اللہ کی نافرمانی سے ڈرتے رہو۔ روزی کی تلاش میں غلط طریقے مت اختیار کرو۔ اس لیے کہ کوئی شخص اس وقت تک مر نہیں سکتا، جب تک وہ اپنے حصے کی روزی پوری نہ کر لے ہوسکتا ہے۔ اس کے ملنے سے کچھ تاخیر ہو جائے تو خدا سے ڈرتے رہو اور روزی حاصل کرنے میں اچھے طریقے اختیار کرو۔ حلال روزی کماؤ۔ حرام روزی کے قریب بھی نہ جاؤ''

اس حدیث کی روشنی میں اس کا کاروبار کسی طور پر بھی مناسب نہیں تھا۔ قرآن پاک سے مدد لی تو علم ہوا کہ خود خالق تو یہ کہہ رہا ہے۔

''اے رسولو! پاکیزہ روزی کھاؤ اور نیک اعمال کرو''

اللہ صرف پاکیزہ مال ہی قبول کرتا ہے:

حکم ظاہر تھا کہ نیک اعمال ہوں گے تبھی جب دل میں خالق اور مالک کی محبت ہوگی۔ اور رزق کمانے کے طریقے، ذرائع جائز اور حلال ہوں گے، پاکیزہ ہوں گے تو ہی دل مطمئن ہوگا۔ دل جھکے گا۔ مزید مطالعہ کیا تو پتہ چلا کہ مشکواۃ میں حضرت رافع بن خدیج سے روایت آئی کہ اللہ کے رسول سے پوچھا گیا سب سے اچھی کمائی کون سی ہے؟'' آپ نے فرمایا

''آدمی کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا اور وہ تجارت جس میں تاجر، بے ایمانی اور جھوٹ سے کام نہیں لیتا۔''

صحیح مسلم میں حدیث آئی آپؐ نے فرمایا'' اللہ پاکیزہ ہے اور صرف پاکیزہ مال ہی قبول کرتا ہے اور اللہ نے مومنوں کو اسی بات کا حکم دیا ہے جس کا اس نے رسولوں کو حکم دیا تھا۔

اے اہل ایمان! جو پاک اور پاکیزہ چیز ہم نے تم بخشی ہیں وہ کھاؤ۔''

مشکواۃ میں ہی درج ہے کہ'' کوئی بندہ حرام مال کھائے پھر اس سے خدا کی راہ میں صدقہ کرے تو یہ صدقہ اس کی طرف سے قبول نہ کیا جائے گا اور اگر اس نے اپنی ذات اور گھر والوں پر خرچ کیا تو برکت سے خالی ہوگا اور اگر اس کو چھوڑ کر مر گیا تو وہ اس کے سفر جہنم میں زادِ راہ بنے گا۔''

بندہ جب تک رزق پورا نہیں کر لیتا موت نہیں آتی:

ابن ماجہ نے ایک اسی حوالے سے ایک اور حدیث سے راہنمائی دی۔

آنحضورؐ فرمایا: لوگو! اللہ سے ڈرو۔ کمائی میں شریعت کا خیال رکھا کرو یاد رکھو! جب کوئی بندہ اپنا رزق پورا نہیں کر لیتا۔ اس کو موت نہیں آتی۔ ان احادیث نے رزق کے حوالے سے تصور واضح کر دیا۔

پھر ایک روز اسی دوست سے کھانے پر ملاقات ہوئی۔ میں نے باتوں باتوں میں اسے حدیث سنا دی کہ ”جو روزی حلال طریقے سے کمائے گا“ اس کا چہرہ قیامت کے روز چودھویں کے چاند کی طرح روشن ہوگا اور وہ اسی حال میں خدا سے ملاقات کرے گا۔“

اس کے اندر اچھی روح تھی جو اس نے کج بحثی نہیں کی، وہ میرا اشارہ سمجھ گیا۔ بولا

”کیا آپ کو پختہ یقین ہے کہ میرا رزق حلال اور طیب نہیں ہے۔“

میرا جواب بڑا واضح تھا مگر ہاں یا ناں میں نہیں تھا۔ میں نے اسے آنحضورؐ کا دیا ہوا پیمانہ بتا دیا کہ اپنے دل اور ضمیر سے فیصلہ لے لو، کیا وہ اس پر ٹھٹکتے ہیں؟ یعنی مطمئن ہیں۔ جو کام اور جو مصنوعات چھپا چھپا کر دینی پڑیں۔ دوسروں کے سامنے ان سے انکار کرنا پڑے۔ اپناتے ہوئے شرم آئے۔ آخر ان کے ساتھ غلط مسئلہ تو ہوگا، پھر جس طرح صدقہ جاریہ ہے۔ اللہ معاف کرے جو لڑکی یا لڑکا انہیں دیکھ کر کسی گناہ میں مبتلا ہوں گے وہ بھی ایک گناہِ جاریہ کی صورت ہوگی۔ یہ بہر حال مجھے تو کوئی اچھی کمائی محسوس نہیں ہو رہی...... اس نے جلد ہی اونے پونے سارا سامان بیچا۔ میں نے چپکے سے ایک فرمائشی مشورہ اور دے دیا۔ ان دونوں وی سی آر اور ٹی وی بھی کرایے پر دیئے جاتے تھے کہ سارا سامان بیچتے ہوئے اتنی مہربانی کرنا کہ وہ بلو فلمیں، نیو ڈی وی ڈیز اور کیسٹس جتنی بھی ہیں وہ کسی اور کو مفت بھی نہ دینا۔ شکر ہے اس نے بات مان لی البتہ کبھی کبھی ضرور کہا کرتا تھا کہ آپ نے بیٹھے بٹھائے میرا نقصان کرا دیا۔ اب وہ بیرون ملک آباد ہے اور اللہ نے اسے خوب رزق سے نوازا ہے۔

سر! سارے شارٹ کٹ رزق حرام سے کیوں جڑے ہیں!

یونیورسٹی آف لاہور میں پڑھاتے ہوئے کچھ طلبہ بہت قریب آ گئے۔ وہ محنتی بھی تھے اور محبت

بھی کرتے تھے۔ جو کام دیتا، سب سے اچھا کرتے۔ سب سے پہلے کرتے، ان سب کو ہی بہت اچھی جاب ملیں۔ شاگرد اچھا نکل آئے تو ماں باپ اور استاد کو ہی زیادہ خوشی ہوتی ہے۔ شاید یہی بے غرض اور سچی خوشی کہلاتی ہے۔

ان میں سے ایک طالب علم نے کئی ماہ بعد آ کر کہا "سر مجھے ایک سرکاری نوکری مل گئی ہے۔ آپ اپنے کسی اچھے طالب علم کو ریفر کر دیں میں جہاں کام کرتا ہوں وہ ادھر آ جائے۔ اچھے پیسے ملتے ہیں۔" میں نے اپنا کام کرتے ہوئے بے دھیانی سے پوچھا۔

"کہاں ہے۔ اور کتنے پیسے" کسی کو بھجواتے ہوئے آپ کے پاس معلومات تو پوری ہونی چاہئیں۔ اس نے کہا "ایک بزنس سنٹر ہے مزنگ میں اور ایک ہزار روپے فی گھنٹہ تنخواہ ہے۔"

تصور خدا، تصور رزق، تصور آخرت بظاہر لفظ ہیں مگر آپ کو اندر سے چوکنا کر دیتے ہیں۔ میں نے ایک دم کام چھوڑ کر اسے دیکھا۔

"مزنگ میں کون سا بزنس سنٹر ہے جہاں امریکہ کی طرح ہر گھنٹے کی تنخواہ ملتی ہے! ہمارے ہاں تو ماہانہ تنخواہ ہوتی ہے۔ صرف مزدور کو روز دیہاڑی ملتی ہے۔"

اس نے بات بدل دی اور اجازت لے کر چلا گیا۔ میں نے اس کے ایک دوست کو بلایا اور پوچھا "وہ کہاں اور کیا کام کرتا ہے جس کی مجھے بھی خبر نہیں۔"

اس نے سنجیدگی سے کہا آپ کو خبر ہو بھی نہیں سکتی۔ کوئی بھی اس بزنس کو نہیں جانتا۔ وہ الگ طرح کے لوگ ہیں۔ الگ طرح کے کام ہیں ان کے!"

کیا مطلب! میں نے دلچسپی سے پوچھا

سر! اصل میں وہاں استقبالیہ ٹیبل پر ایک کمپیوٹر پڑا ہوا ہے۔ نوکری یہ ہے کہ اس پر گیمیں کھیلو اور باہر نظر رکھو، جیسے ہی پولیس آئے تو نمبر پر لگی ہوئی گھنٹی بجا دو۔ وہ اندر مختلف کمروں میں جج اُٹھے گی جہاں لوگ جوا کھیل رہے ہوتے ہیں یا کرکٹ میچ پر شرطیں لگائے بیٹھے ہوتے ہیں۔

چند روز بعد میں نے اسے یاد کیا۔ چائے پیتے ہوئے پوچھا "بچپن میں ابو امی نے کبھی نہ کبھی تو

اللہ رسول کا بتایا ہوگا، ان کی پسند، ناپسند تمہارے تو ابو کالج میں پروفیسر ہیں، وہ کیسے بتانا بھول گئے۔

کچھ سمجھا کچھ نہیں سمجھا بولا'' ! سر نمازیں تو دن میں تین چار پڑھ لیتا ہوں، بس دفتر ٹائم میں تھوڑی مشکل ہوتی ہے۔''

یہ دلیل ہر اس دل سے نکلتی ہے جہاں تصور رب کمزور ہوتا ہے۔ اسے بتانا پڑا کہ سود کھانا، کھلانا ہی نہیں سود کی دستاویزات لکھنے والا، ریکارڈ کرنے والا بھی اسی پابندی میں آتا ہے۔ ہر جرم اور سزا کو تحفظ دینے والا بھی کل یہی دلیل دے گا کہ میرا رب مجھ سے یہ نہیں پوچھ سکتا۔ میں تو حرام نہیں کھا رہا تھا۔ میں تو جرم نہیں کر رہا تھا، اپنا فرض ادا کر رہا تھا۔

کل بازار حسن کے محافظ بھی یہی دلیل دیں گے۔ پھر کسی روز حرام گوشت بیچنے والے قصائی سور پالنے کا فارم کھولے گا اور گوشت مارکیٹ میں سپلائی کرے گا کہ میں خود تو نہیں کھاتا۔

شکر ہے مری دلیل اس کے دل کو لگی ورنہ تو ایسے لوگ بھی اب ہمارے ہاں پیدا ہو گئے ہیں کہ بچپن سے جن کے ماں باپ اور اساتذہ نے نہ گناہ ثواب بتایا یا نہ رب کی رضا کی اہمیت بتائی۔ ایسے لوگ مر ہوئے گدھوں کا گوشت، کتوں کا گوشت شہر شہر لوگوں کو دھوکے سے کھلاتے رہے۔ انکے بیچ سور نام مسلمانوں جیسے تھے مگر جب جسم کے اندر روح اور دل میں خدا سے ڈر اور محبت کا تعلق اور تصور نہیں دل سے یہ کسی بھی بدترین برائی اور گناہ کا تصور کر سکتے ہیں۔

شخصیت کب لوٹنے والے بد بخت:

کی پیارا ملک ہے جہاں لاکھوں لوگ اپنے رب کو راضی کرنے کیلئے اسکی
ابو جی ہمیں شام
عادتیں انہیں خوب صورت 7 ارب روپے سے زیادہ رقم اسکی راہ میں خرچ کر دیتے ہیں۔ یتیموں
کرنے کے لئے اپناتے ہیں۔ اور مستحق لوگوں کے ہزاروں بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ ان کی مدد
جماعت تک ہم باجماعت نماز کے ڈالتے ہیں۔ کوئی قدرتی آفت، زلزلہ، سیلاب آئے تو تن
لیکن اگر کے اللہ کے قریب ہونے کا رب اور خالق کی رضا چاہتے ہیں۔ اس کی قربت اور
کرتے اور ساری نمازیں پڑھنے پر نہ صرف ایسے بد بختوں سے بھی روز واسطہ پڑتا ہے جو

اپنے ہی قریبی عزیزوں کے بچوں کو اغواء کر لیتے ہیں۔ تاوان لیکر بھی ان کو جان سے مار دیتے ہیں،
اپنے ہی سگے رشتہ داروں کے بچوں کی کم عمری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی عزتیں لوٹ لیتے ہیں۔
انہیں عمر بھر کے لئے ذہنی مریض بنا دیتے ہیں۔ ایسے لوگ آئے روز پکڑے جاتے ہیں جن کی شکلیں
اور نام مسلمانوں کے سے ہوتے ہیں مگر لوگوں کی معصوم لڑکیوں کو ورغلا کر نوکری کے نام پر دبئی یا خلیجی
ممالک میں لے جا کر طوائفیں بنا دیتے ہیں اور پھر واپس آنے اور اپنے پیاروں کی شکلیں دیکھنے سے
محروم کر دیتے ہیں۔

اگر ان کا تصور خالق اور مالک مضبوط ہوتا، انہیں یقین ہوتا کہ ان کا رب ایک دن انہیں دوبارہ
بلا کر عمر بھر کے گناہوں کا پوچھنے والا ہے اور سزا دینے والا اور جہنم کی آگ میں ڈالنے والا ہے تو کیسے
ممکن ہوتا کہ وہ ان معصوموں کی زندگیاں جہنم بناتے۔

خبردار، ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہے:

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا: بے حلال بھی
واضح ہے اور حرام بھی، اوران دونوں کے درمیان ''مُشتبِہات'' (جن چیزوں کا معنی کو بلایا اور نہ
ہو) ہیں اور اکثر لوگ ان سے لاعلم ہیں اور جو شخص مشبہات سے بچ نکلا اس نے اپنے دین کو
محفوظ کر لیا اور جو شخص مشتبہ چیزوں میں پڑ گیا وہ اس چرواہے کی مانند ہے جو شاہی جانتا۔ وہ الگ
قریب اپنی بکریاں چرائے، خدشہ ہے کہ شاہی چراگاہ کے (قریب ہونے کی
نہ جائیں، خبردار، ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بھی ایک
ہے (وہ چراگاہ) اس کی حرام کی ہوئی چیزیں ہیں۔ خبردار، انسان کے بارے ہے کہ اس پر کیمیں کھیلو اور
جب وہ درست ہو تو پورا جسم سنور جاتا ہے اور جب خراب ہو تو وہ اندر مختلف کمروں میں بج اُٹھے گی
نکالے بیٹھتے ہوتے ہیں۔

یہ کوئی کتابی باتیں نہیں ہیں:

غور کرتا ہوں تو پوری طرح دل گواہی دیتا ہوئے پوچھا'' بچپن میں ابو امی نے کبھی نہ کبھی تو

صرف بُرائی سے روکتی ہے بلکہ اللہ کے اتنا قریب کرتی ہے کہ انسان اپنی زندگی کے چھوٹے بڑے ،اچھے بُرے ہر فیصلے اور ہر معاملے میں اپنے مولیٰ کی خوشی کا خیال کرتا ہے اور یوں اسکی شخصیت کی ایک مضبوط بنیاد بنتی ہے۔

اُن کے محبوب نے انہیں کہاں جوڑ دیا:

آپ تصور کریں کہ سکول میں ہی آپ کو خبر ہو جائے کہ دنیا کا سب سے مہربان آدمی جو کائنات کے خالق اور مالک کو سب سے محبوب تھا وہ اچھے اخلاق کو پسند کرتا تھا۔ اچھے کردار کی تحسین اور تعریف کرتا تھا۔ نگاہ میں حیا کو پسند کرتا تھا۔ اپنے کسی ساتھی اور صحابی کی نگاہ قابو میں نہ ہوتی تو اسے پیار سے منع بھی کر دیتا تھا۔ جیسے ایک بار تو فضل بن عباس کا سر پکڑ کر گھماتے ہوئے کہا ''اب بس بھی کرو'' اس پاک باز نبی ﷺ سے محبت کرنے والے، ان پر جان دینے والے نوجوان اور بوڑھے ہی نہیں۔ بچے بھی تھے۔ اپنے بچے جو نماز میں ان کے کندھوں پر بیٹھ جاتے اور ان کے لیے وہ سجدہ لمبا کر دیتے۔ غلاموں کے بچے کہ جن کو وہ ٹانگوں پر بیٹھا لیتے۔ بڑا ہو کر انہی کے غلام زید بن حارثہ کا بیٹا اسامہ بن زید فوج کا سالار بنا۔ زید بن حارثہ، انس بن مالک، عبداللہ بن عباس، دس گیارہ سے لے کر بارہ تیرہ سال کی عمر کے تھے۔ اپنی زندگی کے آئیڈیل شخص کو دیکھنے۔ ان سے محبت کرنے۔ خدمت کرنے اور ان جیسا بننے کی آرزو کرنے والے یہ بھی چھوٹی عمر کے لڑکے ہی تھے۔ اور اسی عمر کی بنیادوں نے انہیں طاقتور اور مستحکم شخصیت بننے میں مدد دی۔ ان کے محبوب نے انہیں دنیا کے مالک اور خالق سے یوں جوڑ دیا کہ ہر سوچ ہر عمل اور خیال کی بنیاد بنا دیا۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو دانش کیسے عطا ہوئی:

یہ ہجرت سے تین سال قبل پیدا ہوئے۔ آنحضور ﷺ کا وصال ہوا تو 13 سال کے تھے۔

اتنی چھوٹی سی عمر میں ان کو ایک ہزار چھ سو ساٹھ احادیث زبانی یاد تھیں جنہیں امام بخاری اور امام مسلم نے نقل کیا۔

''حکم خداوندی ہے جن کو حکمت اور دانش عطا کی گئی اسے خیرِ کثیر سے نوازا گیا'' آپ کو یہ تحفہ

صرف بُرائی سے روکتی ہے بلکہ اللہ کے اتنا قریب کرتی ہے کہ انسان اپنی زندگی کے چھوٹے بڑے ،اچھے بُرے ہر فیصلے اور ہر معاملے میں اپنے مولیٰ کی خوشی کا خیال کرتا ہے اور یوں اسکی شخصیت کی ایک مضبوط بنیاد بنتی ہے۔

اُن کے محبوب نے انہیں کہاں جوڑ دیا:

آپ تصور کریں کہ سکول میں ہی آپ کو خبر ہو جائے کہ دنیا کا سب سے مہربان آدمی جو کائنات کے خالق اور مالک کو سب سے محبوب تھا وہ اچھے اخلاق کو پسند کرتا تھا۔ اچھے کردار کی تحسین اور تعریف کرتا تھا۔ نگاہ میں حیا کو پسند کرتا تھا۔ اپنے کسی ساتھی اور صحابی کی نگاہ قابو میں نہ ہوتی تو اسے پیار سے منع بھی کر دیتا تھا۔ جیسے ایک بار تو فضل بن عباس کا سر پکڑ کر گھماتے ہوئے کہا ''اب بس بھی کرو۔'' اس پاک باز نبی ﷺ سے محبت کرنے والے، ان پر جان دینے والے نوجوان اور بوڑھے ہی نہیں۔ بچے بھی تھے۔ اپنے بچے جو نماز میں ان کے کندھوں پر بیٹھ جاتے اور ان کے لیے وہ سجدہ لمبا کر دیتے۔ غلاموں کے بچے کہ جن کو وہ ٹانگوں پر بیٹھا لیتے۔ بڑا ہو کر انہی کے غلام زید بن حارثہ کا بیٹا اسامہ بن زید فوج کا سالار بنا۔ زید بن حارثہ، انس بن مالک، عبداللہ بن عباس، دس گیارہ سے لے کر بارہ تیرہ سال کی عمر کے تھے۔ اپنی زندگی کے آئیڈیل شخص کو دیکھنے۔ ان سے محبت کرنے۔ خدمت کرنے اور ان جیسا بننے کی آرزو کرنے والے یہ بھی چھوٹی عمر کے لڑکے ہی تھے۔ اور اسی عمر کی بنیادوں نے انہیں طاقتور اور مستحکم شخصیت بننے میں مدد دی۔ ان کے محبوب نے انہیں دنیا کے مالک اور خالق سے یوں جوڑ دیا کہ ہر سوچ ہر عمل اور خیال کی بنیاد بنا دیا۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو دانش کیسے عطا ہوئی:

یہ ہجرت سے تین سال قبل پیدا ہوئے۔ آنحضور ﷺ کا وصال ہوا تو 13 سال کے تھے۔

اتنی چھوٹی سی عمر میں ان کو ایک ہزار چھ سو ساٹھ احادیث زبانی یاد تھیں جنہیں امام بخاری اور امام مسلم نے نقل کیا۔

''حکم خداوندی ہے جن کو حکمت اور دانش عطا کی گئی اسے خیرِ کثیر سے نوازا گیا'' آپ کو یہ تحفہ

میں عطا ہوئی۔ کیونکہ ہمیشہ آنحضور ﷺ کے ساتھ رہے۔ وضو کا ارادہ ہوتا تو پانی لاتے۔ آنحضور ﷺ نماز شروع کرتے تو پہلو میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے۔ کئی بار نبی ﷺ کے پیچھے سواری پہ کمر کے ساتھ جڑ کر بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا۔ اللہ نے انہیں حساس دل، پاکیزہ ذہن اور قوی حافظہ دیا۔

ایک مرتبہ آنحضور ﷺ نے وضو کا پانی مانگا۔ عبداللہ بن عباسؓ فوراً لے کر آ گئے۔ آنحضور ﷺ بہت خوش ہوئے۔ نماز پڑھنے لگے تو اشارہ کیا عبداللہ! میرے ساتھ آ جاؤ۔ آپ پہلو کی بجائے پیچھے کھڑے ہو گئے۔

نماز کے بعد آنحضور ﷺ نے پوچھا ''تم ساتھ کیوں نہیں کھڑے ہوئے''

عرض کیا۔ ''آپ ﷺ کے عزت واحترام اور عظمت کے باعث''

یہ سن کر آپ ﷺ نے آسمان کی طرف منہ کیا اور فرمایا

''الٰہی عبداللہ کو حکمت و دانائی عطا فرما''

اللہ نے دعا قبول فرمائی آنے والے برسوں آپ کو بڑے بڑے حکماء اور دانشوروں پہ فوقیت حاصل ہوئی۔

چھوٹی سی عمر میں خلفائے راشدین کے مشیر خاص:

حضرت عمر فاروق ؓ کو کوئی مشکل درپیش ہوتی تو بڑے بڑے صحابہ کے ساتھ عبداللہ بن عباس ؓ کو بھی بلاتے اپنے قریب بٹھاتے اور مسئلہ کے بارے میں پیار بھرے الفاظ سے پوچھتے۔ اس پہ کچھ لوگوں نے اعتراض کیا۔

فرمایا ''یہ ایک منجھا ہوا، فصیح البیان اور صاحب عقل و دانش نوجوان ہے''

جامعہ عباس ؓ کے اکیلے اُستاد:

آپ کا گھر بہت بڑی جامعہ بن گیا جہاں آپ اکیلے ہی استاد تھے۔ ایک صحابی نے کہا کہ ایک

روز اتنے لوگ گھر آئے کہ تمام راستے بند ہو گئے تھے۔

میں نے ذکر کیا تو پانی منگوایا پھر فرمایا

"اعلان کر دیں جس جس کے قرآن کے الفاظ کے بارے میں سوال ہیں، وہ اندر تشریف لائیں۔"

صحن بھر گیا جب وہ اپنے جوابات لے کر مطمئن ہو گئے تو کہا "اب اپنے دوسرے بھائیوں کیلئے جگہ بنادو"

پھر اعلان ہوا

......جس جس نے تفسیر کے بارے میں سوال کرنے ہیں وہ آگے آ جائیں۔

......پھر جس جس نے حرام وحلال کے بارے میں پوچھا تھا۔ان کی باری آئی

......ان کے بعد جس جس کے وراثت کے بارے میں سوال تھے انہوں نے پوچھے۔آخر میں

......جو لوگ عربی اشعار اور کلام کے بارے میں پوچھنے آئے تھے ان کی باری آئی

ہر ایک کا تسلی سے جواب دیا۔

عبداللہ بن عباسؓ کی محبت پر تو مجھے آج بھی رشک آتا ہے:

عبداللہ بن عباسؓ کی محبت پر تو مجھے آج بھی رشک آتا ہے۔ نبی مہربانؐ کے جوتے سیدھے کرتے، وضو کا پانی لاتے، وضو کراتے، آنحضور ﷺ کبھی کبھی گھوڑے پر بیٹھا لیتے تو ساتھ لگ جاتے، ان کی خدمت بھی کرتے اور دعائیں بھی لیتے۔ اللہ سے ایسے جڑے کہ آخری عمر تک مخلوق کو علم کا فیض دیتے رہے۔ ہزاروں کو پڑھایا لکھایا اور انہیں خالق سے ملوایا کیسی خوش بختی تھی۔ کیسی عظیم زندگی تھی۔ ماشاءاللہ 80 سال سے زیادہ طویل عمر پائی مگر بچپن کی ہر یاد اور سیکھی بات یاد رہی۔ جو لوگوں کو اپنے رب سے جوڑتے رہے۔

معمولی واقعات کا غیر ضروری اثر:

خود شناسی اور شخصیت سازی میں بچپن کے بعض بالکل معمولی واقعات اتنا اہم کردار ادا کرتے

ہیں کہ برسوں بعد بھی آپ حیران رہ جاتے ہیں۔

میٹرک کے امتحان میں پہلی بار بیالوجی کا مضمون متعارف کروایا گیا۔ یہ78-1977 کی بات ہے۔ امتحان ہوا تو ابو جی انسپکٹر امتحانات کے طور پر دوسرے سکولوں کے دورے پر چلے گئے۔ ایک کلاس فیلو کے والد سکول میں ہی ٹیچر تھے۔ ان کے بیٹے کا پیپر بہت برا ہوا تو انہوں نے آ کر مجھے کہا" دیکھو میرا بیٹا پیپر دے رہا ہے اور میں ساتھ کھڑا ہوں۔ تمہارے ابا کہاں ہیں یہاں ہوتے تو ممتحن سے کہہ کر آدھا گھنٹہ اور دلوا دیتے۔ مجھے ان کا کہنا بہت برا لگا۔ میں نے ابو کو وہ الفاظ دہرا دیئے۔" اچھا پڑھانا میرے ذمے ہے۔ امتحان دلانا اور پاس کرانا میرے ذمے نہیں ہے۔ کبھی توقع نہیں رکھنا کہ میں ایک نمبر کے لیے کسی سے کہوں گا۔" ابو جی نے یہ نہ کہا ہوتا تو شاید ساری عمر غصہ رہتا کہ بیٹے کے فیوچر کا خیال نہیں کیا۔ بعد میں انہوں نے بتایا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنی اہلیہ اور بچوں سے کہا تھا کہ تمہارے آرام اور آسائش کی قیمت مجھے جہنم کے شعلوں سے ادا کرنی پڑے گی، کیا تم لوگ یہ چاہو گے یعنی جس بات سے خالق ناراض ہو وہ نہ خود کرنا نہ مجھے کرنے کے لیے مجبور کرنا۔

گھر کے دروازے پر آم کی پیٹیاں:

گورنمنٹ ہائی سکول132 /6۔آر بنگلہ یتیم والا میں قیام کے دوران ایک بار ہمارے گھر کے دروازے پر ایک صاحب آموں کی دو پیٹیاں رکھ گئے۔ والدہ نے نوکر کے ذریعے کہلوایا بھی کہ چوہدری صاحب ناراض ہوں گے، یہ واپس لے جائیں۔ وہ نہیں مانے۔ وہ آم 3 دن ہمارے دروازے پر پڑے رہے اور ہم بہن بھائیوں نے مڑ کر بھی ان کی طرف نہیں دیکھا۔ ابو واپس آئے تو اس طرزِ عمل سے بے حد خوش ہوئے۔ ان صاحب کو بلا کر پیٹیاں اٹھوا دیں اور کہا کہ بھلے آدمی! جب میں کام بغیر سفارش کر دیتا ہوں تو یہ تماشا کرنے کی کیا ضرورت تھی پھر اہم ترین بات یہ ہے کہ رب کو یہ بات پسند نہیں ہے۔ اس کے رسولؐ نے اس طرح کے مشکوک لین دین کو پسند نہیں کیا تو ہم ذرا سے ذائقے اور مزے کیلئے اپنے مالک کو کیسے ناراض کر لیں۔ ابو جی کو اسے میٹھا میٹھا شرمندہ کرتے میں

نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اپنے ابو کو میں نے ہمیشہ سیر چشم پایا۔ مطمئن اور شکر گزار روح۔ اپنے ادارے میں محنت میں وہ سب سے آگے رہتے اور کریڈٹ بڑے آرام سے اپنے ٹیچرز اور ٹیم کو دے دیتے۔ اپنے خالق سے جڑے ہوئے وہ ایک مطمئن اور آسودہ استاد اور بے حد عمدہ باپ تھے۔

انہیں ہمیشہ وفادار اور مخلص لوگ بھی مل جاتے۔ جب باس خود گڑبڑ نہ کرے تو ماتحت بھی نہیں کرتے۔ ہر طرز عمل کی بنیاد میں اپنے خالق کی رضا اور خوشی کا تصور کام کر رہا ہوتا ہے۔

ماہنامہ پھول کے زمانے (1990-2013) میں ہم بچوں کے لیے ہر ماہ انعامات کا اہتمام کرتے۔ اعظم یاد، راحیل امجد اور رفیق اعظم صاحب انعامات کا اہتمام کرتے، ان پر مجھے پورا اعتماد تھا۔ ایک دو بار بھری محفل میں ان کی تعریف بھی کی۔ اندازہ لگایئے کہ ایک بار بچوں کیلئے انعام کے طور پر سونے کا سیٹ پارلے والوں نے سپانسر کیا۔ مجید نظامی صاحب اور جسٹس فرخ آفتاب انعام تقسیم کرنے نظامی ہال آئے تو نظامی صاحب نے سب کے سامنے مجھ سے پوچھا۔

''ایڈیٹر بھیا! یہ اصلی ہے نا!''

پارلے کے مالک سلمان وہاں موجود تھے، انہوں نے کہا

''سر خالص اصلی۔ کسی نے اس کی طرف بری نگاہ بھی نہیں ڈالی''۔ اس جملے کا ایک پس منظر تھا۔

ہم کئی ماہ تک قرعہ اندازی میں انعامی تحفے کے طور ہر ماہ 10 لوگوں کو لاہور کے سب سے بڑے ہوٹل پی سی یعنی پرل کانٹی ننٹل کے لنچ کوپن دیتے تھے۔ نہ خود لینے کا خیال آیا نہ کسی اپنے کو نوازنے کا۔ یہ بچپن کی تربیت اور بنیاد تھی جس نے یہ ممکن بنایا۔

روزنامہ نوائے وقت میں ہمارے ایک کولیگ تھے اعجاز، وہ سرکولیشن کے شعبے سے ملازم تھے۔ پہلا بیٹا ہوا تو فرمائش لے کر آ گئے کہ بیٹے کو ٹائٹل پر چھاپ دیں۔ میری اہلیہ، سسرال بھی کا دباؤ اور فرمائش ہے۔ بچہ معصوم سا تھا۔ اس کا چہرہ ہماری شرط اور ضرورت کے مطابق تھا۔ اس لیے چند ماہ بعد چھاپ دیا۔ ایک شام وہ موٹر سائیکل کے ہینڈل سے مٹھائی کا ڈبہ لٹکا کر میرے گھر آ گئے۔ تب میری

رہائش علامہ اقبال ٹاؤن کے بدر بلاک میں تھی۔

وہ بیٹے کی تصویر کا شکریہ ادا کرنے آئے تھے۔ میں نے شکریہ وصول کیا مگر مٹھائی لینے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے دروازے کے آگے رکھ دی۔ میں نے ہنستے ہوئے۔

"میرے ابا کے بچوں نے 3 دن گھر کے باہر پڑی پیٹیوں کو نظر بھر کر نہیں دیکھا تھا۔ اسے بھی کوئی نہیں دیکھے گا"۔ وہ بولے "میری خوشی ہے، رکھ لیں"

میں نے جواباً کہا "دیکھیں آپ سے میری دوستی ہوتی تو بھی رکھ لیتا" آپ کے کہنے پر کام نہ کیا ہوتا تو بھی میں رکھ لیتا۔ کام کر کے مٹھائی لیتا ہوں تو اپنی نظروں سے گرتا ہوں۔ مجھ سے یہ کام نہ کروائیں۔ ایک ڈبا مجھ اندر سے بہت چھوٹا کر دے گا۔ کیا پتا مجھے اپنے مالک اور خالق کے سامنے بھی شرمندہ کر دے یہ سن کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ انہوں نے مجھے گلے لگایا۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ کوئی منہ سے مانگے بنا گھر آئی مٹھائی یا تحفے کو یوں بھی واپس کر سکتا ہے۔ اعجاز بعد ہی پنجاب بنک میں ملازم ہو کر خانیوال چلے گئے۔ ایک دوبار ملاقات بھی ہوئی، ان کی آنکھوں میں اپنے لیے احترام اور عزت کا اپنا اور انوکھا مزہ تھا۔

میری سفارش، میرے اللہ جی!

لوگ ہمیشہ سفارشیں ڈھونڈتے ہیں۔ میرا بچپن سے ایمان رہا ہے کہ جس نے کرنا ہے۔ اسی سے مانگا جائے، رونا ہے، التجا کرنی ہے، کچھ مانگنا ہے۔ اسی کے سامنے ہاتھ پھیلایا جائے

رب کا جتنا شکر کروں، کم ہے کہ اس نے کبھی مایوس نہیں کیا۔ اسی کا وعدہ ہے کہ ہر دعا قبول کرتا ہوں یا فوراً عطا کر دیتا ہوں یا آخرت کے لیے اٹھا رکھتا ہوں یا اس کا اچھا متبادل دے دیتا ہوں۔ دعا رد کوئی نہیں ہوتی۔ میں نے بھی ہمیشہ ہر دعا کے ساتھ خیر ہی مانگی، کسی خواہش کے ساتھ لٹکا یا نہیں کہ یہی ضرور چاہیے۔ "سر! آپ بہتر جانتے ہیں کہ میرے لیے اچھی کون سی ہے۔ بس وہی صورت کر دیں" نوکری ہو، رزق ہو، کام ہو، دوستی ہو یا کوئی خواہش اور خواب سب اسی خالق کے حضور، اسی سے توقع، اسی سے گزارش، جب وہ جوتے کا تسمہ تک دینا پسند کرتا ہے تو اسی لیے لینا چاہیے پھر کسی

اور کا احسان بندہ کیوں لے۔ اتنا بڑا مالک اور خالق آپ کے ساتھ ہو۔ دینے پر آمادہ ہو تو پھر کسی اور سے مانگ کر بدنصیبی کو آواز کیوں دی جائے۔ میری خودشناسی ہمیشہ یہی سمجھاتی رہی ہے۔ اسی لیے نہ کبھی پڑھائی کے دوران کسی کی سفارش کا احسان لیا اور نہ نوکری کے لیے کسی کو کہنا پڑا۔ گرم و سرد بھی موسم دیکھے مگر دل میں یا ہونٹوں پر نہ کبھی شکوہ آیا نہ شکایت، مل گیا تو پورے دل سے شکر کیا، نہ ملا تو صبر کیا کہ رب اس کا متبادل ضرور دے گا۔

ایک دھوکے کا ماجرا:

ایسا نہیں کہ زندگی میں میرا کبھی نقصان نہیں ہوا، کسی نے تکلیف نہیں دی یا آزمائش میں نہیں پڑا۔ ان سارے مراحل سے گزرنے کا نام ہی زندگی ہے۔ دھوکا بھی کھایا، حق بھی مارا گیا۔ جن پر اعتماد کیا انہوں نے تکلیف بھی پہنچائی حد یہ کہ ایک ڈیلر کو گھر خریدنے کے لیے پیشگی دس لاکھ روپے دیئے۔ مزید پیسے دینے والا تھا جب پتا چلا کہ وہ بھلا آدمی جو ہمسایہ بھی تھا، اس گھر کو کئی اور لوگوں کو بیچ چکا ہے۔ اتنے سارے پیسے تب تک اکٹھے کبھی میرے اکاؤنٹ میں بھی نہیں آئے تھے۔ بہت دکھ ہوا کہ کوئی اتنی آسانی سے آپ سے فراڈ کر جائے۔ قانونی کارروائی کے لیے نکلا تو ایک جاننے والے نیک دل ایس ایس پی چیمہ صاحب نے کہا:

''میں آج تک اپنے پیسے نہیں لے سکا، آپ کو کیسے نکلوا کر دوں''۔ اپنے عزیز دوست سکاؤٹ لیڈر عبدالنعیم خان کے اکسانے پر سی آئی اے اور وکیلوں کے چکر میں پڑتے بچا۔ اس کی بجائے اپنے اللہ جی سے کہا ''سر آپ اس سے بہتر دے دیں۔ اس سے زیادہ دے دیں دل سے بوجھ اُتار دیں'' وہ پانچ مرلے کا گھر تھا۔ خدا نے ایک کنال یعنی 20 مرلوں کا گھر دے دیا۔ وہ دس لاکھ تھے۔ اسی سال خدا نے کئی دس لاکھ سے نواز دیا۔ میں اس دھوکے باز کو بددعا نہیں دیتا، مگر دل پر ہاتھ رکھے، غم کے مارے اس کے پیچھے مارا مارا بھی نہیں پھرا۔ اسکو میں نے فالج کا عذاب سہتے، لوگوں سے جگہ جگہ بے عزت ہوتے، حوالات میں بند ہوتے ضرور دیکھا۔ اتنا مجھے یقین ہے کہ آخرت میں اعمال کی کمی بیشی ہوئی تو جو چھوٹے چھوٹے دھوکے میرے ساتھ ہوئے اور یہ بڑا دھوکا

مل کر اللہ کے فضل سے میری آسانی کا باعث بنیں گے۔ انشاء اللہ۔ میں نے ایسے دھوکوں کے بعد لوگوں کو لاعلاج امراض میں مبتلا ہوتے، تڑپتے، روتے اور شکائتیں کرتے دیکھا ہے۔ میرے بعض دوستوں کو شکایت ہے کہ میں شکایت نہیں کرتا، رب سے بھی نہیں لڑتا۔ میں کہتا ہوں۔ ضرورت کیا ہے بابا! جو بُرا ہوا، وہ رب نے دیکھا! وہ مہربان رب مجھے کیسے اکیلا چھوڑ دے گا!"

رب نے چپکے سے نقصان میری جھولی میں ڈال دیا:

بہت سال پہلے ایک مشہور تعلیمی ادارے نے میری آخری تنخواہ کے 70 ہزار روپے بے وجہ روک لیے۔ مالک کا خیال ہوگا کہ جا کر اس سے ملوں۔ گزارش کروں میں نے اپنے اللہ جی سے کہا "سر! آپ جانتے ہیں کبھی ایک لمحہ ضائع نہیں کیا۔ صبح دھند میں جب ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہ دیتا تھا، شہر سے 20 کلومیٹر دور دفتر جاتا تھا اور رات جب تھکاوٹ سے آنکھیں نہ کھلتی تھیں، گھر واپس آتا تھا۔ نہ محنت میں کبھی کمی کی، نہ تدبیر میں، ہمیشہ ادارے کا اچھا چاہا۔ حتیٰ کہ وہاں سے آنے کے بعد میں بھی...... نہ سازش کی اور نہ کبھی سازش کرنے والوں کا ساتھ دیا۔ یہ میرا شعبہ ہی نہیں۔ اس سے ہمیشہ کہا" سر پلیز مجھے بچایئے اور جو دکھ اور نقصان مجھے ہوا ہے، اس سے بہتر دے دینا"۔

میرے رب نے چپکے سے نقصان کہیں اور سے میری جھولی میں ڈال دیا۔ میں کیوں نہ اس کو پوری مضبوطی سے یاد کروں۔ اس تصور کی مضبوطی نے مجھے بچپن سے جوانی اور اب بڑھاپے کی طرف بڑھتے ہوئے ہر قدم پر مضبوطی دی۔ یہ مضبوط اور پختہ تصور میری خود آگاہی کی سب سے مستحکم بنیاد ٹھہرا۔ یہ تصور پر خود آگاہ شخص کی اساس اور بنیاد بنتا ہے۔

میں کیسے اپنی ہر خوشی اور مشکل میں اس مالک اور خالق کی انگلی چھوڑ دوں۔ خود شناسی کے اس سفر میں میری شخصیت کی بنیاد ہی وہ ہے۔ مجھے اس کی محبت پر، اس پر یقین نہیں بلکہ اندھا یقین ہے، میں نے مشکل میں مدد کے لیے "کوئی ہے" کی آواز نہیں لگائی۔ آنکھیں بند کر کے اپنے اللہ جی سے کہا۔

"سر! تھام لیجئے، یہ معاملہ میرے بس سے باہر ہو رہا ہے۔"

اس لیے میں پورے یقین سے سمجھتا ہوں کہ تصور اللہ تصور خالق ہر انسان کی شخصیت کی روٹس کا لازم اور بنیادی حصہ ہے۔ جس قدر یہ مضبوط ہوگا اسی قدر انسان قابل اعتماد اور قابل اعتبار اور قابل بھروسہ ہوگا۔

اشفاق صاحب کے ساتھ زاویہ:

پھول کے دنوں میں ہم ہر ماہ کسی نہ کسی مشہور ہوٹل میں مشہور و معروف دانش ور اشفاق احمد کے ساتھ زاویہ کرتے تھے۔ ایک بار لبرٹی میں واقع عزم الحق کے خوبصورت ہوٹل میں پروگرام تھا۔ عظیم شوکت نے بڑی محبت اور توجہ سے اس کا انتظام کیا تھا۔ اس روز دو سو روپے فی کس خرچ آنا تھا جو پچاس شرکاء نے ادا کرنا تھا، ایک طالب علم کو جو کافی دور سے آیا تھا۔ پیسوں کی ادائیگی سے ذرا پہلے پریشانی میں مبتلا پایا تو اس کو بلایا، پوچھا تو پتا چلا کہ اس کی جیب خالی ہے اب ظاہر ہے ہوٹل میں تو پر ہیڈ ادائیگی کرنی ہوتی ہے، میں نے جیب سے دو سو روپے نکال کر خاموشی سے اسے دے دیئے اور کہا جاؤ عظیم شوکت کو اپنا حصہ دے آؤ اور مجھے بعد میں کسی روز آفس آ کر لوٹا دینا۔ اس کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ پروگرام ختم ہو گیا۔ اشفاق صاحب تشریف لے گئے تو عظیم شوکت نے آ کر کہا بھیاء جی! پیسے کم ہو گئے ہیں۔ کیسے؟ میں نے حیرت سے پوچھا۔ کیونکہ اپنے اور مہمان خصوصی کے میں الگ سے ادا کر چکا تھا۔ اس نے لسٹ دکھائی سب کی ادائیگی ہو چکی تھی اس لڑکے کا نام خالی پڑا تھا۔ اور وہ خود بھی غائب ہو چکا تھا، میں آج اس لمحے کو جب کبھی یاد کرتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں۔ یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ مجھے اس کے اندر کے شر اور لالچ کا افسوس زیادہ ہے یا اپنے بھروسہ کو توڑنے اور اعتماد کا خون کرنے کی اس صلاحیت کا جو اس نے چھوٹی سی عمر میں حاصل کر لی تھی۔ بعد میں بھی وہ دفتر آتا رہا، وہ اس واردات کو اپنی چالاکی ہی جانتا رہا کہ انہیں کونسا پتہ چلا ہوگا۔ مگر ہمیں جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ اس کے اندر لالچ اور دھوکے کے تو پورے پورے کھیت آباد ہیں۔ اس کا تصور خالق کا خانہ لالچ سے بھرا ہوا تھا، خدا وہاں کیسے آتا، وہ چھوٹی سی عمر تھی آنے والے برسوں میں خدا جانے اس نے کیا کیا کارنامے سرانجام دیے ہونگے۔

اللہ ویسا ہے جیسے آپ سوچتے ہو:

مجھے سو فیصد یقین ہے کہ انشااللہ جنت کے اعلیٰ درجوں میں میرا گھر ہوگا۔ اللہ جی جمعہ کے روز جو دعوت دیا کریں گے اس میں ضرور شرکت کا دعوت نامہ ملے گا۔ اپنے پر ہوں گے جنہیں لگا کر یہاں وہاں اڑتا پھروں گا۔ جنت میں ملنے والے اپنے محل کی دیواروں پر ایک بڑی سی سکرین پر جنت میں ہونے والی چہل پہل سے باخبر رہا کروں گا۔ پرانے دوستوں سے مل کر محفل جمایا کریں گے۔ اور اپنے رب کا شکر ادا کیا کروں گا۔ ممکن ہوا تو کوئی میگزین بھی چھاپنا شروع کردیں گے اب سارا وقت کھانے ہی تو نہیں کھاتے رہیں گے، اپنی مرضی اور پسند کا کوئی کام، کوئی سرگرمی بھی تو لازماً ہوگی۔

یہ آنحضورؐ کا وعدہ ہے کہ بندہ جیسا تصور اپنے رب کے بارے میں رکھتا ہے وہ بالکل ویسا ہی ہے اور ویسا ہی پیش آتا ہے۔ تو بچپن سے اب تک کسی لمحے میری اپنے رب سے نہ محبت کم ہوئی نہ تعلق کمزور ہوا ہے۔ اس نے بھی مجھے کبھی اکیلے نہیں چھوڑا۔ یہ جو میری زبان پر کبھی اس کا شکوہ آیا نہ گلا، تو اسکی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں لفظ میرے رب کے بھی ناپسندیدہ ہیں، میرے رب نے مجھے ان سے ہمیشہ بچائے رکھا۔ الحمدللہ میری زبان کو اپنی محبت کے یقین سے تر رکھا، اور مجھے کیا چاہیے!

ذکر الٰہی اور تقرب الٰہی:

ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ ''میں اپنے بندے کے گمان کے بہت قریب ہوں۔ جب بندہ مجھ کو یاد کرتا ہے تو میں بھی اس کے ساتھ ہوتا ہوں اور اگر اس نے مجھے اپنے جی میں یاد کیا تو میں بھی اسے اپنے جی میں یاد کرتا ہوں اور اگر اس نے کسی جماعت میں بیٹھ کر میرا ذکر کیا تو میں ملائکہ کے سامنے اس کا ذکر کرتا ہوں اور اگر وہ ایک بالشت میری طرف بڑھتا ہے تو میں ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہوں۔ اور اگر بندہ ایک ہاتھ میری طرف بڑھتا ہے تو میں دو ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہوں۔ اور اگر بندہ میری طرف چل نکلتا ہے تو میں اس سے دوڑ کر مل جاتا ہوں۔''

(بخاری و مسلم)

پھر اللہ محبت کرنے لگتا ہے:

یہ پڑھ کر بھی انسان اپنے خالق اور مالک کو نہ سمجھے گا۔ تو پھر کب سمجھے گا میں نے تو الحمد اللہ مستقل انتظام کرلیا ہے، اپنے رب کی محبت اور تصور پر یہ کتاب لکھ ڈالی ہے۔ یقیناً وہاں میرے رب کی کتاب میں بھی میرا محبت بھرا ذکر ہوگا۔ ایک اور حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ ''بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے، اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جن سے وہ پکڑتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے سوال کرے گا تو میں اس کو دوں گا اور اگر وہ مجھ سے پناہ چاہے گا تو میں اس کو پناہ دوں گا'' (بخاری)

خودشناسی کی ہر منزل میں یہ تصور انسان کو مضبوطی عطا کرتا ہے۔ اپنے محبوب کی قربت کسے نہیں چاہیے، یہ الگ بات ہے کہ ہم چھوٹے دماغ والے انسان ہیں، انسانوں میں سے عارضی محبوب بنا کر وقتی سی خوشی ڈھونڈتے ہیں اور مالک اور خالق کی قربت سے خود کو محروم کر لیتے ہیں۔

اللہ کی محبوبیت سے دنیا میں محبوبیت:

اللہ کے محبوب نبی ﷺ نے فرمایا تھا'' جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرماتا ہے کہ مجھے فلاں بندے سے محبت ہے تم بھی اس سے محبت کرو تو حضرت جبرائیل علی علیہ السلام اس سے محبت کرتے ہیں پھر حضرت جبرائیل علیہ السلام آسمان والوں میں منادی کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو' تو آسمان والے اس سے محبت کرتے ہیں پھر اس کی محبت زمین والوں کے دلوں میں ڈال دی جاتی ہے (مسلم)

سچ کہوں تو اس حدیث پر عمل ہوتے میں نے اپنی ان گناہگار آنکھوں سے دیکھا ہے اور بار بار اپنے رب کا شکر ادا کیا ہے۔ 1990 کے بعد اپنی ہر تحریر میں جو پھول کی زینت بنی یا 2010 کے بعد میرے کالموں اور کتابوں کا موضوع بنی میں نے اپنے اللہ جی کی محبت کو مرکز اور محور بنایا۔ یہاں تک کہ میری پروفیشنل ٹریننگز میں بھی دلیل اور اصل کے طور پر اپنے رب کو اس کی پسند کو ساتھ رکھا۔

انسان، انسان بن ہی نہیں سکتا۔ جب تک اس سے جڑا نہ ہو۔ میری نجی زندگی ہو یا پروفیشنل میں نے اسی کو سب سے بھروسہ مند سہارا پایا۔

اللہ سے ڈرنا اور خوف کھانا کیسا ہے:

میرے کئی جاننے والوں کو جمعیت اور جماعت کی سیاسی پالیسیوں سے اختلاف رہا، یہ سب کا حق ہے مگر تربیتی معاملات میں۔ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ اللہ سے محبت کا تعلق بڑھانے کا یہاں ہمیشہ کم یا زیادہ انتظام رہتا ہے۔

ایک بار آنحضور ﷺ نے فرمایا (جو زادالمعارج 2 صفحہ 25 پر درج ہے۔)

''مسلمانو! میں تم کو اللہ سے ڈرنے اور اس سے تقویٰ کی روش اختیار کرنے کی تاکید کرتا ہوں اور یاد رکھو! بہترین تاکید یہ ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو آخرت کے لیے آمادہ کرنے کی خاطر تقویٰ کی وصیت کرے۔

اے لوگو!

خدا نے جن باتوں سے تمہیں روکا ہے ان سے رک جاؤ!

اس سے بہتر نہ کوئی نصیحت ہے نہ کوئی ذکر۔

یاد رکھو!

آخرت کے دن تقویٰ بہترین مددگار ثابت ہوگا۔

جب کوئی اپنا اور خدا کا معاملہ ظاہر اور باطن میں درست رکھے گا تو ایسا کرنا اس کے لیے دنیا میں ذکر اور موت کے بعد ذخیرہ بن جائے گا اور جو ایسا نہیں کرے گا اس کی حالت ایسی ہوگی جس کے بارے میں خود خدا نے فرمایا ''انسان چاہے گا کہ اس کے اعمال اس سے الگ ہو جائیں'' پھر فرمایا:

''خدا تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور وہ اپنے ان بندوں پر مہربان ہے جنہوں نے اس کے احکام کو سچ جانا اور اپنے وعدے کو پورا کیا''۔ ۔۔۔

ان اتنے واضح الفاظ کے بعد کسی انسان کو اور کس بات کی یقین دہانی چاہیے؟

جبکہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''ہمارے ہاں بات نہیں بدلتی اور ہم اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتے''

دانائی کی اصل اللہ کا خوف ہے:

مطالعہ قرآن ہو یا مطالعہ حدیث اگر یہ زندگی کے معمول میں تھوڑا تھوڑا بھی شامل ہو جائے تو پھر تازہ سانس آتی رہتی ہے۔ یاد دہانی ہوتی رہتی ہے۔ ورنہ تو رشتے بھی آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل کے مصداق ہوتے ہیں۔ انسان کے نفس کے مطالبے اور خواہشیں بھی کم ہونے میں نہیں آتیں، اکثر بے قابو ہو جاتی ہیں۔

رسول رحمت ﷺ نے کیا خوب فرمایا تھا۔

''ہوشیار اور توانا وہ ہے۔

جس نے اپنے نفس کو قابو میں رکھا۔

موت کے بعد نجات اور کامیابی کے لیے عمل کیا۔

نادان اور ناتواں وہ ہے۔

جو اپنی خواہشات نفس کے تابع رہے۔

اور اللہ کے احکام کی بجائے اپنے نفس پر چلے۔

اور پھر اللہ سے امیدیں باندھیں۔ (ترمذی)

غور کیجئے آنحضور ﷺ نے خود شناسی کے بنیادی تصورات کو کس خوبصورتی سے ذہن نشین کروایا ہے۔ ایک موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا تھا

''جس نے لوگوں کی خوشی کے لیے اللہ کو ناراض کیا

اللہ ایسے نالائق سے ناراض ہو جاتا ہے۔

اور جن لوگوں کی خاطر اس نے اللہ کو ناراض کیا، وہ بھی کبھی اس سے خوش نہیں رہتے۔''

(طبرانی)

اس حقیقت بیانی کے بعد کوئی خودآ گاہ انسان اپنا قبلہ درست کرنے میں کیسے کوتاہی برت سکتا ہے۔

ایک موقع پر آنحضور ﷺ نے فرمایا دنیا میں تقویٰ اختیار کر خدا کا محبوب بن جائے گا۔

لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس سے بے نیاز ہو جا

لوگوں میں محبوب بن جائے گا۔"

آنحضور ﷺ نے مزید فرمایا:

"انسان کے دل میں ایمان یہ ہے کہ

وہ خدا سے محبت رکھے" (ابن ماجہ)

میرا ماننا یہ ہے کہ جب دل میں خالق اور مالک کی محبت ہوگی تو انسان کی ذات کا ہر پہلو، اس کا بچپن، جوانی، بڑھاپا، اولاد، تربیت اس کی سوچ، اس کے فیصلے، اس کی محبت، اس کی روزی، اس کے اعمال، اس کی پسند، اس کی ناراضی، اس کی نیکی، اس کی بدی، اس کے مقاصد، اس کے اہداف، اس کی اقدار، اس کا وژن غرض ہر چیز براہ راست متاثر ہوگی، تصور خالق اتنا بھرپور، مکمل اور ہمہ پہلو ہے کہ اس کی محبت کی وسعت کا سمندر میں اترے بنا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔

اس لیے یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ ہر خودشناس طالب علم ہو یا نوجوان اس کی زندگی کی بنیاد ہی اس طرح مضبوط ہوتی ہے جب وہ یہ طے کر لیتا ہے کہ انسانی زندگی چاہے اس کی اپنی ہو یا دوسرے انسانوں کی، ان کی تعمیر کے ذریعے بھی مجھے اپنے رب کی رضا حاصل کرنی ہے۔ اس کی قربت پانی ہے۔ اس کے سامنے جا کر سرخرو ہونا ہے کہ کیونکہ صرف جینا اور زندگی کے ماہ وسال پورے کر کے ایک ویران قبر میں خالی ہاتھ اتر جانا تو کوئی کارنامہ نہیں بن سکتا۔ اس طرح ایک ایسے شجر پر کیسے اچھا اور میٹھا پھل آ سکتا ہے جس کی اپنے خالق اور مالک کے نام سے موسوم جڑ زمین کے اندر دور تک مضبوطی سے گڑی نہ ہو۔

یہ مت کہو خدا سے میری مشکلیں بڑی ہیں:

بڑے پُر جوش انداز میں اس باب کی تحریر مکمل کر کے گھر پہنچا تو اسی شام میری بیٹی نے جاتے ہی ایک ویڈیو ملکسنگ مجھے دکھائی، میں اب تک اسے کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ اس کا شکریہ ادا کر چکا ہوں ،وہ مسکرا کر ہر بار شکریہ وصول کرتی ہے اور اپنی والدہ کو پکارتی ہے ''مما ایک شکریہ اور آیا ہے'' کیونکہ اسے یہ تحفہ اپنی والدہ سے ملا تھا۔

وڈیو شروع یہاں سے ہوتی ہے کہ تین سیڑھیوں کے بعد ہموار فرش ہے اور وہاں ایک بطخ کھڑی ہے۔ نیچے آخری سیڑھی پر چھوٹے چھوٹے 12 ننھے منے بطخ کے بچے ہیں جو سیڑھیاں چڑھ کر اپنی ماں کے پاس جانا چاہتے ہیں۔ ماں بے چینی سے ٹہل رہی ہے اور بچے سیڑھی پر چڑھنے کیلئے کوشاں ہیں جوان کی عمر، اوقات اور طاقت سے بڑی اور اونچی ہے، پس منظر میں ایک گیت چلنا شروع ہوتا ہے۔ کیا خوبصورت لفظ ہیں اور کیا عمدہ پیغام ہے۔ مجھے تو ان لفظوں نے موہ لیا ہے۔

یہ مت کہو خدا سے، میری مشکلیں بڑی ہیں
یہ مشکلوں سے کہہ دو میرا خدا بڑا ہے
آتی ہیں آندھیاں تو کر ان کا خیر مقدم
طوفان سے ہی تو لڑنے، خدا نے تجھے جڑا ہے

اس دوران ایک چوزہ دو سیڑھیاں چڑھ جاتا ہے۔ شعر مکمل ہونے تک دو مزید چوزے اوپر چڑھنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

یہ مت کہو خدا سے، میری مشکلیں بڑی ہیں
یہ مشکلوں سے کہہ دو میرا خدا بڑا ہے
اگنی میں تپ کے سونا ہے اور بھی نکھرتا
ڈر گم کو پار کر کے، پیانے کوئی چڑھا ہے

گیت جاری ہے مزید دو، چار، چھ اور پھر آٹھ چوزے آخری سیڑھی پر گرتے پڑتے لڑھکتے

پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

لائے گی رنگ محنت آخر تمہاری اک دن
ہو گا وشال گرور ، وہ بیج جو پڑا ہے

اب آخری ایک چوزہ بچتا ہے۔ سب اوپر جا چکے ہیں۔ بطخ کے ارد گرد گھوم رہے ہیں اور وہ مسلسل کوشش کر رہا ہے۔ بار بار منہ کے بل گرتا ہے مگر کوشش نہیں چھوڑتا۔ ابھی آخری شعر مکمل نہیں ہوتا جب وہ آخری سیڑھی پر چڑھنے کی ناممکن کوشش میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

اشعار گائیکی اور لفظوں سے تو یہ نظم بھارت میں رہنے والے کسی شاعر کے دلی جذبات کی عکاسی کر رہے ہیں مگر کیا خوبصورت تصور دیا ہے اور کیا عمدگی سے اس کو ان مناظر کی پکچرائزیشن سے جوڑا ہے۔ جو جو بچہ اس پیغام کو دیکھے گا عمر بھر اس پیغام کو بھول نہیں پائے گا

یہ مشکلوں سے کہہ دو میرا خدا بڑا ہے

میں کتنی ہی بار اسے دیکھ چکا ہوں، سن چکا ہوں مگر سچ کہوں تو ''سیری'' نہیں ہو رہی۔ خدا سے چھوٹی عمر میں محبت، اس پہ یقین اور اس کے ساتھ تعلق کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے سے ملنے والی راحت، خوشی اور مضبوطی کا لطف تازہ ہو گیا ہے۔ آج کے بچوں کیلئے یہ لطف آنے والے کل اس سے کہیں زیادہ ہو۔ کسی بھی بچے یا بڑے کو اس احساس کا ہونا کہ یہ مت کہو خدا سے میری مشکلیں بڑی ہیں۔ یہ مشکلوں سے کہہ دو میرا خدا بڑا ہے۔

زندگی کی سوچ بدلنے اور ہر مشکل کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے اندر سے ایک بے حد طاقتور احساس میسر آ جاتا ہے۔

کیا خوب دعا ہے:

یہ محبت بھری دعا، اللہ کے محبوب رسولؐ نے خود لکھائی ان کے دو صحابیوں نے اسے الگ الگ روایت۔ کیا حضرت ابی الدرداؓ اور حضرت معاذؓ نے خود اپنے کانوں سے رسول اللہؐ سے یہ الفاظ سنے اور اپنی روح اور ایمان کا حصہ بنا لیے۔ یہ الفاظ پڑھنے سے زیادہ محسوس کرنے اور اپنی روح میں اتار

لینے والے ہیں۔ دعا کے لیے اس سے بہتر الفاظ ممکن ہی نہ تھے۔ اس سے زیادہ بہتر دعا اور مدعا کچھ اور ہو بھی کیسے سکتا ہے۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّکَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ نَّفْسِیْ وَاَھْلِیْ وَمِنَ الْمَآءِ الْبَارِدِ○

"اے میرے اللہ!

اپنی محبت مجھے پیاری کر دے، میری جان سے، میرے گھر والوں سے اور ٹھنڈے پانی سے بھی بڑھ کر"

☆..........☆..........☆

8

باب ہفتم

خود شناسی
کا شجر سایہ دار

"اٹلی کے ادب میں ایک دلچسپ مثال دی جاتی ہے کہ ہر انسان کے اندر دو بھیڑیے ہوتے ہیں۔ ایک اچھا بھیڑیا دوسرا برا بھیڑیا۔ اب یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ کس بھیڑیے کو کھلاتا، پلاتا اور اس کی خاطر داری کرتا ہے۔ ظاہر ہے برے بھیڑے کو محبوب بنائے گا تو اچھا مر جائے گا اور اچھے کو عزیز رکھے گا تو برا جان سے جائے گا۔ ایسے ہی ہر شخص کے خود آگاہی کے درخت کی شاخوں میں لگے پھلوں کا معاملہ ہے جہاں اس کے ظرف، طلب اور علم کے مطابق اضافہ اور کمی ہوتی رہتی ہے

خودشناسی کی شاخوں پر لگنے والی بری عادتوں، سوچوں اور خرابیوں کا بھی بالکل یہی حال ہے ان پر توجہ نہ جائے۔ انہیں بار بار محبوب نہ بنایا جائے تو یہ تادیر زندہ نہیں رہ سکتیں۔ مرجھا کر سوکھ جائیں گی۔ اس کے پھلوں اور پھولوں کی مہک اور خوشبو جاتی رہے گی۔ اسی طرح ہر شاخ پر کھلنے والے ہر پھول کے نصیب میں پھل بننا نہیں لکھا ہوتا

کچھ شاخوں پر خود پسندی، خودفریبی، خودغرضی، خودستائی اور خودنمائی جیسے بے رنگ و بدذائقہ پھول بھی کھلتے ہیں یہ ہر بدن میں اگنے والے خود آگاہی کے درخت پر لگتے ہیں مگر خود آگاہ استاد جب ان کو پانی نہیں دیتا تو ایک وقت آتا ہے یہ مرجھا جاتے ہیں..........

خودشناسی کے خوبصورت اور مفید تصور کے بارے میں میں اس قدر تفصیل سے جاننے کے بعد آپ کی آسانی اور یاددہانی کے لئے ہم نے آپ کیلئے ایک سایہ دار شجر تیار کیا ہے۔ تعمیر ذات کے بیج سے اس پودے نے جنم لیا تھا۔ ان جڑوں سے، جس تنے نے مضبوطی پکڑی وہ تصور زندگی، مقاصد زندگی لئے ہوئے ہے۔ اور اس تنے پر ایمانیات، اقدار، اوصاف، خوبیوں، عادتوں اور مہارتوں کی شاخیں کھلتی ہیں اور ہر شاخ پر کم سے کم 5,5 پھل تو لگنے ہی چاہئیں، زیادہ سے زیادہ کی تو حد ہی نہیں۔

لیس الانسان الاّ ماسعٰیo

یہ تو اللہ جی کا وعدہ اور فرمان ہے کہ جس نے جتنی کوشش اور سعی کی، اسے اتنا ہی زیادہ ملا۔

بس اتنا جان لیجیے کہ یہ تو کم سے کم 5 , 5 پھول ہیں۔ آپ جس قدر اہتمام کریں گے، اسی قدر آپ کی ذات اور شخصیت رنگ رنگ کے پھولوں اور پھلوں سے مہکے گی اور یہ مہک دنیا تک ہی نہیں رہے گی آخرت کی سدابہار زندگی اور ہمیشہ رہنے والی نعمتوں کے ملنے کا باعث بھی بنے گی۔

خودشناسی کو اگر استاد کی شخصیت کے ایک پھلدار درخت سے تشبیہ دی جائے تو غلط نہ ہوگا۔ جس کی پانچ مضبوط جڑوں کی نشاندہی کر کے انہیں سمجھنا اور مضبوط بنانا اور بھی آسان بنا دیا ہے۔

1۔ پہلی جڑ عزتِ نفس سیلف ریسپکٹ (Concept of Self Respect)

2۔ دوسری جڑ خیالِ نفس، تصورِ نفس یعنی سیلف کونسپٹ (Concept of Self image & Concept)

3۔ تیسری جڑ احتسابِ نفس یعنی سیلف ایگزامی نیشن (Concept of Self Examination) کے نام سے جانی جائے گی

4۔ چوتھی جڑ خوف نفس Concept of Self Fear کے نام سے پہچانی جائے گی اور آخری جڑ خالق نفس Concept of Self God کہلائے گی

اس درخت کو اچھی، عمدہ اور مضبوط جڑوں کے باعث ایک بے حد جاذب، پائیدار اور توانا تنا نصیب ہوگا۔ اس تنے کو ہم مقاصد زندگی کا نام دیتے ہیں۔ یعنی گول سیٹنگ، خودآگاہ استاد کی زندگی کے اصل مقاصد کا تعین، وہ صرف نوکری کرنے کا خواہاں ہے تو زندگی کے درخت کی شاخیں اور طرح کی ہوں گی، زندگی کے مقاصد بڑے ہوں گے تو اس تنے سے پھوٹنے والی چھ اہم ترین شاخوں پہ لگنے والے پانچ پانچ پھل بھی اور طرح کے ہوں گے۔ پھر یہ بوٹا کم سے کم 30 پھلوں سے بھرا اور لدا نظر آئے گا۔ آپ سوچیں جس انسان اور بالخصوص استاد کی شخصیت پر اتنے خوش رنگ اور خوشنما پھل لگے ہوں وہ کس قدر قیمتی ہو جائے گا۔

خودشناسی کا شجر سایہ دار

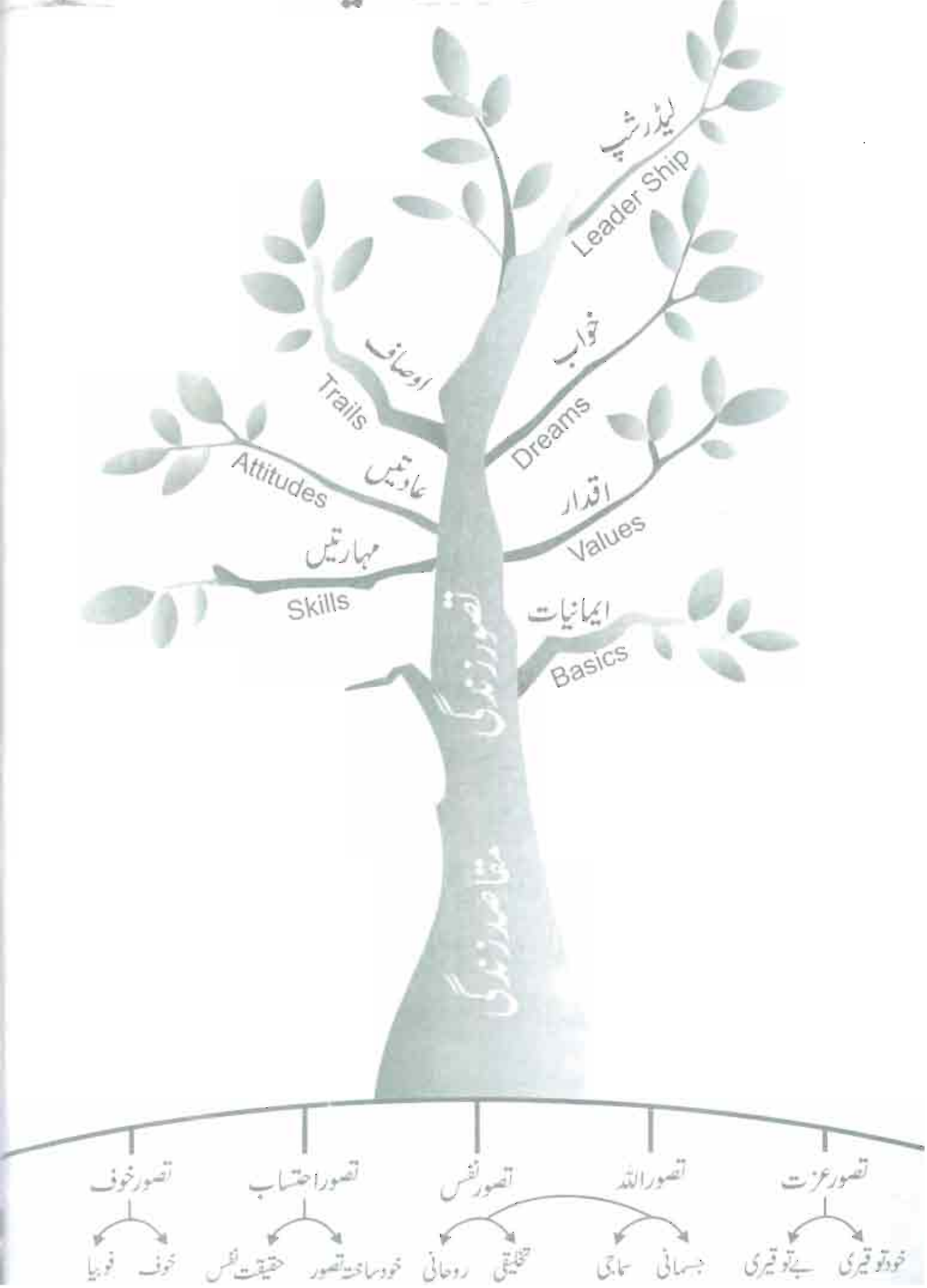

☆ پہلی شاخ اوصاف(Traits) کی ہے جس پہ لگنے والے کم سے کم پانچ پھل یہ ہیں۔

1۔ اپنے کام سے دلی محبت کرنے کا وصف

2۔ ٹیچنگ کو اپنا ذاتی کام سمجھنے کا وصف

3۔ طلبہ کی باتیں خوش دلی سے سننے کا وصف

4۔ کام کو تخلیقی انداز میں کرنے کا وصف

5۔ علم میں مسلسل اضافے کی کوشش کا وصف

ان پانچ اوصاف کے علاوہ کتنا اچھا ہو کہ اسی شاخ پہ خوبیوں کے یہ پھول بھی کھلے ہوں۔

1۔صاحب کردار 2۔ ہمدرد و غم خوار 3۔قابل بھروسہ و قابل اعتماد

4۔معاون، مددگار 5۔ مستقل مزاج و پختہ کار

☆ دوسری شاخ ویلیوز(Values) کی ہے جس پر لگے پھلوں کے نام یہ رہے۔

1۔ اخلاص 2۔ خوئے دلنوازی 3۔ لگن 4۔ باہمی احترام 5۔مثبت اندازفکر

اس شاخ پہ مزید اقدار کے پھول بھی کھل سکتے ہیں جو ایک خود شناس اُستاد کی شخصیت کو اور بھی نکھارنے کا باعث بنے گے۔

1۔مخلص و ہمدرد 2۔نرم خُو، نرم دل 3۔عزتِ نفس کا خیال 4۔ ہمیشہ اچھی اور بہتر سوچ 5۔کام سے سچی لگن

☆ تیسری شاخ مہارتوں(Skills) کی ہے جس پہ لگے پھلوں کے نام ہیں۔

1۔مسائل، واقعات اور افراد پر غور و فکر کی صلاحیت

2۔نئی کتابیں پڑھنے کی صلاحیت

3۔راہنمائی اور حوصلہ افزائی کرنے کی صلاحیت

4۔ سننے اور خوش دلی سے بات کرنے کی صلاحیت

5۔بہتر ابلاغ اور اچھا بولنے کی صلاحیت

☆ چوتھی شاخ عادتوں(Habbits) کی ہے۔اس پر لگنے والے 5 پھل یہ ہو سکتے ہیں۔

1۔صفائی کی عادت 2۔پابندی وقت کی عادت 3۔سخت محنت کی عادت

4۔دوسروں کے احترام کی عادت 5۔اچھا سوچنے کی عادت

☆ پانچویں شاخ پر رویے(Attitudes) کے پھول کھلے ہیں۔

1۔ مسکرانے اور خوش دلی سے معاملہ کرنے کا رویہ 2۔ چیزوں کو عام ڈگر سے ہٹ کر تخلیقی طور پر سوچنے کا رویہ 3۔ دوسروں کو آسانی سے قبول کرنے کا رویہ 4۔ وقت کو قیمتی جان کر استعمال کرنے کا رویہ 5۔ پریشان کن حالات میں بھی ہمت نہ ہارنے کا رویہ

☆ چھٹی شاخ پر کھلے یقین وایمان کے پھولوں میں شامل ہیں۔

1۔اللہ جی سے سچی اور بے پناہ محبت 2۔آنحضور ﷺ سے عقیدت اور ان کی پیروی کا شوق 3۔آخرت میں اپنے لیے بہترین نامہ اعمال کی تیاری 4۔والدین کی سچی محبت اور قدر کہ اللہ کا یہی حکم ہے 5۔زندگی میں ہمیشہ آگے بڑھنے اور خدمت کرنے کا جذبہ کہ یہ بھی رسول ﷺ کا حکم ہے۔ ایمانیات کی مضبوطی کلمہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، سے شروع ہو کر بہترین اور پریکٹسنگ مسلمان بننے تک جاتی ہے۔ جس قدر اچھے خوشبودار اور میٹھے پھل اس شاخ پر لگیں گے آپ اتنے ہی میٹھے، مثالی اور شاندار مسلمان بنیں گے کہ جن کی لوگ مثالیں دیں جو اللہ کے حقوق کا ہی نہیں اس کے بندوں کے ساتھ معاملات اور ان کے حقوق کی ادائی بھی عمدگی سے کریں۔ انصاف سے کام لیں۔ رشتوں میں عدل اور درگزر دکھائیں۔ اللہ کی راہ میں سب سے زیادہ خرچ کرنے والے سخی ہوں اور احسان کر کے بھول جانے والے ہوں جتانے اور دکھ دینے والے نہ ہوں۔

ظرف، طلب اور علم کے مطابق اضافہ اور کمی:

میرا ماننا یہ ہے کہ ہر استاد کے خود شناسی کے درخت کی شاخوں میں اس کے ظرف، طلب اور علم کے مطابق اضافہ اور کمی ہوتی رہتی ہے۔ کہیں خدمت خلق کی شاخ اُگی ہوگی تو اس کے پھلوں اور پھولوں کی مہک اور خوشبو الگ سے محسوس ہوگی۔

قیادت کی شاخ پر پھل اور طرح کے لگتے ہیں

وقت کو اہم جاننے اور ماننے والی شاخ کا رنگ ڈھنگ الگ ہوتا ہے

معاف کرنے والے، دوسروں کا بھلا چاہنے والے اپنے طلبہ کو دعا دینے والے، اللہ کی راہ میں دل کھول کر خرچ کرنے والے، اپنے اہل وعیال پر مہربانی کی نگاہ ڈالنے والے جو کام بتایا جائے اُس کو پوری دیانت داری سے کرنے والے، کسی کمزوری کی صورت میں غلطی ماننے والے، ہر لمحے ہر کام میں اپنے رب کی رضا چاہنے والے، معاشرے کو خیر بانٹنے اور دینے والے، بچوں کو نصابی کتابوں کے سبق سے بہت زیادہ زندگی سکھانے والے اچھی کتابوں کو ڈھونڈنے والے، اچھے لوگوں کی قدر کرنے والے، فرقوں اور مسلکوں کی بحث سے بچنے والے، سیاسی اور سماجی اختلافات کو سکول کی حدود میں نہ لانے والے، سٹاف روم میں بیٹھ کر چغلیوں، غیبتوں اور الزام تراشیوں سے بچنے والے، دوسروں کی لڑائیوں کو صلح میں بدلنے والے اپنی زبان کو بری بات کی آلودگی سے بچانے والے، "مجھے پتہ ہے" جیسے متکبرانہ لب ولہجے اور طرزِ عمل سے بچنے والے اور جن کو سیکھنے کا شوق ہو اُن کو پوری محبت سے سکھانے والے،

آگے بڑھنے والے، دور کا سوچنے سمجھنے والے، کتنے ہی ایسے پھول ہیں جن کا سوچ کر ہی طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے اور دل میں ہر استاد کی شخصیت کے درخت پر ان کے کھلے ہونے کی آرزو جاگتی ہے

خودشناسی کی مرجھائی شاخیں:

استاد کی شخصیت کی ہر شاخ پر کھلنے والے ہر پھول کے نصیب میں پھل بننا نہیں ہوتا۔ اب خود دیکھ لیں کچھ شاخوں پر خود پسندی، خود فریبی، خود غرضی، خود نمائی، بدگمانی، بدسلوکی، بدتہذیبی، بدنظری، بددلی، بدزبانی، بداخلاقی، بدنظمی، بدگوئی، بداطواری، بدلباسی جیسے کتنے ہی بے رنگ و بدذائقہ پھول ہوتے ہیں جو ہر بدن میں اگنے والے خودشناسی کے درخت پر لگتے ہیں مگر خودشناس استاد جب ان کو پانی نہیں دیتا تو ایک وقت آتا ہے یہ مرجھا جاتے ہیں۔ ہر درخت کے ساتھ ایسی کتنی ہی شاخیں اور پھول مرجھائے ملتے ہیں۔ جنہیں ہر صورت میں مرجھا جانا چاہیے ۔ اسی طرح

خود شناس استادوں کے ساتھ یہ باتیں بھی زیب نہیں دیتیں ہر لمحے شک کرنے والے، بے وجہ غصے میں بھوت بننے والے، چھوٹے بڑوں سے بے نیاز رہنے والے، تاریخ و ادب کو بے وقعت جاننے والے، ہر ملکی معاملے اور راہنما پہ تنقید کرنے والے ہر ایک کو بد دیانت کہنے والے، اپنے افسروں کا لحاظ نہ کرنے والے اپنے فائدے کے لیے بات بات پر مکر جانے والے، دوسروں سے مال و اسباب پر بری نظر رکھنے والے، ہمیشہ شارٹ کٹ کی تلاش میں دھوکا دینے والے، عزت بے عزتی کے تصور سے بے نیاز، دوسروں کی عزت نفس کو مجروح کرنے والے، کس کس کا ذکر کریں۔ آپ خود سوچیں تو سو شاخیں آپ کے سامنے پھوٹ نکلیں گی جنہیں نہیں پھوٹنا چاہیے مگر جگہ جگہ نظر آتی ہیں، انہی کو تو مل جل کر کاٹنا ہے۔

تصورذات کو بدلے بغیر کسی کے رویے کو نہیں بدلا جا سکتا:

یاد رکھیے آپ کی زندگی میں کوئی بھی اہم تبدیلی اس وقت تک نہیں آتی۔ جب تک استاد کا تصور ذات نہیں بدلتا۔ تصور ذات ہمارے رویے کو بھی کنٹرول کرتا ہے۔ اسے بدلے بغیر کسی کے رویے کو نہیں بدلا جا سکتا۔ کامیابی کے لیے بہترین تیاری یہ ہے کہ آپ کا تصور ذات بہت صحت منداور مضبوط ہو۔ پھر آنے والے دنوں میں یہ آپ کی خوشیوں کا ضامن ثابت ہوگا۔ کامیابی میں معاون ثابت ہوگا۔ جس کو جتنی بڑی عزت اور مقام چاہیے۔ اس کو تصور بھی اتنا ہی مضبوط رکھنا ہوگا۔ ورنہ صورت بالکل مختلف ہوگی۔

مثلاً میرے دفتری معاون یعنی اسسٹنٹ محمد سلیم کا تعلق بھکر سے ہے۔ وہ بہت دھیمی طبیعت کا مالک ہے۔ میں نے اسے ہمیشہ نیک نیت اور محنتی پایا ہے۔ اس سے پہلے میرا جو اسسٹنٹ تھا۔ وہ اس سے آدھی تنخواہ لیتا تھا اور خوش تھا۔ اس نے انٹرویو کے بعد کہا تنخواہ تھوڑی ہے میرا گزارا نہیں ہوگا۔ میں زیادہ گھنٹے کام کروں گا۔ تنخواہ زیادہ کردیں۔ حیرت انگیز طور پر اس کو اتنی تنخواہ ملنے لگی جتنی وہ چاہتا تھا۔ کم تنخواہ کی وجہ سے وہ ایک سرکاری نوکری چھوڑ آیا تھا۔ میرے دفتر میں اس کی عزت ہے۔ میری غیر موجودگی میں وہ پورا دفتر دیکھتا ہے۔ دوسرے سٹاف سے کام لیتا ہے۔ ان کے آنے جانے کا خیال رکھتا

ہے۔ان کی تنخواہ کی لسٹ بناتا ہے۔فیس بک پر پوسٹ کرنے کے لیے میری میل بناتا ہے۔اس عزت اوراحترام کی اسے بھی دل سے خوشی ہوتی ہے۔ایک روز کیا ہوا کہ وہ میرے پاس آیا اور ہائی کورٹ سے آیا ایک کال لیٹر دکھانے لگا۔اگلے روز اسے انٹرویو کے لیے بلوایا گیا تھا۔

سر! مجھے گائیڈ کردیں کہ انٹرویو کیسے دوں:

میں عام طور پر بڑا لحاظ کرنے والی طبیعت کا مالک ہوں مگر اس کا کال لیٹر دیکھ کر میرے تن بدن میں نظر نہ آنے والی آگ لگی ہوئی تھی کہ میرے ساتھ کام کرتے ہوئے اسے عزت، احترام اور وقعت حاصل ہے۔ میرا واچ مین اور پی ای این سارا دن آفس سے باہر بیٹھتا ہے۔ گرمی سردی دھوپ چھاؤں سہتا ہے اس لیے کہ اس نے اپنے لیے وہی کام پسند کیا۔اب یہ سرکاری نوکری کے چکر میں ہائی کورٹ میں نائب قاصد یا دفتری بن کر بیٹھے گا۔اسے ذرا خیال نہیں آئے گا۔سارا دن ججوں، منشیوں، وکیلوں، اہل کاروں کی اچھی بری باتیں سنے گا۔گھوڑے کی طرح ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک بھاگتا جائے گا۔ چپڑاسیوں والی ٹوپی اور وردی پہنے گا تو اسے دکھ نہیں ہوگا۔ سرکاری نوکری کے شوق میں یہ کیا کرنے لگا ہے۔ سچ بتاؤں تو ان چند لمحوں میں میں نے اس کی شادی، بچے اور بچوں کو بڑے ہوتے بھی دیکھ لیا۔رشتہ لینے آنے والوں نے پوچھا کہ بیٹی کا باپ کیا کرتا ہے تو خاتون سر جھکا کر جواب دیتی ہے کہ سرکاری نوکر ہے، چپڑاسی ہے۔

سلیم نے مجھے دوبارہ پوچھا سر! انٹرویو کیسے دوں! سوال اس کا صحیح تھا، بے ضرر تھا اور ضروری بھی۔ظاہر ہے پورے ملک سے لڑکے۔لڑکیاں ایم اے کر کے میرے پاس آتے ہیں۔3 ہزار روپے فیس دیتے ہیں پھر میں ان کو سکھاتا ہوں کہ انٹرویو کیسے دینا ہے، ناکام انٹرویو سے کیسے بچنا ہے اور کامیاب ہوکر نوکری کیسے کرنی ہے، الحمدللہ وہ کامیاب بھی ہوجاتے ہیں۔

میں نے سلیم کی طرف دیکھا اور بڑی بے مروتی اور بے نیازی سے کہا

''میں نائب قاصد بننے کے لیے کسی انٹرویو کی تیاری کراتا ہوں نہ راہنمائی دیتا ہوں''

اس کے بعد میں نے خاموشی سے اپنا کام شروع کر دیا مجھے اس کی خودشناسی میں کمی پر دکھ ہی

نہیں بلکہ اذیت محسوس ہو رہی تھی، ساتھ یہ بھی افسوس تھا کہ میرے ساتھ کام کرتے ہوئے اس نے آگے بڑھنے کی بجائے کھائی میں گرنے کا کیوں سوچا۔ ایف اے پاس ہے بی اے کرنے پر لگا یا ہوا ہے۔ کل بی ایڈ کرے اور اپنے گاؤں جا کر مزے سے سرکاری ماسٹر لگ جائے۔ ایم اے کرے تو پھر بے شمار نوکریاں اس کے لیے منتظر ہوں گی۔ سپاہی بھرتی ہو کر کوئی آدمی لیفٹنٹ کرنل بننے کا خواب نہیں دیکھ سکتا۔ تب ممکن ہی نہیں رہتا۔

یہ خودشناسی کی بدترین مثال مانی جاتی ہے:

کئی سال پہلے ایک ایم اے پاس لڑکے کو انٹرویو لینے والے پورے پینل نے اس بنیاد پر مسترد کر دیا تھا کہ اس نے ایک ڈویژنل پبلک سکول میں ٹیچر کے لیے اپلائی کرنے کے ساتھ ساتھ وہاں نہ صرف کلرک بلکہ پی اون کے لیے بھی اپلائی کیا ہوا تھا۔ یہ خودشناسی کی بدترین مثال مانی جاتی ہے کہ آپ کو اپنے آپ پر اچھی نوکری پا لینے کا پہلے سے ہی یقین نہیں ہے اس لیے ساتھ ہی کمتر کے لیے گنجائش رکھ لیتے ہیں۔

اگلے روز سلیم کا انٹرویو تھا۔ انٹرویو کے لیے کئی سولڑکے سارا دن قطاروں میں کھڑے باری کا انتظار کرتے رہے۔ جب اس کی باری آئی تو انہوں نے پوچھا کیا کام کرتے ہو۔ اس نے بتایا کہ ایک ٹریڈنگ کمپنی میں اسسٹنٹ ہوں۔ اگلا سوال تھا۔ کون سی کمپنی اس نے کہا ہائی پوٹینشل آئیڈیاز۔ انٹرویو لینے والے حیرت سے پوچھا اختر عباس صاحب کی کمپنی میں پھر اس نے بے یقینی سے دوبارہ پوچھا تم واقعی ان کے ساتھ کام کرتے ہو!

پھر پوچھا چوری آئے ہو یا بتا کر۔ اور کیا انہیں علم ہے کہ کس نوکری کے لیے آئے ہو؟ اس نے بتایا کہ سخت ناراض تھے۔ انہیں حیرت ہی نہیں افسوس بھی تھا کہ ایک اچھا خاصا سمجھدار، دیکھنے میں اچھا لڑکا اپنے بارے میں کس طرح کا فیصلہ کر رہا ہے پھر انہوں نے ایک غیر متعلق سوال پوچھا کہ بادشاہی مسجد کس نے بنائی سلیم نے بڑبڑا کر کہا بہادر شاہ ظفر نے۔ انہوں نے قہقہہ لگایا اور کہا "جا کر اختر صاحب کو بتا دینا کہ بادشاہی مسجد تم نے بہادر شاہ ظفر کے نام لگا دی ہے۔"

ایک سلیم ہی نہیں ہمارے آس پاس موجود سینکڑوں اور ہزاروں نوجوان سکول کالج سے پڑھ کر بھی نہیں جان پاتے کہ انہیں اصل میں چاہیے کیا! اور جو وہ چاہتے ہیں اس کا مستقبل کیا ہے۔ اور اس کے فیصلے اور پسند کا اس کے مستقبل اور بچوں پر کس قدر اچھا یا برا اثر پڑے گا۔ اخبارات میں نوکریوں کے اشتہار دیکھ کر کبھی کوئی عقل مند ہر اشتہار دینے والے کو درخواست نہیں بھیجتا۔ پہلے یہ سوچتا ہے میں کیا ہوں۔ میرے خواب اور ضرورتیں کیا ہیں۔ کیا پکی نوکری لیتے لیتے میں ساری عمر عزت سے محروم تو نہیں ہو جاؤں گا؟ جہاں ترقی نام کو نہ ہو وہاں ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کیا ہر روز رزق حرام کا انتظار رہا کرے گا اور کیا اپنی پیاری اولاد کے خون میں لقمہ لقمہ حرام کا شامل کرتے ہوئے خود کبھی خیال نہیں آئے گا کہ میں نے یہ کیا کر دیا؟

خودشناسی، کیریئر اور کردار کی کنجی:

آپ کی خودشناسی ہر معاملے میں آپ کی کارکردگی کو کنٹرول کرتی ہے۔ کسی بھی شعبے میں آپ کی کارکردگی کا براہ راست تعلق اس چیز سے ہے کہ اس فیلڈ میں آپ کی دلچسپی کیسی ہے؟ خودشناسی انسان کی شخصیت، طرز عمل اور کردار کی کنجی ہے، دوسرے لفظوں میں انسان کی کامیابی کی حدود کا تعین بھی اس کی خودشناسی ہی طے کرتی ہے۔ آپ اپنی خودشناسی کو بڑھا کر اپنی کارکردگی اور کامیابیوں کے دائرے کو بے حد وسیع کر سکتے ہیں۔

آپ کے اعتقادات کے نظام میں کیا شامل ہے:

خودشناسی میں وہ اعتقادات بھی شامل ہوتے ہیں جو آپ نے اپنے بارے میں اپنے ماحول سے حاصل کیے ہوتے ہیں۔ آپ کے اعتقادات کے نظام میں وہ سب اعتقادات شامل ہوتے ہیں جو آپ اپنے بارے میں اور آپ کے خاندان والے استاد اور دوست احباب آپ کی زندگی کے بارے میں رکھتے ہیں۔ یہ صحیح ہو سکتے ہیں اور غلط بھی۔ مگر اہم چیز یہ ہے کہ آپ اس کا کتنا یقین کرتے ہیں۔

ہمارے گاؤں کے مولوی ایوب صاحب کے ایک لڑکے کے بارے میں سب کہتے تھے لفنٹر

ہے۔ برسوں بعد میں نے حاصل پور سے اپنے گاؤں جانے والی بس پر اسے کنڈیکٹر دیکھا۔ اس کا نام شفیق تھا۔ اس کا کہنا تھا سارے کہتے تھے، فارغ ہے یہ کچھ نہیں کر سکتا سوائے بس کنڈیکٹری کے، میں نے بھی یہی کر لی۔ آپ کی خودشناسی اس چیز کا تعین کرتی ہے کہ آپ کسی طرح سوچتے ہیں۔ پھر وہی آپ کا انتخاب بن جاتا ہے۔

ہر کام میں آپ کی کارکردگی کیسی ہے:

یہ بھی خودشناسی طے کرتی ہے۔ آپ کی بہت سی چھوٹی چھوٹی خودشناسیاں بھی ہوتی ہیں جو زندگی کو متاثر کرتی ہیں، طے کرتی ہیں کہ آپ کا حلیہ کیسا ہوگا؟ آپ کا وزن کتنا ہوگا؟ حتیٰ کہ یہ بھی کہ آپ لباس کس طرح کا پہنیں گے؟ لوگوں میں آپ کیسے لگیں گے؟ کیسے بولیں گے؟ دوستوں میں کتنے مقبول ہونگے؟ اور یہ بھی کہ کونسا کھیل کتنا اچھا کھیل سکتے ہیں؟ حیران کن طور پر یہ بھی کہ آپ اپنے شعبے میں کتنے ماہر ہوں گے؟ اور ماہانہ کتنا کمانے کے اہل ہوں گے؟

جیسا محسوس کرتے ہیں ویسا ہی عمل کرنے لگتے ہیں:

آپ کبھی بھی اپنی خودشناسی سے زیادہ نہیں کما سکتے۔ تاہم آپ کی خودشناسی کی بنیاد حقیقت نہیں ہوتی بلکہ آپ کے عقائد ہوتے ہیں، یعنی وہ چیز جس کو آپ صحیح سمجھتے ہیں، چاہے وہ صحیح نہ بھی ہو خودشناسی ہی آپ کو بتاتی ہے کہ آپ کیسے استاد ہو، کیسے پرنسپل ہو

☆...... آپ کیسے بیٹے ہو۔ کیسی بیٹی ہو؟...... کیسے بھائی ہو۔ کیسی بہن ہو؟

☆...... کیسے دوست ہو۔ کتنے قابل بھروسہ ہو؟...... کیسے کھلاڑی ہو۔ کتنے قابل فخر ہو؟

☆...... کتنے دیانتدار ہو۔ دوستوں میں کیسے ہو؟...... اکیلے میں کیسے ہو؟ کیسے پاکستانی ہو؟

☆...... کیسے مسلمان ہو؟ رسول سے کتنی محبت ہے، اللہ سے کتنے قریب ہو؟

کہا جاتا ہے آپ جیسا سوچتے ہیں، ویسے ہی بن جاتے ہیں۔

اپنے بارے میں ہماری رائے ہر چیز کو متاثر کرتی ہے۔ ہماری کارکردگی، تعلقات اور کامیابیاں اس کے زیر اثر بہتر اور بدتر ہوتی ہیں۔ آپ اپنے بارے میں جیسا سوچتے ہیں، ویسا ہی

محسوس کرتے ہیں اور پھر ویسا ہی عمل کرتے ہیں۔

ہماری خودشناسی زندگی کے تجربات سے حاصل ہوتی ہے۔ یہ ہمارے خیالات، آئیڈیاز تجربات مشاہدات اور اعتقادات کا مجموعہ ہوتی ہے یہ بچپن ہی سے تشکیل پانا شروع ہو جاتی ہے۔ اور بڑے ہو کر ایک پورا تناور درخت بن جاتی ہے۔

دونوں ایڈیٹرز کے خواب پورے ہوئے:

میں بچپن سے بچوں کے رسالے نونہال، تعلیم و تربیت، جگنو اور بچوں کی دنیا کے ساتھ ساتھ بڑوں کا بڑا ہی خوب صورت رسالہ ''سب رنگ'' پڑھتا رہا۔ اس کے ایڈیٹر شکیل عادل زادہ نے یہ رسالہ تب سوچا اور اس کا خواب دیکھا جب ان کی جیب میں کل 14 آنے تھے۔ تصور ذات ہی آپ کے ارادوں کو منزل پر لے کر جاتا تھا۔ اللہ رب العزت نے ان کو اتنی عزت دی کہ نہ صرف وہ رسالہ نکلا بلکہ ایک دنیا نے اس کی کاپی کی۔ اس جیسے نام رکھ کر کتنے ہی اور رسالے نکالے، سات رنگ، ست رنگ، صد رنگ، شب رنگ، مگر کسی کا چراغ نہ جلا۔ مجھے ان کا انداز تحریر بے حد پسند تھا اور ان کا اندازِ فکر بھی، پھر پتا چلا کہ دنیا کے سب سے بڑے رسالے ریڈرز ڈائجسٹ کے ایڈیٹر ڈی وٹ ویلس (۱۲ نومبر ۱۸۹۲۔ ۳۰ مارچ ۱۹۸۱) نے بھی کچھ ایسا ہی خواب دیکھا تھا کہ میرے بعد میرے جیسا کوئی ڈائجسٹ نہ نکال سکے نہ بنا سکے، اس نے پہلا شمارا ۱۹۲۲ء میں نکالا تھا جو چند سال پہلے تک سترہ ملین شائع ہو رہا تھا۔ دونوں کے خواب پورے ہوئے۔ سب رنگ اردو کا اور ریڈرز ڈائجسٹ انگریزی کا سب سے بڑا رسالہ مانے گئے۔ کراچی میں شکیل عادل زادہ کے گھر جا کر ملنا اور انہیں سننا آج بھی مجھے یاد ہے۔ ہمارے عزیز دوست سلیم مغل نے اس خوشی کا انتظام و اہتمام کیا تھا۔ سب رنگ ۱۹۷۰ میں شروع ہوا تھا جب شکیل صاحب نے عالمی ڈائجسٹ کو چھوڑا تھا، دو سال کے بعد یہ پچاس ہزار کو عبور کر گیا تھا۔

میں نے زندگی میں جہاں کام کیا۔ یہ خواہش اور خیال ہمیشہ میرے دائیں بائیں رہا کہ جو کام کروں ویسا کام میرے بعد دو چار لوگوں سے مل کر بھی نہ ہو سکے۔ کسی کو یہ بات اچھی لگے یا بُری سچ یہی

ہے کہ میں اپنی عمر اور منصب کے لوگوں سے کام ہمیشہ زیادہ کرتا ہوں اور رو رو کر نہیں کرتا۔ خوش ہو کر، محبت سے، سچے دل سے، یوں بچپن کا وہ تصور ہمیشہ مسکراتا ہوا مجھے قوت دیتا ہے۔ ان دنوں میں اسلام آباد میں کشمیر کی سب سے بڑی تعلیمی فاؤنڈیشن ریڈ کے ساتھ کام کر رہا تھا، اس کے اساتذہ کی تربیت ،، طلبہ کی لیڈر شپ کے ایک سالہ پروگرام یوتھ لیڈر شپ پر دل و جان سے مصروف تھا اور اسلام آباد ہی مقیم تھا جب سب رنگ ایک نئے پبلشنگ گروپ نے خرید لیا۔ ان کے اخبار اشراق کے ایڈیٹر ظہیر احمد بابر نے رابطہ کیا کہ آپ سب رنگ کے مدیر کے طور پر آ جائیں۔ یہ خوشی اعزاز سب کچھ تھا مگر تب کراچی جا کر رہنا ممکن نہ تھا، ۲۰۰۶ کا کراچی آپ تصور کر سکتے ہیں سو معذرت کر لی مگر میں آج بھی سوچنے میں حق بجانب ہوں کہ اگر آپ کو کسی چیز کا شوق ہی نہ ہو تو پھر اس شعبے میں ترقی اور عزت کا سوچ بھی کیسے سکیں گے۔ لکھنے پڑھنے کا نہ ختم ہونے والے شوق ہی میرے لئے اردو ڈائجسٹ کی ایڈیٹر شپ کی دعوت لایا جسے میں نے جون ۲۰۱۱ میں جوائین کیا اور اگلے تین برس اسے اپنی واحد توجہ اور محبت کا مرکز بنائے رکھا۔ یہاں آنے میں میں نے پورا ایک سال لیا تا کہ یونیورسٹی میں تین سال مکمل ہو جائیں اور جو بچے مجھ سے پڑھ رہے تھے ان کی کوئی چیز ادھوری نہ رہے۔ یہ اپنی اپنی کومٹ منٹ اور اپنے مزاج کا مسئلہ ہے، اسی طرح ریڈ جس کے کشمیر میں ساڑھے تین سو سے زائد سکولز تھے کے ساتھ کام کے دوران ہوا۔

بچوں کی تربیت کے اس منصوبے میں ایک اور کنسلٹنٹ بھی تھے، بعد میں ان سے اچھی دوستی ہوگئی مگر اس کام کے لیے وہ ایک دو بار اسلام آباد آئے اور اپنی رپورٹ جمع کرا کے واپس چلے گئے جبکہ میں نے ہیڈ آفس ڈیرے لگا لیے اور منصوبے کی تفصیلات طے کرنے لگا۔ لاہور میں 2005-2006 میں روزنامہ پاکستان کے ساتھ وابستہ تھا اور قومی ڈائجسٹ کا ایڈیٹر تھا تو جناب مجیب الرحمٰن شامی نے ایک بڑا ہی شرارتی کمپوزر آفتاب مجھے دے دیا۔ وہ ہرا لئے سیدھے کام کا شوقین مگر کام کے معاملے میں کسی جن کی طرح تھا۔ ساری رات کام کرواتے رہیں اس کے ماتھے پر شکن نہ آتی۔ میں نے اسے اسلام آباد بلا لیا حالانکہ مجھے ادارہ چھوڑے ہوئے کئی سال ہو گئے تھے۔ بس پھر ہم شروع ہو گئے۔ میں پڑھتا اور لکھتا جاتا، وہ ڈیزائن کرتا جاتا اور ہم فلیکس بناتے جاتے۔

کارڈز، فلیکس، آیات، جملے، تعارف، نیوز لیٹرز، ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ وہ کئی بار ٹریننگ سیشن کے لیے میرے ساتھ مظفرآباد جاتا اور خوشی خوشی سارے فلیکس لگاتا، بینرز آویزاں کرتا۔ اگر آپ کے پاس اپنا تصور نہ ہو تو آپ کسی سے کام کروا نہیں سکتے۔ اپنی سوچ نہ ہو تو تبدیلی کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ نئے نئے ڈیزائن اور لے آؤٹ بنے، خوبصورت جملوں اور احادیث سے انہیں سجا دیا گیا اور انہی کی روشنی میں، پورا ایک سال یوں گزر گیا کہ پتا بھی نہ چلا۔ میں ہر ہفتے 700 کلومیٹر طے کرتا۔ اسلام آباد سے مظفرآباد اور وہاں سے گوجر بانڈی، چناری، کھوئی رٹہ، گڑھی دوپٹہ، ہٹیاں بالا، اور سراں تک جاتا، بچوں کا انتخاب کرتا، پھر ان کی ورکشاپ کراتا، سکول کے اساتذہ سے خطاب کرتا۔ سکول کی بہتری کے لیے مشورے دیتا، پروگرام کرتا۔ بچوں کو بولنا، اٹھنا، سکھاتا، چار ویلیوز تھیں اس پراجیکٹ کی، ان پر بہت عمدہ چیزیں تیار کی تھیں۔ جن کو یونی سیف والوں نے بھی پسند کیا اور فالو کیا۔ بچوں کیلئے یہ ایف سی اولندن کا ایک عمدہ پراجیکٹ تھا، پراجیکٹ کے اختتام پر ریڈ کے اساتذہ اور پرنسپلز کو ای ایل ایم کی ڈگری مکمل کروائی اور ٹوٹل کوالٹی ان ایجوکیشن کا کورس مکمل کروایا۔ یہ ڈگری انہیں یوایم ٹی نے جاری کی

یہ کام میرے لیے صرف ایک ٹاسک نہیں تھا:

چونکہ کام اور پیغام میں ذوق بھی تھا اور خوب صورتی بھی اس لیے ہر جگہ پسند کیا گیا، سراہا گیا۔ یہ کام میرے لیے ایک ٹاسک نہیں تھا بلکہ اللہ کے رسول ﷺ کا وہ وعدہ تھا کہ تمہارے ذریعے کسی ایک کو بھی ہدایت ملی تو وہ سو سرخ اونٹوں سے بہتر ہوگی۔ اسی لئے دل و جان سے کیا۔ جبکہ مجھے کہا جاتا رہا کہ آپ بھی دوسرے کنسلٹنٹ کی طرح رپورٹ جمع کراؤ اور واپس جاؤ۔

بچپن سے ہی میرے ابو اور امی نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے جو محبت سکھائی تھی۔ انہی کی خوشی اور خوشنودی کو سرفہرست بتایا تھا۔ اس تصور میں آج تک نہ تبدیلی آئی نہ کمی آئی۔ علم مطالعے تربیت اور اللہ کے خصوصی کرم نے اس تعلق کو اور مضبوط کیا۔ اپنے ہر کام کو اپنی خوشی اور رضا سے جوڑا۔

کیا مجھے بالآخر اپنے ابو جی اور دادا جی جیسا بننا ہے:

بچپن میں جب بھی سردیوں کی چھٹیوں میں گاؤں ۲۰۹ مراد جاتے تو دادا جی کو صبح صبح (سرگی کے وقت) اُٹھتے دیکھتے۔ پاتھیوں (خشک گوبر) سے ساری رات گرم ہونے والے پانی سے وہ وضو کرتے اور تہجد پڑھ کر ہم چھوٹے چھوٹے پوتوں کو اٹھاتے اور ہم نیم کھلی آنکھوں سے مٹی کے مٹکے سے گرم گرم پانی سے وضو کر کے ان کے ساتھ ساتھ مسجد جاتے۔ دل میں یہ خیال ہوتا کہ کھیتوں پر جا کر گنے سے رس نکلنے اور گڑ بننے کے مراحل میں ان کے پاس بیٹھنے کا موقع ملے گا۔ وہ خوش ہوں گے تو زیادہ خاطر داری ہوگی۔ میں نے اپنے دادا جی کو مسجد سے واپسی پر چاشت اور اشراق کے نوافل پڑھتے اتنی باقاعدگی سے دیکھا کہ میری یادوں کا حصہ بن گئے ہیں۔ اپنے بہانوں سے ابھی تک تو میں اس عادت کو اختیار کرنے سے ٹال رہا ہوں لیکن میں بخوبی جانتا ہوں مجھے بالآخر اپنے ابو جی اور دادا جی جیسا ہی بننا ہے، داڑھی تھوڑی اور بڑھ جائے گی۔ نماز میں شغف، محبت اور توجہ میں اضافہ ہو جائے گا، یہاں تک کہ یہ واحد محبت رہ جائے گی، اسی میں میری خوشی ہوگی اور اسی میں میرا اختتام بالخیر ہوگا۔ انشاء اللہ۔ ہاں اس بیچ میں کردار سازی اور شخصیت سازی پہ ڈھیروں چیزیں لکھ چکا ہوگا۔ جو میرے لیے صدقہ جاریہ ٹھہرے گا۔ یہ تصویر میری توقیر ذات کی اس تصویر کے عین مطابق ہے جو میرے ذہن میں موجود ہے۔

اپنی عادت بنایئے کہ آپکی نگاہیں آپکے کنٹرول میں رہیں۔ لڑکیوں کو دیکھ کر دل میں بُرے خیالات نہ آئیں نہ دوسروں کے ساتھ بیٹھ کر بے حیائی کی باتیں کرنے کو اپنا معمول بنائیں، یہ گناہ بے لذت بطور استاد آپکی شخصیت کو برباد کر کے رکھ دیتے ہیں

اپنی عزت اور عصمت کا ہمیشہ کسی ہیرے کی طرح دھیان رکھیں اور حفاظت کریں، بدلے ہوئے عہد میں نوعمر طلبہ طالبات سے ہمیشہ ایک فاصلہ بنا کر رکھیں، آپکو دوسروں کی بُری نگاہ اور بُری نیت دونوں کی پہچان ہونی چاہیے۔ ہمیشہ اپنے آپ کو اللہ کی پناہ میں دے کر گھر سے نکلیں، انشاء اللہ رب

رحیم ہر طرح کے شیطانوں سے آپکو محفوظ رکھے گا جو اپنے قریبی عزیزوں میں بھی ہوتے ہیں اور اجنبیوں میں بھی اور طلبہ و طالبات میں بھی۔ سیانے کہتے ہیں علم خودشناسی اور حیا میں بڑی ہیبت اور عظمت ہوتی ہے اگر کسی استاد کی ذات میں یہ دونوں جمع ہو جائیں تو اس سے بہتر کوئی نہیں اور اگر رخصت ہو جائیں تو اس سے بدتر کوئی نہیں۔

خودشناسی میں سفید اور کالے پتھروں کا مقابلہ:

ایک بزرگ استاد سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ آپ نے اپنی زندگی کو اتنا کامیاب کیسے بنایا، محسوس ہوتا ہے کہ آپ کا مقام نہ صرف اللہ کے نزدیک نہایت اعلیٰ ہے بلکہ انسانوں میں بھی آپ نیک اور باوقار جانے جاتے ہیں؟ کامیاب جانے جاتے ہیں بزرگ استاد نے فرمایا ''میں آپ ہی کی طرح اپنی زندگی گزار رہا ہوتا، روزمرہ کے کام سرانجام دے رہا ہوتا لیکن برسوں پہلے میں نے غور کیا اور اپنے آپ کو پہچان لیا۔ اس خودشناسی اور خودآگاہی کے بعد میں اپنے آپ کا ہر موڑ پر اور ہر روز تجزیہ کرتا ہوں۔ اپنا بے لاگ محاسبہ کرتا ہوں۔ میں نے اپنے پاس دو تھیلیاں رکھی ہیں اور دو قسم کے چھوٹے چھوٹے پتھر جمع کر رکھے ہیں، کچھ کالے رنگ کے ہیں اور باقی سفید رنگ کے، جس دن مجھ سے کوئی غلط کام سرانجام ہو جاتا ہے، کوئی کوتاہی سرزد ہو جاتی ہے تو میں کالا پتھر تھیلی میں ڈال دیتا ہوں اور جب کوئی اچھا کام سرانجام پا جائے تو سفید پتھر تھیلی میں ڈال دیتا ہوں۔ رات جب سونے کا وقت قریب آتا ہے تو دونوں تھیلیوں سے پتھر نکال کر انھیں گنتا ہوں، اگر کالے پتھروں کی تعداد زیادہ ہو جائے تو اللہ کی عبادت میں مشغول ہو جاتا ہوں اور رو کر معافی مانگتا ہوں کہ میں اپنا آج اپنے کل سے بہتر نہ بنا سکا اور اگر سفید زیادہ ہو جائیں تو تب زیادہ شدت سے شکرانے کے طور پر عبادت میں مشغول ہو جاتا ہوں اور اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں تو اس سے مجھے اپنے آپ سے روشناس کرایا، اپنے اچھے ہونے کو ماننے اور بہتر کرنے کی عقل اور فہم سے نوازا۔ اس طرز عمل اور سوچ نے مجھے اپنے رب کی محبت سے ہمکنار کیا۔ اس کی قربت سے سرشار کیا۔ خودآگاہی نے مجھے بتایا کہ میں کہاں کھڑا ہوں اور مجھے بچوں کو تعلیم دینے میں کہاں ہونا چاہیے تھا۔ اس کی مدد سے مجھے اپنا راستہ درست کرنے میں

مدد ملتی ہے۔ اپنی زندگی کو زیادہ کارآمد بنانے کا راستہ اور ترغیب ملتی ہے۔"

یہ کوئی آسان کام نہیں ہے ہر مسکراتے استاد کے اندر بڑی ضد ہوتی ہے اور جھوٹی انا بھی، جو اسے اپنی غلطی، کمی، کمزوری اور کوتاہی ماننے نہیں دیتی۔ دماغ سو سو دلیلیں دیتا ہے کہ اصل میں اس کمزوری کی وجہ کس قدر مضبوط ہے اور اس کے سامنے میں کتنا مجبور۔ یہ سوچ اسے انکار اور تردید کے اس چھوٹے مقام پر لے جاتی ہے کہ جہاں استاد نہ صرف انسانوں کی نگاہوں سے گر جاتا ہے بلکہ اپنے خالق اور مالک کے پسندیدہ مقام اور مرتبے سے بھی محرومی اس کے نام لکھ دی جاتی ہے۔ خود آگاہ استاد غلط تو کر سکتا ہے کہ اسے غلطی دور کرنے کا جذبہ میسر ہوتا ہے اور وہ درست راستہ سے دوبارہ رجوع کرنے پر بھی تیار ہوتا ہے مگر خود شناسی سے محروم ہو جانے والا غلطی پہ دلیل دینے کی گستاخی کا مرتکب ہوتا ہے۔

جان رکھیئے غلطی معاف ہے، گستاخی نہیں۔ میں خود بھی جان گیا ہوں کہ بطور استاد سفید اور کالے پتھر کی لڑائی اور مقابلہ زندگی کے آخری سانس تک چلنا ہے اور مجھے بہر حال سفید پتھروں کا ساتھ دینا ہے۔ انہی کا سوچنا اور اسی سوچ کو غالب کرنا ہے کہ خود کو جان لینے کا علم اسی کی خبر دیتا ہے اور اسی کی حفاظت پر اکساتا ہے

کیسے بدلتی ہے بڑی سوچ کمزور زندگیوں کو:

سپیریئر یونیورسٹی لاہور میں مینجمنٹ سائنسز کی ایک سال تک سربراہی کے بعد اچانک مجھے کامرس ڈیپارٹمنٹ کا سربراہ اور پروگرام مینجر بنا دیا گیا۔ بتایا گیا کہ وہاں طلبہ میں بہت زیادہ ڈی موٹیویشن (Demotivation) تھی۔ جب بھی کسی طالب علم کا خود سے اعتماد اٹھ جائے تو وہ Demotivation کا ضرور شکار ہو جاتا ہے۔ یہاں جسمانی طور پر بھی تگڑے اور بعض کا ایسے "جگے" قسم کے گروپس تھے جو کسی استاد کی نہ سنتے تھے۔ امتحانوں کے دوران بھی بدتمیزی اور بدتہذیبی کے مظاہرے کرتے کہ کوئی ان کے منہ نہ لگتا۔ نئے شعبے کے کام کو ابھی سمجھنے اور جاننے کی کوشش میں تھا جب ایک روز ریکٹر صاحب نے اسٹاف کے لیے ایک خصوصی موٹی ویشنل ٹریننگ کا اعلان کر دیا

۔اس سے قبل اساتذہ کے لیے ٹریننگز، سیمینارز تو آئے دن ہوتے رہتے تھے مگر یہ کچھ خاص تھا۔

آسٹریلین یونیورسٹی آف نیوکیسل کے نام سے موسوم آڈیٹوریم میں اندھیرا تھا اور سکرین پر ایک عجیب سا آدمی میز پر بیٹھا تھا۔ بیٹھا تھا کہنا شائد مناسب نہیں ہوگا چونکہ وہ کھڑا تھا مگر اس عالم میں کہ اس کے دونوں پیر سرے سے غائب تھے۔ ٹانگیں بھی نہیں تھیں اور ٹانگوں کی جگہ کولہوں سے باہر کی جانب دو انگلیوں پر مشتمل ایک چھوٹا سا پیر نکلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ یہ نک وجائسک (Nick Vujicic) تھا۔ پچیس تیس سال پہلے آسٹریلیا کے شہر ملبورن میں پیدا ہونے والا ایک عجیب الخلقت بچہ جو اپنی پیدائش کے ساتھ دنیا کے لیے ایک عجیب سی بیماری بھی ساتھ لایا تھا۔ کندھوں کے قریب سے اس کے دونوں بازو غائب تھے۔ اس معذوری کی کوئی لمبی چوڑی وجہ آج تک سامنے نہیں آئی ۔میں حیرت سے اس خوش شکل، خوش مزاج مگر نامکمل انسان کو پورے وجود سے دیکھ رہا تھا۔ بے شک اس کے والدین نے اسے زندگی کی ہر نعمت سے ہمکنار کیا مگر ابتدائی آٹھ سال وہ اپنی جسمانی حالت کو ذہنی طور پر قبول ہی نہیں کر سکا۔ اس کا حال اور مستقبل دونوں تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ نہ کوئی امید تھی اور نہ کوئی اندھیرے سے نکلنے کا راستہ۔ دس سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ پانی کے ٹب میں تین بار ڈوب کر مرنے کی کوشش کر چکا تھا مگر ناکام رہا۔ ایک روز اس نے غصے سے اپنا وہ پاؤں بھی زخمی کر لیا جس سے وہ ٹائپنگ کیا کرتا تھا، کھانا کھاتا تھا حتیٰ کہ سوئمنگ کرتا تھا۔

اس جسمانی چوٹ نے پہلی بار اسے خود کو سمجھنے، اپنی تکلیف اور راحت کا فرق جاننے کا احساس دلایا۔ یہی وہ دن تھے جب نک نے رب پر بھروسا کرتے ہوئے اپنی معذوری سے لڑنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے تعمیری سوچ کے ساتھ مثبت کاموں کو اپنا مقصد زندگی ٹھہرا لیا۔ اور ایک چیریٹی کے ساتھ مل کر کام کا آغاز کر دیا۔ لائف ود آؤٹ لمب (Life without Lemb) کے نام سے ایک این جی او قائم کی۔ سکول میں اس کی کارکردگی حیران کن تھی۔ فلاحی کاموں کے ساتھ ساتھ اس کی تعلیم کا سلسلہ جاری تھا یہاں تک کہ اکیس سال کی عمر میں اس نے اکاؤنٹنگ اور فنانشل پلاننگ جیسے مضامین میں بیچلر آف کامرس کی ڈگری حاصل کر لی۔

اس کا استاد ایک خاکروب تھا:

سکرین پر نک اپنے سامنے بیٹھی لڑکیوں سے مخاطب تھا اور یونیورسٹی آڈیٹوریم میں ہم سب سانس روکے اسکی باتیں سُن رہے تھے۔ وہ بہت رُک رُک کر، صاف لہجے میں، عمدگی سے انگریزی میں جملے ادا کر رہا تھا۔ میں نے حیرت سے سوچا اس نے یقیناً کسی سے اتنی پُر اثر تقریر کرنے کا فن سیکھا ہوگا بعد میں پتہ چلا اس کا استاد ایک خاکروب تھا، نک نے سکول کے دنوں سے اس خاکروب سے پر اثر طریقے سے بات کرنے کا فن سیکھا تھا جو اپنے آس پاس والوں کے اندر زندگی میں آگے بڑھنے کا ارادہ اور خواہش شدت سے پیدا کرنے کا آرزومند تھا۔ اگلے دو سالوں میں اس نے سکول کے اندر اور باہر لوگوں کے سامنے تقریر کرنے کی مہارت حاصل کرنی شروع کر دی، یہاں تک کہ دو تین درجن لوگوں کے سامنے آسانی سے بات کر لیتا پھر اس ایک کوچ کی مدد سے اس نے اپنے آپ کو اس قدر نکھار لیا کہ ایک روز وہ وقت بھی آیا کہ اس نے اپنے آپ کو دسویں گریڈ کے تین ہزار طلبہ کے سامنے مہمان مقرر کے طور پر موجود پایا۔ اس کے گھٹنے کانپ رہے تھے۔ وہ نروس تھا مگر ٹھیک تین منٹ کے بعد آدھی سے زیادہ لڑکیاں آنسوؤں سے رو رہی تھیں اور لڑکے اپنے جذبات پر قابو پانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے۔ اسی دوران اچانک ایک ایسا واقعہ ہو گیا کہ نک اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک لڑکی نے ہاتھ کھڑا کر کے اسے متوجہ کیا اور پھر بولی "آپ کی گفتگو میں مخل ہونے کی معذرت مگر میں آپ کو فوری طور پر گلے لگانا چاہتی ہوں"۔ مجمعے پر چھائی گہری خاموشی اسے ہمت دے رہی تھی، وہ آئی اور اس نے آتے ہی نک کو گلے لگا کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔

''آج سے پہلے میں کبھی اپنے آپ کو سمجھا ہی نہیں پائی تھی کہ میں کیسے بنائی گئی ہوں۔ اس قیمتی احساس کو بتانے اور مجھے نیند سے جگانے کا شکریہ نک!''

کبھی جو آپ گر جائیں:

چند لمحوں کے بعد نک نے اپنے ایک پیر سے میز کو اتنی تیزی سے بجایا کہ جیسے کوئی ڈرمر ڈرم

بجاتا ہے، سامعین تالیاں بجا رہے تھے، اس نے منہ سے کسی مداری کی طرح آواز نکالنی شروع کر دی۔ تالیاں اور بڑھ گئیں تو ڈرامائی آواز میں بولتے ہوئے میز کے ایک کونے سے دوسرے کونے میں گیا اور کہنے لگا "زندگی میں کبھی جب آپ اچانک گر جائیں تو کیا کرتے ہیں"۔ پھر فوراً گر گیا، سر اُٹھا کر بولا "اُٹھنے کی کوشش کرتے ہیں ناں! پھر چہرہ نیچے کر کے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا" میں اُٹھ نہیں سکتا اس لیے 100 بار اُٹھنے کی کوشش کروں گا اور ناکام رہوں گا" ہال میں اتنی خاموشی تھی کہ سانسوں کی آواز آرہی تھی۔ وہ گھمبیر آواز میں بولا "اگر میں بھی گر جاؤں اور پھر کوشش کرنا ہی چھوڑ دوں تو کیا کبھی اُٹھ سکوں گا، میں ایک بار پھر کوشش کرتا ہوں کہ اُٹھ سکوں، زندگی کا سفر جاری رکھ سکوں"

اوندھے پڑے پڑے بغیر بازوؤں اور بغیر ٹانگوں کے نِک نے کتابوں پر سر رکھا۔ اور خدا جانے گردن پر کس طرح اور کس قدر زور ڈال کر کس مشکل سے اپنے آپ کو کھڑا کیا۔ کیمرہ ایک ایک لڑکی پر جا رہا تھا اور میں گھبرا رہا تھا کہ کہیں ہال میں موجود کوئی کیمرہ میرے چہرے پر نہ آجائے جو آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

نک نے خود آگاہی کی قوت کا وہ شاندار مظاہرہ کیا تھا کہ آنکھوں سے نہ دیکھا ہوتا تو یقین کرنا مشکل تھا۔ کیا سبق تھا کیا پیغام تھا جسے اُٹھنا ہے اسے کوشش کرنا ہوگا۔ بار بار گرنا اور ناکام ہو کر اسے چھوڑنے کی بجائے کوشش کرتے رہنا ہوگا؛ یہاں تک کہ وہ کامیاب ہو جائے۔

پھر وہ مناظر قابل دید تھے جب پورے ہال کے لوگ قطار بنائے اس سے گلے مل رہے تھے، رو رہے تھے۔ اور وہ سب کا بغیر بازوؤں کے خوش دلی سے استقبال کر رہا تھا۔ یوں گلے لگ رہا تھا جیسے وہی گلے لگا رہا ہو حالانکہ یہ کام صرف آنے والے کو کرنا تھا۔ حتیٰ کہ دونوں کو گرنے سے بھی بچانا تھا۔

کامرس ڈیپارٹمنٹ میں کیفیت یہ تھی کہ وہ ایم بی اے والوں کو دل سے سپیریئر سمجھتے تھے اور ان کا یقین تھا کہ ساری مہارتیں، خوبیاں اور توجہ ہی نہیں نوکریاں بھی ان کے لیے ہیں اور ہم تو فالتو فنڈ

ہیں۔ اچھی نوکری تک ملنے کی آس اور امید نہیں۔ وہ مایوسی کی آخری منزلوں کے مقیم تھے۔

بی کام کے ڈی موٹی ویٹڈ طلباء:

نک کی خودآگاہی نے اس سیریس ایشو پر میری بے انتہا مدد کی۔ 13 کلاسز تھیں ایک ایک میں جا کر تقریریں کیں۔ ان کا Self Consept بہتر کرنے کی کوشش کی۔ ان کا Self Image بدلا۔ انہیں بتایا لیس الانسانُ الاماسعی۔ یعنی رب کریم کا یہ قانون ہے جو جتنی جستجو کرے گا، جتنی کوشش کرے گا، اسی قدر کامیابی اس کے قدم چومے گی بے شک ایم بی اے والے اچھے ہیں، میرٹ زیادہ ہے، فیس زیادہ ہے۔ مارکیٹ میں ڈیمانڈ زیادہ ہے مگر آپ اپنے آپ کو اتنا پالش کرلو کہ آپ سے ملنے کے بعد کسی کو اور کوئی یاد نہ آئے۔ کوئی بھائے ہی نا! بیشک یہ کہنا آسان تھا اور یقین کرنا کافی مشکل۔

اس کے بنا چارہ نہیں:

خود پہ بھروسا سکھانا، خود پر اعتماد کرنے کی کیفیت میں لانا مشکل کاموں سے ہے مگر اس کے بنا چارہ ہے نہیں، سکول میں بچے کو اعتماد ہی نہ ہو کہ میں میٹرک کرلوں گا تو افسر بننا تو دور وہ کالج کی شکل ہی نہیں دیکھ سکے گا۔ بطور استاد یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ زندگی کی ہر کامیابی کا لازمی تعلق خودآگاہی اور خودشناسی سے ہے۔ اس کے بنا کسی مقصد کا تعین ہی نہیں کیا جا سکتا، کوئی ہدف ہی نہیں بنایا جا سکتا۔ علم کے کس درجے پر جانا ہے، کون سا علم حاصل کرنا ہے، کون سی خوبیوں اور مہارتوں کو حاصل کرنا ہے۔ اس کا تعین بھی خودآگاہ شخص ہی کرسکتا ہے۔ اپنے لیے کام کا طریقہ کار اور معیار بھی خود طے کرنا کرنا پڑتا ہے۔

چشتیاں میں سوشل ورک پر اعتراض:

زندگی میں بہترین راہ کا انتخاب، بہترین لوگوں اور اداروں کا انتخاب بچپن کی یادوں سے جڑے ہوتے ہیں۔۔ جن دنوں میں گورنمنٹ ہائی سکول چشتیاں میں ساتویں کلاس کا طالب علم تھا۔ حکومت نے سوشل ورک کا مضمون متعارف کروایا۔ اس میں سکول کی صفائی حتیٰ کہ آس پاس کی

صفائی بھی عملی طور پر کی جاتی تھی۔ ایک روز پی ٹی ماسٹر بشیر صاحب سوشل ورک کے لیے اپنے گھر کے آس پاس لے گئے اور وہاں طلبہ سے ساری صفائی کروائی ، پلاٹ صاف کروائے۔ جھاڑو پھروائے۔ اس پر شہر میں بڑا شور مچا کہ ہمارے بچوں سے کام کیوں کروایا، اس مضمون کو ہی بند کر دیا جائے۔ یہ غلط استعمال ہے میں خود کلاس کے ان بچوں میں شامل تھا جنہوں نے صفائی کی تھی ، میں تب بھی یہی سوچتا تھا کہ ہوا تو سوشل ورک ہی ہے کسی استاد کے گھر کے آس پاس ہو گیا تو کون سا جرم ہو گیا مگر ہمارے اس شہر میں اللہ معاف فرمائے اساتذہ میں بھی باہم جیلسی کلچر اس قیامت کا تھا کہ بچے بھی محفوظ نہ تھے۔ بڑے ہو کر اندازہ ہوا کہ بچپن کے ہر اچھے بُرے تجربے، مشاہدے کی یادیں ذہن میں محفوظ رہتی ہیں۔

لاہور میں پہلا عوامی میلہ

بھٹو صاحب کے دور میں لاہور میں پہلا عوامی میلہ فورٹریس سٹڈیم میں ہوا، ساتھ سکاوٹس جمہوری بھی منعقد ہوئی۔ میں ہائی سکول چشتیاں کے سکاوٹس کے ساتھ پہلی بار لاہور آیا تھا۔ بس سٹینڈ سے تانگہ پر سامان رکھ کر اوپر آٹھ دس سکاوٹس بیٹھ گئے ، جس تانگے پر میں بیٹھا، اس پر بستر بند رکھے ہوئے تھے ، کچھ دیر بعد زیادہ جمپ لگنے سے وہ رسی ٹوٹ گئی اور سارے بستر تانگے سے سڑک پر آ رہے اور ان کے ساتھ میں بھی پھسلتا ہوا سڑک پر جا پڑا۔ خدا جانے وہ شیشے کا گلاس کس کا تھا اور اس بستر میں کیا کر رہا تھا، سڑک پر گرنے سے تو زیادہ چوٹ نہ آئی مگر گلاس ٹوٹنے سے شیشے کا ایک ٹکڑا ہاتھ میں پھر گیا، اس حادثے کے بعد عمر بھر یہ بات یاد رہی کہ دوسروں کے بستروں اور سامان کے ڈھیر پر کبھی نہیں بیٹھنا، اچانک گرنے سے کافی چوٹ لگ جاتی ہے۔ وہیں پر یہ بھی سیکھا اور نوٹ کیا کہ سفر کے دوران پیش آنے والے حادثوں اور واقعات کو گھر آ کر نہیں بتانا چاہیے۔ ان واقعات کو دلیل کے طور پر یاد رکھا جاتا ہے اور اسی بنیاد پر اگلی بار اجازت ملنا مشکل ہو جاتی ہے۔ یہ بھی سیکھا کہ دوران سفر جس استاد سے آپ ہر لمحے توجہ، مدد اور راہنمائی چاہتے ہو اگر اس کا موڈ نہ ہو تو کس قدر برا لگتا ہے، ایسے میں خود کو سنبھالنا آنا چاہئے ، ہر جگہ بندہ رونے تو نہیں بیٹھ سکتا۔

لاہور میں کئی روز کے قیام کے دوران جہاں سکاؤٹس کیمپ میں کھانا پکانا، بے مزہ اور بے ذائقہ کھانا کھانا، زمین پر سونا، نہانے کے لیے مارے مارے پھرنا، وردی پہن کر بیج لگا کر مکمل آزادی سے پھرنا، مرضی سے زندگی میں پہلی بار کتاب خریدنا۔ وہ بیڈن پاول کی سکاوٹنگ پر موٹی سی کتاب تھی بیشک اسے آج تک نہیں پڑھ سکا مگر خوشی بڑی تھی کہ خود خریدی تھی۔ بھٹو صاحب کے کتنے ہی وزراء کو دیکھا، اداکاروں کو لمبے لمبے فلوٹس پر فورٹریس سٹیڈیم میں چکر لگاتے اور ہاتھ ہلاتے دیکھا۔ سکاؤٹس کے لیے جگہ جگہ ہونے والے کوئز پروگراموں اور دلچسپ سرگرمیوں کے مقابلوں میں اپنی بنیاد پر اکیلے حصہ لے کر کئی ٹکٹیں جیتیں، جن پر انعام کے طور پر مختلف چیزیں ملتی تھیں۔ چیف سکاوٹ اور قائداعظم سکاوٹ کا پتہ چلا۔ دوستیاں کرنے کا پتہ چلا۔ جو لوگ ناپسند ہوں ان سے لڑے بنا کیسے فاصلہ رکھنا ہے بھی سیکھا۔ اپنی عزت کی یوں اعتماد سے حفاظت کرنا شائد کبھی نہ آتا اگر گھر سے نکلنے کا موقع نہ ملا ہوتا۔ کئی سال بعد جب دوسری بار گورنمنٹ ہائی سکول 6/132۔ آر میں نہم کا طالب علم تھا تب لاہور آنے کا پھر موقع ملا۔ پہلی بار تانگے سے گرنے کے واقعے نے اجازت کے لئے آخر تک رلایا۔ والدہ سے آخری لمحے جا کر تب اجازت ملی جب باقی ساری ٹیم فقیر والی پہنچ چکی تھی۔ مجھے ٹریکٹر پر بٹھا کر والد صاحب نے فقیر والی بھجوایا، تب ٹیلی فون نہیں ہوتے تھے کہ انہیں انتظار کرنے کو کہا جاتا۔ سارا راستہ ٹریکٹر کے دھکے، جمپ کھاتا اور دعائیں کرتا رہا کہ اللہ کرے پی ٹی ماسٹر صاحب لیٹ ہو گئے ہوں، ان کی بس پنکچر ہو گئی ہو، تاکہ انکی بس نہ نکل جائے تب ہارون آباد سے لاہور 10-12 گھنٹوں کے سفر کے بعد ہی پہنچا جانا ممکن ہوتا تھا اور اکیلے جانا تو ممکن ہی نہ ہوتا۔ کیونکہ ڈائیو و بس سروس کو چلنے میں ابھی بہت برس باقی تھے۔ ہر سفر میں استاد ضرور ڈسکس ہوتے تھے ایسے اساتذہ بھی دیکھے جو بچوں کے کھانے اور آرام کا خود سے زیادہ خیال رکھتے وہ پورے کیمپ کی آنکھوں کا تارہ ہوتے اور وہ بھی دیکھے جنہیں اپنی خوراک، اپنے آرام کے علاوہ کچھ سوجھتا نہ تھا۔ میں نے طلبہ کو اپنے اساتذہ سے اندھی محبت کرتے بھی دیکھا اور نفرت کرتے بھی، اور یہ صرف ان کے رویے کی وجہ سے ہوتا تھا، اچھے رویے والے اساتذہ کو دعائیں ملتیں، ترقی کرتے، افسر لگتے بھی دیکھا اور

ہر وقت، ہر لمحے دوسرے اساتذہ کے خلاف بول بول کر اپنی عزت گنواتے بھی دیکھا۔

آپاں کیڑا افسر لگناں اے:

سکول میں لیاقت علی دو سال میرا کلاس فیلو رہا۔ ضلع بہاول نگر کے اس دور افتادہ گاؤں کو ہم گورنمنٹ ہائی سکول بنگلہ یتیم والا کہتے تھے حالانکہ یہ ۶/۱۳۲- آر میں قائم تھا، سکول سے دو تین کلومیٹر کی دوری پر اس کا گاؤں ۶/۱۳۳- آر تھا۔ جب اس سے واقفیت اور شناسائی بڑھی تو پہلی بار اندازہ ہوا کلاس کا وہ واحد لڑکا ہے جو کئی کئی روز سکول ہی نہیں آتا۔ کبھی کسی کی شادی پر فیصل آباد چلا جاتا ہے تو کبھی کسی کی مرگ پر فاتحہ کے لیے ساہیوال جا پہنچتا ہے، کبھی کھیتوں کو پانی لگانے کی باری تھی تو رات بھر سویا نہیں اور کبھی بھائی کے سسرال گیا ہوا تھا۔ ایک روز میں نے حیرت بھرے انداز سے پوچھا "سب کو امتحانوں کی فکر ہوتی ہے، ٹیچروں کی ناراضی کا خوف ہوتا ہے، کالج میں داخلے کے لیے مطلوبہ نمبر نہ آسکنے کا ڈر ہوتا ہے، تم عجیب لاابالی اور بےفکرے لڑکے ہو، ہفتہ ہفتہ کلاس میں ہی نہیں آتے!"

اس کا بولنے کا ایک خاص انداز تھا، مسکراتے ہوئے فیصل آبادی لہجے میں بولا۔

"آپاں کیڑا افسر لگناں اے۔ کرنی تے واہی بیجی اے۔ پاس ہون جوگے نمبر تے آ جان گے۔ پڑھائی لئی رشتے ساک تے فصل بیجی نہیں چھڈ سکدا"

(میں نے کون سا افسر لگنا ہے۔ کھیتی باڑی ہی کرنی ہے، میٹرک پاس کرنے کے لیے جتنے نمبر ضروری ہیں وہ تو میں لے ہی لوں گا۔ پڑھائی کے لیے رشتے ناطے اور کھیتوں کے کام نہیں چھوڑ سکتا)

برسوں بعد بالکل اتفاقی طور پر لاہور میں ہماری ملاقات ہوئی تو میں حیران رہ گیا۔ پچیس تیس سال بعد بھی وہ ویسا ہی تھا۔ اس نے زمینداری اتنے سچے دل سے کی کہ کئی مربعے زمین کا مالک بن چکا تھا۔ ٹھیکے پہ زمین لے کر کاشت کروانے کا الگ نظام تھا اس کے پاس۔ اور اس نے اپنی زندگی کی جو دو ترجیحات طے کر رکھی تھیں۔ رشتے ناطے اور کھیتی باڑی۔ دونوں پر اسی لگن سے قائم تھا۔

ہمارے استادِ محترم چوہدری محمد انور صاحب کہا کرتے تھے اپنے آپ کو، اپنی ضرورتوں کو وقت سے پہلے جاننے کے مراحل کا اچھی طرح طے ہو جانا اس دنیا میں آپ کے مقام اور مرتبے کو بھی طے

کرتا ہے اور روزمرہ زندگی میں اُٹھنے والے اور آگے بڑھتے قدموں کی رفتار کا بھی تعین ہو جاتا ہے"

بہت سے ایسے لوگوں کو آپ بھی جانتے ہوں گے جو ایم اے کرنے کے باوجود بھی نہیں جانتے کہ انہیں زندگی میں کیا کرنا ہے۔ کیوں کرنا ہے۔ کب تک کرنا ہے۔ انہیں کوئی اچھی منزل کیسے مل سکتی ہے۔ کیا کوئی ایسا مسافر جو ریلوے سٹیشن پر پہنچنے کے بعد بھی اپنی منزل پہ پہنچنے والی گاڑی کے بارے نہ جانتا ہو اور یہ خیال رکھتا ہو کہ جو پہلے آ جائے گی اور جس پر کوئی سوار کرا دے گا، اسی پر بیٹھ کر شاد کام رہوں گا، تو ذرا سوچیے کہ وہ کسی نہ کسی گاڑی پر تو سوار ہو جائے گا مگر جو خوشی اور اطمینان اپنی طے کردہ منزل پر پہنچ کر ملتا ہے اس سے وہ محروم رہے گا۔ بھلا کسی دوسرے کی طے کردہ منزل پر جا کر کوئی کیسے فخر اور اطمینان سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔

سکول کی سطح پر اس تصور کو کیوں سمجھا جائے:

ایک خود شناس استاد کو اس تصور (Concept) کی وضاحت اور اسے سمجھنے کی سکول کی سطح پر ہی سب زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ ویسے تو محرومی جب بھی دور ہو، علم جب بھی ملے، فہم جب بھی حاصل ہو، اسے لپک کر لینا چاہیے۔ لمحے بھر کی تاخیر بھی روا نہیں رکھنی چاہیے یہی زندگی کی علامت ہوتی ہے۔ یہی انسان کو دلوں اور تاریخ میں زندہ رکھتی ہے۔

امام ابن تیمیہ نے قید خانے میں کیا کہا!

امام احمد ابن تیمیہ (621،728ھ) بھی ایک باکمال استاد تھے، 726، کو سلطان ناصر کے عہد میں علماء نے ان کے خلاف ذرا سے اختلاف رائے کی وجہ سے کفر کا فتویٰ دے دیا اور قتل کی سزا تجویز کر دی گئی۔ دمشق کے قید خانے میں ڈالے جانے کے بعد بھی وہ بڑے اطمینان کے ساتھ تصنیف و تالیف میں مصروف ہو گئے۔ ان کا زیادہ وقت قرآن پاک کی تلاوت اور غور کرتے گزرنے لگا۔ ان کے لائق ترین شاگرد حافظ ابن قیم بھی ان کے ساتھ قید خانے میں ڈالے گئے تھے۔ حافظ ابن قیم بتاتے ہیں کہ قید کا زمانہ استاد محترم نے بڑے صبر و استقلال سے گزارا۔ ان کی زبان پر نہ کسی کا شکوہ آیا، نہ کسی کے لیے بددعا نکلی، ہاں ایک مرتبہ فرمانے لگے۔

''میرے دشمن مجھے کیا تکلیف پہنچا سکتے ہیں جب کہ میری جنت میرے دل میں ہے اور معالج میرے سینے میں ہے۔ میں جہاں جاؤں گا یہ میرے ساتھ رہیں گے۔ میری قید تنہائی میری گوشہ تنہائی ہے۔ میرا قتل میری شہادت اور جلا وطنی میری سیاحت ہے''

یہ ہمت بھرے کلمات انسان کی زبان سے تبھی نکلتے ہیں جب قلب و روح میں پوری ہم آہنگی ہو۔ آپ اپنے آپ کو اپنی، خوشیوں، غموں، دکھوں اور تکلیفوں کو جان چکے ہوں ورنہ تو ہر دوسرا آدمی ذرا سی تکلیف پہ شکایات کا پورا دفتر کھول کر بیٹھ جاتا ہے۔ اپنی نیکیاں اور اچھے کام گنواتا ہے اور احتجاج کرتا ہے کہ میں ہی کیوں۔ (وائے می why me) ناشکری کا یہ کلمہ انہی زبانوں سے ادا ہوتا ہے جو خود سے آگاہ نہیں ہوتے، اپنی منزل، مقصد اور خالق کے ساتھ ساتھ اپنی حیثیت اور پوزیشن سے واقف نہیں ہوتے۔ سچ تو یہ ہے وہ پیارا رب کبھی تو دے کر آزماتا ہے اور کبھی نعمتوں کو واپس لیکر۔ صلاحیتیں، خوبیاں، خوشیاں، آسانیاں ترقیاں اور رشتے سب نعمتیں ہیں۔ کسی استاد کا حق نہیں ہیں، اللہ کی عطا۔ اور بخشش ہیں۔ لینے والے کو اپنی حیثیت کا علم ہو تو کہ کبھی ناشکری اور ناسمجھی کا کوئی کلمہ اس کی زبان پر آ ہی نہیں سکتا۔ استاد ہمیشہ استاد ہوتا ہے، اسکا علم اور اثرات اہم ہوتے ہیں، چاہے وہ کسی سکول کا ہو یا اعلیٰ تعلیمی ادارے کا، ہر جگہ البتہ علم کے بانٹنے کا طریقہ کار بدلنا پڑتا ہے ورنہ بہت دقت ہوتی ہے

ایسے میں حاضری کسے سوجھتی ہے!

2000ء کے اوائل میں یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور کے گارڈن ٹاؤن برکت مارکیٹ کے آس پاس 3 کیمپس تھے۔ جو ہر ٹاؤن والے نئے مین کیمپس کی تعمیر میں ابھی وقت باقی تھا۔ ایک روز بی بی اے کلاس میں ایک طالبہ نے کھڑے ہو کر بات کرنے کی اجازت چاہی۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ ''یونیورسٹی لیول پر تو اساتذہ کو اپنے طالبہ و طالبات سے بچوں والا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ اس میں ان کا نہیں ہمارا نقصان ہوتا ہے'' تب یونیورسٹی میں پڑھاتے ہوئے یہ میرا دوسرا یا تیسرا سال تھا

میں نے پوچھا ''تمہارا کیا نقصان ہوتا ہے!''

اس کا جواب تھا ''ہم اُن کی عزت کرنا چاہتے ہیں مگر اس طرح کے طرزِ عمل کے بعد نہیں کر پاتے۔''

شکایت اس کی یہ تھی کہ کلاس شروع ہونے کے بعد ایک استادِ محترم کمرے کو اندر سے کنڈی لگا لیتے ہیں۔ کوئی ذرا تاخیر سے آئے تو دروازہ کھول کر ان کی نقد بے عزتی کرتے ہیں۔ کوئی بے عزتی کروا کر بھی اندر آنا چاہے تو مزاحم ہوتے ہیں۔ اندر آ ہی جائے تو مسلسل جلی کٹی سناتے ہیں۔ یہ سنتے ہی کلاس میں یہاں سے وہاں تک دھیمی دھیمی سرگوشیوں کا طوفان سا آ گیا۔ معلوم ہوا ہر دوسرا طالب علم یا طالبہ اس پل صراط سے گزر چکا ہے اور بے عزتی کی تلخ یادوں سے بھری ایک ایک گٹھڑی ہر ایک کے کندھے پر بندھی پڑی ہے۔ کلاس ختم ہوئی تو میں خراماں خراماں ان کے کمرے میں چلا گیا۔ انہوں نے نائب قاصد کو بلایا اور ملک شیک لانے کو کہا۔ ملک شیک ان کے کمرے کے بالکل ساتھ ہی ایک شیڈ میں تیار ہوتا تھا اور وہاں طلبہ و طالبات کا ہمیشہ جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ میں نے موقع پا کر کہا ''کرنل صاحب! آپ اپنی کلاس کا دروازہ کیوں بند کر دیتے ہیں'' بولے ''تا کہ نہ کوئی اندر آ سکے نہ جا سکے''۔ ''مگر سر! ایسا تو سکول بھی نہیں ہوتا ہے'' میں نے احترام سے لقمہ دیا۔ ''یونیورسٹی کی ابھی انہیں تمیز نہیں ہے'' انہوں نے غصے سے کہا۔ '' میں رات بھر لیکچر تیار کرتا ہوں۔ وقت پر کلاس میں ذ جاتا ہوں۔ انہیں کیا تکلیف ہے۔ کیوں نہیں آ سکتے۔ پھر ان کے بار بار آنے جانے سے میں تنگ پڑتا ہوں۔ ڈسپلن بھی کسی چیز کا نام ہے جو آ گیا بس اس کی حاضری، لیٹ آنے والے کی میں حاضری ہی نہیں بولتا'' انہوں نے اپنا طریقہ تدریس بتایا!! پھر اچانک رکے اور بولے ''ہاں اختر صاحب! آپ کیا کرتے ہیں۔ سنا ہے آپ کی کلاس رات دس بجے تک بھی چل رہی ہوتی ہے۔!''

میں نے ملک شیک کا لمبا سا گھونٹ بھرا اور کہا ''کرنل صاحب یہ دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ شام کی کلاس 6 بجے شروع ہوتی ہے اور 9 بجے ختم ہونی چاہیے۔ اس میں اوسطاً 25 لڑکے

لڑکیاں ہوتے ہیں اور یہ سارے ہی نوکری پیشہ ہیں۔ تھکے ہارے آتے ہیں، ان سب کو جانے کی جلدی ہوتی ہے۔ آنے کی نہیں۔ انہیں صرف اپنی حاضری یعنی رول کال عزیز ہوتی ہے۔ اس کے لیے ایک دوسرے کی مدد لیتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ یہ سارے ہی جاب کرتے ہیں اور زندگی میں آگے جانا چاہتے ہیں۔ انہیں اس بات پر قائل کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے کہ ہر کامیابی کی ایک قیمت ہوتی ہے جو ادا کرنی پڑتی ہے دوسری صورت میں انہیں عزت اور وقعت نہیں ملے گی۔ میں ان کی حاضری نہیں لیتا۔ مجھے اس میں کبھی دلچسپی ہی نہیں ہوتی کہ کون نہیں آیا۔ میرے لیے اہم وہ ہوتے ہیں جو سامنے بیٹھے ہوتے ہیں۔ ان کے لیے میں دل و جان سے تیار ہو کر جاتا ہوں۔ ان کے کام کا بہترین میٹریل لے کر آتا ہوں، جب تک میری تسلی نہیں ہو جاتی، کلاس جاری رہتی ہے اس دوران ان کی کبھی نگاہ بھی گھڑی پر نہیں جاتی۔ ایسے میں دس تو بجنے ہی ہوتے ہیں۔ ایک آدھ بار کسی کو جلدی جانا تھا، میں نے کہہ دیا بیٹے جی! ہمیں تنگ کیے بنا چپکے سے نکل جانا۔ اس کے بعد سے یہ معمول ہے کہ جس نے جانا ہو چلا جاتا ہے۔ باقی سکون سے بیٹھے سنتے، لکھتے اور سیکھتے رہتے ہیں"

انہوں نے حیرت سے میری طرف دیکھا

"آپ حاضری نہیں لیتے!"

میرا کہنا تھا کہ دن میں کلاس میں 60-50 طلبہ و طالبات ہوتے ہیں، 3 گھنٹے کی کلاس میں آدھ پون گھنٹہ اسی کام پر ضائع کرنا بہت ظلم ہے، میں ایک پیپر موو کرا دیتا ہوں۔ سبھی اپنے نام، رول نمبر لکھ کر دستخط کر دیتے ہیں۔"

وہ بولے "یہ قوم نا قابل اعتبار ہے۔ جعلی حاضریاں لگاتے ہوں گے"

"تو ہم کس مرض کی دوا ہیں کرنل صاحب! گنتی تو ہمیں آنی چاہیے۔ 20 دستخط ہیں تو بندے بھی تو 20 ہی ہونے چاہیے۔ 21 واں یا 22 واں بیچارہ کیسے وہاں گھس آئے گا، اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ کسی نے اپنے دوست کیلئے جھوٹ بولا ہے۔ اسے شرمندہ کروائیے اور بتا دیں کہ اس سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ براہ راست استاد سے آ کر کہو، چھٹی جب وہاں سے مل جائے گی تو فراڈ کر

کے کیوں لینی ہے"

"آپ واقعی کنڈی نہیں لگاتے پھر آپ کی کلاس بھری کیوں ہوتی ہے"

وہ پروگرام کوارڈی نیٹر بھی تھے۔ ان پر کسی کی ہونہ ہو۔ ان کی نظر سب اساتذہ پر ہوتی تھی۔

میرا کہنا تھا "سرفراز صاحب! بچے کو یہ یقین جلدی آ جاتا ہے کہ استاد مجھ سے محبت کرتا ہے اور میرے بھلے کے لیے اس کے پاس بہترین سے کم نہیں ہے۔ جس روز کلاس مس کروں گا میرا کافی نقصان ہو جائے گا اور اس کا ازالہ کتاب کا سبق پڑھنے سے کسی طور ممکن نہیں ہوگا۔ اچھا استاد اپنی زندگی، تجربات، مشاہدات اور ان کی خیر خواہی کا مربہ جب پوری محبت اور جذبے سے انہیں کھلاتا ہے تو کون کافر انکار کرے گا۔ ایسے میں کلاس کی حاضری کسے سوجھتی ہے!"

کرنل صاحب مختی آدمی تھے۔ انہوں نے فوج سے ریٹائرڈ ہونے کے بعد ایم بی اے کیا اور پھر وہاں یونیورسٹی آ گئے تھے۔ میرا مشورہ یہ تھا کہ انہیں کسی انتظامی ذمہ داری پہ جانا سوٹ کرے گا۔ پڑھانا، ڈسپلن سے زیادہ اندر کی آمادگی اور اس کام کی چاہت سے جڑا ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ رحمت کی پھوار جیسا نرم و نازک ہوتا ہے، اس کے بعد وہ جلد ہی پنجاب یونیورسٹی چلے گئے وہاں ہاؤسنگ سکیم کے انچارج کے طور پر انہوں نے عمدہ طریقے سے کام سنبھالا۔ وہ ان کی فطری خوبی تھی۔ اپنی خوبی کا علم ہو تو نتائج ہمیشہ بہترین اور من پسند آتے ہیں۔ ورنہ بندہ کنڈیاں ہی لگاتا رہ جاتا ہے۔

اقبال سے نہیں ملے تو اُن کے درودیوار سے ہی سہی:

کئی سال پہلے ایک روز کلاس پڑھاتے ہوئے پاکستان ٹیلی ویژن سے ایک پروڈیوسر کا فون آیا "سر! اقبال پہ خصوصی پروگرام ریکارڈ کرنا ہے سیالکوٹ جا کر ان کے گھر۔ آپ اس کے میزبان ہوں گے۔ وقت نکال لیں گے نا!"

"یہ تو خوشی کی بات ہے اقبال سے نہیں ملے تو ان درودیوار سے ہی جہاں اللہ نے اس عظیم انسان کو پروان چڑھایا" میں نے خوش دلی سے جواب دیا۔ انسان بے شک کمروں، برآمدوں سے بڑا نہیں ہوتا مگر اس کے بڑا ہونے اور بڑا بننے کے بعد ہر جگہ قیمتی ہو جاتی ہے۔ ہم اس سکول بھی گئے جہاں وہ پڑھتے تھے۔

اس سکول کی اسمبلی جا کر دوبارہ کرائی۔ اس کلاس روم میں بھی ریکارڈنگ کی جہاں کبھی اقبال پڑھتے تھے۔ پھر ان کے گھر آ کر ان کے والد صاحب اور والدہ صاحبہ کے کمروں میں گئے۔ اب یہ عمارت قومی اثاثہ قرار پا چکی ہے۔ سرکاری اہل کار وہاں متعین ہیں۔ اسی گھر کے باہر وہ جگہ تھی جہاں ایک روز وہ کھڑے تھے حقے کی ''نے'' ہاتھ میں تھی اور وہ اپنے دو تین دوستوں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ دوستوں کی باتیں تو ویسے ہی بڑے مزے کی ہوتی ہیں ایک مرتبہ محفل جم جائے تو پھر جی نہیں چاہتا کہ اس سے اٹھیں، خاص کر کسی خشک کام کے لیے جیسے..... کسی بزرگ کو سلام کرنے، کسی بڑی بوڑھی کا احترام کرنے! لیکن خودشناس استاد ہو یا شاگرد شائستگی اور تہذیب کے تقاضے کچھ اور ہی ہوتے ہیں انہی سے تو اقدار وجود میں آتی ہیں۔ انہی سے تو انسان بڑے بنتے ہیں

سیالکوٹ کی اس مرکزی سڑک پر ایک دکان تھی اور اس دکان کے مالک اقبال کے دوست تھے۔ اقبال نے سیالکوٹ ہی میں آنکھیں کھولیں، وہیں پلے بڑھے، ایف اے کا امتحان کامیاب کر کے وہاں سے لاہور کا رُخ کیا اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ اُن کے والد اور والدہ البتہ وہیں رہے۔ جب موقع ملتا وہ سیالکوٹ جاتے اور اپنے بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ یہیں ایک اور محترم ہستی رہتی تھی۔ یہ مولوی میر حسن تھے۔ اقبال کے والد کے دوست اور اقبال کے استاد، راہنما، مشفق اور مربی! اقبال ساری عمر ان کو بھولے نہ ان کے احسان کو جو انہوں نے بطور استاد ان پر کیا تھا۔

اقبال جب شاعر مشرق کی حیثیت سے ایک دنیا میں مشہور ہوئے تو ان کی فکر اور ان کے فن کی قدردانی میں انگریزی حکومت نے انہیں سر کا خطاب دینا چاہا۔ حکیم الامت نے فرمایا

''اگر حکومت خطاب دینا ہی چاہتی ہے تو ایک شرط پر مجھے یہ قدردانی منظور ہے''

پنجاب کے گورنر جس سے یہ بات ہو رہی تھی نے حیرت سے پوچھا..... ''وہ کیا شرط ہے؟''

علامہ نے کہا ''مجھ سے زیادہ خطاب کی مستحق ایک اور شخصیت ہے پہلے اسے خطاب دیا جائے۔''

گورنر نے پوچھا ۔۔ ''وہ کون ہے؟''

فرمایا ''مولوی میر حسن! پہلے انہیں شمس العلما بنائیے پھر مجھے خطاب دیجئے۔''

گورنر بھلا کہاں علمی شخصیتوں سے واقف تھا اور وہ بھی دین و ایمان کی باتیں کرنے والوں

سے! اس نے بڑی حیرت سے پوچھا...... ''یہ کون صاحب ہیں، ان کی کوئی تصنیف؟''

جواب ملا...... ''ان کی زندہ تصنیف میں خود ہوں! وہ میرے استاد ہیں۔ مجھے پڑھانے، سکھانے اور بنانے والے۔''

کوئی بڑا ہو کر ماں باپ کو بھول جائے یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی حیرت کی ہے کہ ہم اپنے استادوں کو بھول جائیں، ان کی خدمات، ان کے احسانوں کو فراموش کر دیں لیکن اسے کیا کیا جائے کہ زمانے کا چلن یہی بن رہا ہے اور اسکی وجہ بھی ہم خود ہیں۔ کتنے استاد ہیں جو اپنے طلبہ کو اپنے اساتذہ کا نام اور کام محبت سے بتاتے ہیں۔ اکثر تو یوں مذاق اڑاتے ہیں جیسے وہ خود تو کسی استاد سے پڑھے ہی نہیں، براہ راست ہی ٹیچر بن کر نازل ہو گیے، جو کوئی اپنے استاد کی عزت نہیں کرتا اور کرواتا، اس کی عزت بھی کوئی نہیں کرتا۔

ڈگریاں زیادہ اور عہدہ بڑا ہو جائے تو کہاں کسی کو ابتدائی جماعتوں کے استاد یاد رہتے ہیں؟...... مگر نہیں! ہمارا دین ہمیں یہ سکھلاتا ہے کہ...... کسی سے چھوٹی سے چھوٹی بات کا بھی علم حاصل ہو تو ہمیشہ اس کا احترام کرو! خودشناسی کا یہی پیغام ہے کہ اپنے استاد کو مت بھولو۔

سیالکوٹ میں اقبال اپنے جس دوست کی دکان پر کھڑے حقہ پی رہے تھے، وہاں تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ باتوں باتوں میں اقبال کی نظر سڑک پر پڑی۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کے استاد مولوی میر حسن قریب سے گزر رہے ہیں۔ استاد نے اقبال کو دیکھا نہ تھا۔ اقبال خوش گپیوں میں لگے تھے بظاہر کوئی ایسی وجہ نہ تھی کہ اقبال وہاں سے نکلتے لیکن ان کے دوستوں نے دیکھا کہ جس لمحے مولانا پر اقبال کی نظر پڑی حقہ کی نئے انہوں نے وہیں رکھدی، جس حال میں کھڑے تھے اسی حال میں دکان سے اُترے۔ استاد کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ حالت یہ تھی کہ ایک پیر میں جوتا تھا اور دوسرا پیر ننگا تھا۔ اس پیر کا جوتا حقہ پیتے ہوئے انہوں نے اتار دیا تھا۔ استاد کو دیکھ لینے کے بعد انہیں اتنی دیر دکان میں رکنا گوارا نہ ہوا کہ جوتا پہن لیتے۔ ادب احترام وعقیدت کے جذبات ان پر اتنے حاوی ہو گئے تھے کہ وہ اسی حالت میں استادِ محترم کے پیچھے پیچھے ان کے گھر تک چلے گئے اور اس وقت تک نہ لوٹے جب تک واپسی کی اجازت دے کر مولانا میر حسن گھر کے اندر نہ چلے گئے۔ اس لمحے استاد

کے دل میں جو خوشی اور محبت پھوٹی ہو گی اسے ایک استاد ہی بہتر طور پر محسوس کر سکتا ہے

استاد کے حوالے سے حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے کہ..... "جب تم اپنے استاد کو دیکھو تو پہلے اسے سلام کرو اور اس کے ساتھ ادب و احترام کو ملحوظ رکھو!"

صحابی رسول حضرت عبداللہ بن عباسؓ اپنے استاد حضرت زید بن ثابتؓ کو مدینۃ النبی کی گلیوں میں دیکھتے تو دوڑ کر ان کے پاس پہنچتے۔ جب تک وہ چلے نہ جاتے خود کہیں نہ جاتے۔ وہ سواری پر چڑھتے تو ان کے پاؤں رکابوں میں رکھتے۔ وہ منع کرتے تو جواباً فرماتے..... "استادوں کا احترام اسی طرح کیا جاتا ہے"۔ استادوں اور بزرگوں کا ادب خوش نصیبی اور اقبال مندی کی علامت ہے! اور جسے نصیب ہوا اسے اقبال ضرور نصیب ہوتا ہے

پی ٹی وی کا قافلہ اقبال کے گھر اترا تو میں نے پروگرام کی ریکارڈنگ سے پہلے اقبال کا پورا گھر دیکھا پھر فرمائش کر کے وہ سڑک اور وہ جگہ جو اب نئی دکانوں میں کہیں کھو گئی ہے بطور خاص دیکھنے نکلا وہ جگہ جہاں کبھی اقبال کھڑے تھے اور اپنے استاد کو دیکھ کر ان کے پیچھے لپکے تھے۔ سوچتا رہا استاد تو اب بھی بہت اچھے علم اور محبت والے ہیں، خدا جانے کیا ہوا اقبال ہی کیوں کھو گئے ہیں۔

☆..........☆..........☆

9

خود شناس فلسفی أستاد سقراط--- موت سے پہلے کیا بولا؟

کہا جاتا ہے کہ انسانی تاریخ میں سقراط کو پڑھے بغیر کوئی فرد اپنے آپ کو عالم اور فاضل کہلانے کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ اس کی سوچ، فکر اور فلسفہ اگر خود شناسی۔ خود آ گاہی اور خود بینی کی ایک انتہا ہے تو کائنات اس کے مالک اور خالق کی تصدیق اور تلاش وجستجو اس کے علم کی دوسری انتہا ہے۔

ایک یونانی شعر میں سقراط کے بارے میں کہا گیا ہے

''تمام ایتھنز سیاہ رات کی طرح تاریک ہے
میری مثال اس میں ایک چراغ کی سی ہے''

پیغمبر عقل وخرد کہلانے والا سقراط یونان کے مشہور شہر ایتھنز میں ایک سنگ تراش کے گھر پیدا ہوا یہ 469 قبل مسیح کا زمانہ تھا سقراط کو مقامی رواج کے مطابق کشتی لڑنے اور کھیلوں میں حصہ لینے پر توجہ دینی تھی۔ اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں تھی مگر اسے خدا نے اسے خود آ گاہی کی دولت سے نواز دیا تھا۔ ایک روز اس نے اپنے ہم عمر کرائٹو سے پوچھا جو اچھا خاصا پہلوان تھا۔

''کرائٹو! پہلوانی میں بالآ خر انسان کیا بن سکتا ہے؟

کرائٹو نے سوچ کر جواب دیا'' پھر انسان ہرکولیس بن جائے گا''۔

خود بین اور خود آ گاہ سقراط سوچ میں ڈوب گیا۔ کرائٹو نے اسے جھنجوڑ کر متوجہ کیا تو سقراط نے اس سے پوچھا:'' کیوں نا انسان اس کائنات کو سمجھنے کی اتنی کوشش کرے جتنی محنت وہ ہرکولیس بننے میں کرتا ہے۔''

ایتھنز کے لوگ فلاسفر کی باتوں اور تحقیق کے شوقین تھے:

سقراط کو اپنی تمام زندگی دلچسپ لوگوں کا مطالعہ کرنے کا پورا پورا موقع ملتا تھا، ان لوگوں کے ساتھ سقراط کے میل جول سے اس کی متجسس طبیعت کو مہمیز ملتی تھی۔ سقراط کے ہاں سوال وجواب کی

عادت ایک باقاعدہ مشغلے کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔ ایتھنز کے لوگ فلاسفر کی باتوں اور تحقیق کے شوقین تھے۔ چوراہوں میں کھڑے ہو کر بحث کیا کرتے تھے کہ اس سال اولمپک کے مقابلوں میں کون بازی لے جائے گا۔ ان لوگوں کو سقراط کے سوال و جواب کا سلسلہ بہت ہی اچھا لگتا تھا۔ وہ ورزش گاہوں اور تفریح گاہوں میں سقراط کے منتظر رہتے تھے۔ خاص طور پر ایتھنز شہر سے کچھ ہی دور ایک مشہور پہاڑی پر تو سقراط کی مجلس روزانہ جما کرتی تھی۔ اس پہاڑی کو ایتھنز کی چھت یا سائبان کہا جاتا تھا۔ یہ اونچی پہاڑی سمندر کے ساتھ واقع تھی۔ اس پہاڑی پر دنیا کے دوسرے ممالک کے لوگ جو سمندر کے راستے شہر شہر جایا کرتے تھے ان کا میلہ لگا رہتا تھا۔ سقراط کو اس پہاڑی پر ہر روز آنا بے حد پسند تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بحیرہ روم کے تمام علاقوں کے لوگ سفر کے دوران اس مشہور مقام پر ضرور رکا کرتے تھے۔ ان میں ہر طرح کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ وہاں ایشیائے کوچک، مصر، صقلیہ، ایران اور یورپ کے لوگوں کی بڑی آمدورفت رہتی تھی۔ ان لوگوں سے سقراط کو بہت معلومات حاصل ہوا کرتی تھیں۔ انہی کی وجہ سے سقراط کو ایتھنز سے باہر کسی بھی دوسرے شہر میں جانے کی ضرورت نہیں پیش آتی تھی۔

سقراط ان لوگوں کے ساتھ سیاسیات، کھیل، جنگ اور امن کے موضوع پر بڑی تفصیل سے باتیں کیا کرتا تھا۔ اس پہاڑی پر بیٹھ کر ایتھنز کے لوگ کشتیوں کے مقابلے دیکھا کرتے تھے۔ وہاں جنگی جہازوں کے فوجی مظاہرے بھی دیکھنے میں آیا کرتے تھے۔ اس پہاڑی کو ایک مقدس مقام ہونے کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ اس کے بارے میں مشہور تھا کہ یہاں پر سمندر کے دیوتا پوسائی ڈون ایتھنز کی دیوی ایتھینیا جس کے نام سے ایتھنز شہر کا نام ایتھنز رکھا گیا، یہاں ان دونوں کا مقابلہ ہوا تھا۔

سقراط اس مقام پر بیٹھ کر لوگوں کے ساتھ دیوی ایتھینیا پر بحث کیا کرتا تھا:

ایتھنز شہر کے چاروں طرف زیتون کے سرسبز شاداب باغات اس دیوی ایتھینیا کی ہی بخشش اور دین سے منسوب تھے۔ اس دیوی کو زیتون کا پودا بے حد پسند تھا۔ اسی لیے اس نے ایتھنز شہر کو اپنی

طرف سے اپنی پسند کا یہ تحفہ زیتون کا پودا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایتھنز والوں کے لیے زیتون کی شاخ بڑی مقدس اور بھگوان تھی۔ اولمپک کے کھلاڑی زیتون کا تیل بدن پر لگانا اچھا شگون خیال کرتے تھے۔لوگ عبادت گاہوں میں زیتون کے پاک تیل سے چراغ جلاتے تھے۔ نذر نیاز زیتون کے تیل میں پکایا کرتے تھے۔ سقراط اس مقام پر بیٹھ کر لوگوں کے ساتھ دیوی ایتھینیا پر بحث کیا کرتا تھا۔ اس دیوی کو ایتھینیا ماتا کہہ کر خود بھی ہنسا کرتا تھا اور لوگوں کو بھی ہنسایا کرتا تھا۔ سقراط نے اس عہد کی دیوی دیوتاؤں کے حوالے سے مشہور کہانیوں اور روایات کا اس خوبی سے پردہ چاک کیا کہ جس کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اصل میں سب دیوتاؤں کے لیے جنسی واقعات پر مبنی مقدس کہانیاں سنائی جاتی تھیں اور لوگ احترام سے سنتے اور مانتے تھے۔

حسد اور خوف دنیا میں فساد پیدا کر دیتا ہے:

اسی پہاڑی مقام پر سقراط نے ایک مرتبہ کسی موضوع پر تقریر کرتے ہوئے تاریخ کا ایک بہت بڑا جملہ کہا تھا جو ہر عہد میں تاریخی حقیقت بن چکا ہے۔ جملہ تھا کہ ''حسد اور خوف دنیا میں فساد پیدا کر دیتا ہے'' سقراط کے اس جملے کی حقیقت سقراط کی زندگی میں ہی اس وقت ظاہر ہوگئی جب سپاہیوں کے شہر سپارٹا نے محض حسد اور خوف کی بناء پر ایتھنز پر حملہ کر دیا تھا۔

اسپارٹا نے جنگ میں شکست دی اور ایتھنز کی اینٹ سے اینٹ بجادی:

حسد کی وجہ یہ تھی کہ سپارٹا والوں کا کہنا تھا کہ ایتھنز والے سپارٹا کو جاہلوں، گنواروں کا شہر قرار دیتے ہیں اور خود کو اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ قرار دیتے ہیں۔ خوف اس وجہ سے تھا کہ یہ لوگ جو کسی دوسرے شہر کے آدمی کو اپنے برابر تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں، یہ اگر کبھی طاقت پکڑ گئے تو سپارٹا کو اپنا غلام بنالیں گے حالانکہ سپارٹا اس وقت ایک مکمل فوجی قوت کا مالک تھا اور ایتھنز علم و ادب کی ہی شہرت رکھتا تھا۔ فوجی معاملات میں اس کی دلچسپی کچھ زیادہ نہیں ہوا کرتی تھی۔ ایتھنز والے تہذیب و فلسفے کو ہی اپنا موضوع بنائے رکھتے تھے۔ جنگ و جدل کی طرف ان کا دھیان کم ہی ہوا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تمام عقل و دانش کے ہوتے، ایتھنز کو سپاٹا نے جنگ میں شکست دی اور ایتھنز کی اینٹ سے اینٹ بجادی

تھی۔ سقراط ان تمام واقعات کو حسد اور خوف سے ہی منسوب کرتا تھا۔ جیسے جیسے سقراط کی عمر بڑھتی گئی سقراط کے معمول بھی بدلتے چلے گئے سقراط جب تیس سال کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس کا میل ملاپ شاگردوں، دوستوں اور لوگوں کے ساتھ اپنی قائم کی گئی دانش گاہ میں ہی رہنے لگا۔ وہ اب اپنی دانش گاہ سے باہر بہت کم بازاروں میں آتا جاتا ہے۔ جس شخص کو بھی سقراط سے ملنا ہوتا تھا وہ خود چل کر سقراط کے پاس جاتا تھا۔ سقراط کسی کے پاس چل کر نہیں جاتا تھا۔ سقراط کی ہدایات و تعلیم کا سلسلہ مستقل اور مسلسل رہا کرتا تھا۔ اس میں کبھی بے قاعدگی نہیں آیا کرتی تھی۔

اس کی گفتگو کے انداز سے ذہانت ٹپکتی تھی:

سقراط ایک انتہائی متواضع انسان تھا۔ خلوص اور انکساری اس کی طبیعت کا خاصا تھی۔ دوستوں کا انتہا درجہ کا قدردان تھا، بڑا مہمان نواز آدمی تھا۔ خوبصورت حسن مزاح کا مالک تھا، بات کرتا تھا تو سنا نا چھا جاتا تھا۔ اس کی گفتگو کے انداز سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ انسانی خوبیوں کے تمام امتزاجات سے اس کی شخصیت اس قدر دلکش اور دلنشین بن گئی تھی۔ جس کا کسی دوسرے انسان کے ساتھ مثال دینا مشکل تھا۔ نہ تو سقراط کی ذات میں علم کا کوئی غرور تھا نہ شہرت اور تمکنت نام کی کوئی چیز پائی جاتی تھی۔ سقراط اس قسم کے روایتی عالموں اور استادوں کی طرح ہرگز نہیں تھا۔ جن کے شاگردوں پر ان کے علم کی ہیبت طاری رہا کرتی تھی یا جن کے علم کے رعب داب سے عقیدت مندوں کی گردنیں جھک جایا کرتی تھیں۔ وہ ایسے عالموں میں سے بھی نہیں تھا کہ جو گھر سے باہر نکلا کرتے تو شاگردوں کا ایک جلوس ان کے ہم رکاب ہوا کرتا ان کی ہر بات پر واہ وا کا ورد کیا کرتا۔

سقراط کے تمام شاگردوں میں بات کرنے اور پوچھنے کا حوصلہ ملتا ہے:

اس قسم کے عامیانہ پن کا سقراط کی زندگی میں کوئی واقعہ دیکھنے میں نہیں آتا۔ سقراط نے اپنی ذات کو ایتھنز کے دوسرے عالموں کی طرح کوئی مقدس گائے قرار نہیں دے رکھا تھا۔ اس کی ادب گاہ میں کوئی عام سطح کا انسان بھی سقراط سے کسی بھی بات پر سوال کر سکتا تھا۔ سقراط کے نزدیک بیٹھنے والے لوگوں میں خود بخود یہ تحریک پیدا ہو جاتی تھی وہ معاملات پر بحث تمحیص کیا کرتے تھے۔ چیز دل

کی چھان پھٹک کیا کرتے تھے اور ہر بات کی اصل کو پانے کی کوشش میں مبتلا ہو جایا کرتے۔ سقراط کے تمام شاگردوں میں ہمیں بات کرنے اور پوچھنے کا حوصلہ ملتا ہے، معاملے کی تہہ تک جانے کی جرأت دکھائی دیتی ہے۔

کائنات میں تعلیم کا یہ طریقہ بھی سقراط ہی سے شروع ہوا:

کائنات میں تعلیم کا یہ طریقہ بھی سقراط ہی سے شروع ہوا تھا کہ علم بغیر خوف کے حاصل کیا جانا چاہیے۔ سقراط کہا کرتا تھا کہ ''خوف سے حاصل کیا گیا علم، علم نہیں کہلا سکتا، اس لیے کہ علم خوف کی ضد ہے اور خوف علم کا دشمن ہے۔ علم حاصل کرنے کے لیے ہر انسان کے لیے ایک آزاد ماحول کا ہونا ضروری ہے''

زندگی کا لالچ کرنا کہاں کی دانشمندی ہے:

''جناب! آج جب میں ایک ستر سال کا بوڑھا انسان ہوں تو میرے لیے اس عمر میں زندگی کا لالچ کرنا کہاں کی دانش مندی ہو سکتی ہے۔

معزز جج صاحبان!

میرے خلاف وعدہ معاف گواہ میلے ٹس کے ساتھ معزز جیوری کے سامنے یہ بات ہم دونوں کی بحث میں طے پائی ہے کہ ایک برا انسان ہی کسی دوسرے کو برا بنا سکتا ہے۔ میلے ٹس کے تمام الزامات کی فرد جرم کو اگر پڑھا جائے تو اس نے میری ذات پر یہ الزام کہیں نہیں لگایا کہ ''سقراط'' ایک بُرا آدمی ہے لہٰذا میلے ٹس کے ہی مطابق جب میں برا آدمی نہیں ہوں تو پھر کسی کو بُرا بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس ایک اہم ترین نکتہ سے ہی ریاست کی تمام فرد جرم باطل اور جھوٹ ثابت ہو جاتی ہے۔

یہ الزام کس قدر دلچسپ ہے کہ سقراط خدا پر یقین نہیں رکھتا:

جناب! عدالت کوئی پند و نصیحت کی جگہ نہیں، یہ جگہ مجرموں کی سزا دینے کی جگہ ہے۔

مجھ پر کیسے کیسے اور کیا کیا الزامات ہیں؟ ایک الزام یہ بھی ہے کہ سقراط نئی وحدتوں کے وجود کو

آشکار کرتا ہے۔ سورج کو ایک بڑا پہاڑ یا پتھر کہتا ہے اور چاند کو زمین کا ٹکڑا قرار دیتا ہے۔ یہ الزام کس قدر دلچسپ ہے کہ سقراط خدا پر یقین نہیں رکھتا۔ کیا کوئی انسان ایسا بھی ہے جو زندگی کی تمام چیزوں پر تو یقین رکھتا ہو مگر زندگی پر یقین نہ رکھتا ہو۔ گھڑسواری پر یقین رکھتا ہو لیکن گھوڑوں پر یقین نہ رکھتا ہو۔ بانسری پر تو یقین رکھتا ہو، مگر بانسری بجانے والے پر یقین نہ رکھتا ہو۔ خدا کی قوتوں پر تو یقین رکھتا ہو مگر خدا پر یقین نہ رکھتا ہو۔ مجھ پر یہ الزام ہے کہ میں نوجوان نسل کو روحانی قوتوں کے بارے میں تعلیم دیتا ہوں۔ ایک خدا کے وجود کا اظہار کرتا ہوں، کئی دوسری قسم کی روحانی طاقتوں کا انکشاف کرتا ہوں۔ نہیں، خدا تو خدا ہی ہوتا ہے وہ نیا یا پرانا نہیں اور نہ ہی وہ دوسری یا تیسری قسم سے تعلق رکھتا ہے۔

خدا کرے سقراط ظلم کا شکار ہونے والا آخری انسان ہوتا:

انسان جب اپنے ایمان کی حد کو جانتا ہو کہ اس کا عمل اعلیٰ عمل ہے تو پھر اس انسان کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اس عمل کی پاداش میں اس کے زندہ رہنے کے امکانات زیادہ ہیں یا موت کے۔ میں تو یہ جانتا ہوں کہ ایک اچھے انسان کو ہلاک کرنا تمام انسانیت کو ہلاک کرنا ہے۔

معزز جج صاحبان! خدا کرے کہ دنیا میں ظلم کا شکار ہونے والا ''سقراط'' دنیا کا آخری انسان ہوتا کہ میرے بعد پھر کسی کے ساتھ ظلم اور زیادتی نہ ہو سکے۔

انسان اپنے کردار کا خود مصنف:

معزز جیوری! میں ایک خدا پرست، آزادی پسند اور حریت فکر کا علمبردار ہوں۔ میرا مسلک درویشی ہے۔ میں صوفی ہوں اور مال و دولت سے بے نیاز ہوں۔ ایک گوشہ نشین فقیر ہوں، کسی جاہ و منصب کا خواہاں نہیں ہوں اور نہ ہی حکومت سے کوئی وظیفہ یا صلہ چاہتا ہوں۔

جج صاحبان! میں سمجھتا ہوں کہ انسان کو اپنے کردار کا خود منصف ہونا چاہیے۔ مجھے میرے کردار میں سوائے بھلائی اور خیر کے، اور کچھ نظر نہیں آتا۔ موت اچھی چیز ہے یا بری؟ اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا، لیکن اچھائی کے بارے میں ہر انسان جانتا ہے کہ اچھی

چیز ہے، لہٰذا اچھائی کے راستے میں ناانصافی اور نافرمانی کرنا، دُنیا کی بدترین شے ہے۔ خواہ! انسان کی نافرمانی ہو یا خدا کی۔ میں موت کے خوف سے خدا کی تعلیمات دینے سے روگردانی کرنا خدا کی نافرمانی کے مترادف سمجھتا ہوں۔

تم لوگ میرے قتل کے بعد میرا نعم البدل نہ پاسکو گے:

جج صاحبان! کسی بُرے انسان کو اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دینی چاہیے کہ وہ اپنے سے بہتر انسان کی تذلیل کرے۔ تم لوگ مجھے قتل کر کے آسانی کے ساتھ میرا نعم البدل نہیں پاسکو گے۔

میں اپنے عہد کے لوگوں اور معاشرے کو انسانی صداقت کی اعلیٰ اقدار بلکہ ہر عہد کے معاشرے کو صداقت کے اعلیٰ معیار اور اقدار کا حامل دیکھنا چاہتا ہوں۔ انسانی معاشرے کے تمام انسانوں کو راست گو، انصاف پسند اور اعلیٰ صفات و کردار کا حامل ہونا چاہیے۔

میری مثال ایک بھڑ مکھی کی ہے:

میرا ایمان ہے کہ دیانت کو دولت سے خریدا نہیں جا سکتا، جبکہ دولت کو دیانت سے خریدا جا سکتا ہے، انسانی زندگی میں یہ بات غلط طور پر راہ پا گئی ہے کہ دولت سے ہر چیز کو خریدا جا سکتا ہے۔ میں کہتا ہوں، تم لوگ اگر روز مجھے قتل کرو اور روز زندہ کرو اور پھر قتل کرو تو پھر بھی میں اپنی صداقت کا راستہ تبدیل نہیں کروں گا۔ میں ہر روز قتل ہونا قبول کر سکتا ہوں، بہ نسبت اس کے کہ میں اس روایت سے منہ موڑ لوں، جو بشارت کی شکل میں عطا کی گئی تھی۔

میری مثال ایک بھڑ مکھی کی سی ہے، جسے قدرت نے ریاست کو خوابِ غفلت سے جگانے کے لیے مقرر کر رکھا ہے۔ ریاست ایک عظیم و شحیم، کاہل اور سست جنگی گھوڑے کی مانند ہے، جس میں حرکت پیدا کرنے کے لیے خدا نے مجھے اس پر مامور کیا۔ میں تم لوگوں کو کاٹتا ہوں۔ تمہیں بیدار کرنے کے لیے، تمہیں ڈنک مارتا ہوں، تمہاری سرزنش کرتا ہوں، تمہاری مذمت کرتا ہوں، تمہیں لعن طعن کرتا ہوں۔ میں جب تمہیں جھنجھوڑ کر خوابِ غفلت سے جگاتا ہوں بہت برا لگتا ہے۔ تم ایک ضدی بچے کی طرح مجھ پر خفا ہوتے ہو، مجھے برا سمجھتے ہو، مجھے اپنے سکون میں مخل خیال کرتے ہو۔

میں تمہاری حالت کو بخوبی جانتا اور سمجھتا ہوں، اس لیے کہ تم صرف اپنے لیے سوچتے ہو، میں تم سب کے لیے سوچتا ہوں، تم سب اپنی جہالت کی نیند میں اونگھتے رہنا چاہتے ہو اور میں تمہیں تمہاری جہالت کے خواب سے بیدار کر دیتا ہوں۔ تم سب مجھ سے ناراض ہو گئے ہو۔ تم سب مجھے مار دینا چاہتے ہو اور مجھ سے رہائی پا لینا چاہتے ہو۔

کم یا زیادہ دیر زندہ رہنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا:

عالم غیب ہمیشہ میری رہنمائی کیا کرتا ہے۔ آج میری موت کے فیصلے پر عالم غیب خاموش ہے۔ میں اس کی خاموشی کی مصلحت کو جان چکا ہوں۔ میں اپنی جان کو اس جان آفرین عالم غیب کے سپرد کرتا ہوں۔ ویسے بھی وہ ریاست جس میں میلیٹس اور اناۓ ٹس جیسے انسانوں کی بھرمار ہو، وہاں میرے جیسے انسان کے زندہ رہنے کی کیا ضمانت ہو سکتی ہے؟ کسی اچھے انسان کے لیے کم یا زیادہ دیر تک زندہ رہنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ جو لوگ میری درویشانہ زندگی میں مجھے مارنے پر تلے ہوئے ہیں، اگر ان کے اقتدار کو مجھ سے کچھ خطرہ ہوتا تو جانے یہ مجھے کب کا مار چکے ہوتے۔

بے اصول کے راج پاٹھ میں اصولوں کا قتل سب سے پہلے:

میں نے ٹھیک اسی خیال سے سیاست میں حصہ نہیں لیا تھا کہ سیاسیات میرے مسلک سے میل ہی نہیں کھاتی۔ جو شخص عوام کی خرد افروزی کا وظیفہ ادا کرتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ دربار اور سرکار سے دور رہے۔ اس لیے کہ بے اصولی کے راج پاٹھ میں اصولوں کو سب سے پہلے قتل کیا جاتا ہے۔ میرے اس نقطہ نظر سے جو آدمی بادشاہوں اور حکمرانوں کے قریب رہتا ہے، اس کو اپنی بے عزتی کی شکایت نہیں کرنی چاہیے، میں آج زندگی کے ایک فیصلہ کن موڑ پر کھڑا ہوں۔ موقع پرست لوگ میری موت کو مکافات عمل اور دشمن میری موت کو قدرت کا انتقام کہیں گے، مگر عظیم لوگ میری موت کو انسانیت کے لیے ایک سانحہ قرار دے کر ایک اندوہ ناک واقعہ سے تعبیر کریں گے،

آج میری حالت بھی کچھ ہومر جیسی ہے۔ میں اپنے ساتھ ہونے والی اس ناانصافی پر کتنا بھی دل بڑا کروں، صبر اور ضبط کروں، مگر پھر بھی ہوں تو میں ایک انسان ہی، لکڑی اور پتھر نہیں ہوں کہ کسی

بھی ظلم کا مجھ پر اثر نہ ہو۔ میں نے اپنی اولاد کو منع کر دیا ہے کہ وہ میرے لیے عدالت سے رحم کی بھیک نہ مانگیں۔ میری دانائی، مجھے میری رسوائی کی اجازت نہیں دیتی۔" میں نے عظیم انسانوں کو دیکھا ہے کہ جب ان کو معتوب کیا گیا تو وہ بڑی مردانگی سے پیش آئے تھے۔"

میں التجا کروں گا نہ ہی گڑگڑاؤں گا:

میں التجا کروں گا اور نہ ہی گڑگڑاؤں گا، جو کہ روایتی انداز میں منصفوں اور ججز کی حس انصاف کو بیدار کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ نہیں تو کوئی کہہ سکتا ہے کہ سقراط تو ایک عورت سے بھی بڑا ثابت نہ ہو سکا، مجھ جیسے نامور اور شہرت رکھنے والے انسانوں کے ساتھ مصیبت ہی یہ رہتی ہے کہ ہم کو اپنی تکلیف کا اظہار بھی زیب نہیں دیتا اور یہ کہ میں عدالت کے انصاف کو رحم یا بھیک بھی خیال نہیں کرتا۔ انصاف اصولوں کا پابند ہوتا ہے، عہد یا حلف توڑنے کو کبھی پارسائی تصور نہیں کیا جا سکتا۔

عزت نفس سب سے مقدم ہے:

میں کبھی ان کاموں میں نہیں پڑتا جن میں مجھے اچھائی کی توقع نہ ہو۔ ایک لحاظ سے میرا مقام اور مرتبہ تمہارے مقدس معبدوں کے برابر ہے، اس لیے کہ وہ تمہاری اصلاح کرتے ہیں اور میں بھی۔ میں اس بات پر مکمل ایمان رکھتا ہوں کہ میں حق پر ہوں۔ اب اگر میں موت کے خوف سے سچائی کے محاذ سے بھاگ جاؤں تو کیا عزت دار کہلاؤں گا۔ ایک اعلیٰ انسان کے لیے عزت نفس سب سے مقدم ہے۔ اگر موقف درست ہے تو زندگی کا خوف کیا معنی رکھتا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت ایک ثابت قدم انسان کو اس کی جگہ سے نہیں ہٹا سکتی۔

میں اگر موت کے خوف سے جلاوطنی بھی قبول کر لوں تو ثابت ہو گا کہ میں زندہ رہنے کی خواہش میں اندھا ہو چکا ہوں۔ نہیں ہرگز نہیں! میں ایتھنز چھوڑ کر ہرگز نہیں جاؤں گا۔ میں صداقت کی موت مر کر ایتھنز میں دفن ہونا زیادہ پسند کروں گا۔

اے ایتھنز والو! یہی اوباش کل تم پر میرے قتل کا الزام رکھیں گے:

ایتھنز والو! اس میں کچھ زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ جب میری موت کے بعد تمہیں شہر کے یہی

اوباش افترا پرداز کہ جو آج میری موت کا مطالبہ کر رہے ہیں، کل تم پر میرے قتل کا الزام رکھ کر تمہیں شیطان کہہ کر پکاریں گے۔ مجھے مار کر تمہارے ہاتھ بدنامی کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔ یہی فتنہ باز کہیں گے کہ تم نے سقراط کا خون کر دیا جو کہ ایک دانش مند انسان تھا، لہٰذا وہ، اس وقت مجھے دانشور قرار دیں گے، جب انہیں تمہیں ذلیل کرنا مقصود ہوگا۔ جب کہ میں آج اپنے منہ سے کہہ رہا ہوں کہ میں کوئی بڑا دانشور نہیں ہوں۔

کیا ہی اچھا ہوتا کہ اگر تم نے تھوڑی دیر اور انتظار کر لیا ہوتا تو تمہاری یہ خواہش قدرتی امر کے تحت ہی پوری ہو جاتی۔ اس لیے کہ میں بڑھاپے کی آخری حد کو چھو رہا ہوں۔ تم خود اس بات کا اندازہ کر سکتے ہو کہ اس عمر میں، میں موت سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں کھڑا ہوں۔ اس وقت میرا روئے سخن آپ سب کی طرف نہیں ہے۔ اس وقت میں صرف ان سے مخاطب ہوں، جنہوں نے میری موت پر دستخط کئے ہیں۔ میں ان ججوں کی بات نہیں کر رہا، جنہوں نے مجھے بے گناہ قرار دیا ہے۔ اس وقت میں ان ججوں کی بات کر رہا ہوں، جنہوں نے مجھے سزائے موت کا حکم سنایا ہے۔

مجھے اپنے اسلوب میں بات کر کے مرنا کیوں قبول ہے:

میرے پاس ان جج صاحبان کو کہنے کے لیے ایک دوسری بات بھی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ مجھے اس لیے سزائے موت ہوئی ہے کہ مجھے اپنا مقدمہ لڑنا نہیں آتا تھا، یا میں نے اپنے مقدمے کی پیروی ٹھیک طریقے سے نہیں کی، یا میں استغاثے کا جواب صحیح طریقے سے نہیں دے پایا، یا میں عدالت کو اپنی بریت کے لیے انصاف پر آمادہ نہیں کر پایا یا میں نے اپنی رہائی کے لیے کوئی کسر باقی چھوڑ دی، یا میرے پاس وہ الفاظ ہی نہیں تھے جو میری رہائی کا باعث بن سکتے: لہٰذا مجھے سزائے موت دلانے کا باعث ہو، وہ فقدان الفاظ کی کمی کا نہیں تھا اور نہ مجھ میں کوئی اہلیت کا فقدان تھا، جس کے باعث مجھے موت کی سزا سنا دی گئی اور میں اپنا صحیح معنوں میں دفاع نہیں کر پایا۔ یقیناً ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ ہاں! البتہ، میرے پاس بے حیائی کا فقدان ضرور تھا کہ میں تمہارے سامنے اپنی گردن نیچی کر کے کھڑا رہتا جیسا کہ تمہاری خواہش تھی کہ میں ہاتھ باندھ کر تم سے التجائیں کرتا، آنسو بہاتا،

گریہ زاری کرتا، ماتم کرتا، فریاد کرتا تمہارے سامنے ایڑیاں رگڑتا، ان کے علاوہ اور بہت کچھ کہتا اور بہت کچھ کرتا جس طرح کہ تم دوسرے لوگوں سے سننے کے عادی ہو چکے ہو۔ ان کے برعکس جو رویہ میں نے اختیار کیا اس کو قابل ستائش ہی نہیں سمجھا گیا اور نہ ہی وہ تمہارے نزدیک قابل ستائش ہوسکتا تھا۔ وہ تمہاری انا کو تسکین نہیں دے سکتا۔ وہ رویہ تمہاری حس ظلم کو متاثر نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے پہلے دن ہی یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنی زندگی کو خطرے میں دیکھ کر مجھے کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے اور نہ ہی مجھے اب اپنے دفاع کے طریقہ کار پر کوئی پچھتاوا ہے۔ مجھے اپنے اسلوب میں بات کرنے کے بعد مر جانا قبول ہوگا۔ بجائے اس کے کہ میں تمہارے انداز میں بات کروں اور زندہ رہوں۔

موت کے قریب کیا قدرت پیغمبرانہ قوت عطا کرتی ہے!

اب میں ان لوگوں سے مخاطب ہوں، جنہوں نے مجھے موت کی سزا دی ہے۔ اس وقت کہ میں اپنے خالق حقیقی سے ملنے والا ہوں، اور موت کے قریب، قدرت انسان کو پیغمبرانہ قوت عطا فرماتی ہے یعنی جب انسان موت کے عالم میں سے گزر رہا ہو تو اس پر تمام دنیا کی صداقتیں ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اور قدرت، ہر غیب کو ظاہر کر دیتی ہے اور اب جب کہ میں اس عالم سے گزر رہا ہوں، مجھ پر بھی قدرت کی طرف سے تمام اسرار کو ظاہر کر دیا گیا ہے، میں اس وقت ہر چیز کی حقیقت کو دیکھ رہا ہوں۔ اس حالت میں ان کے لیے پیش گوئی کرتا ہوں کہ جو میرے قاتل ہیں۔ جنہوں نے مجھے سزائے موت دی ہے، میرے اس دنیا سے رخصت ہونے کے فوراً بعد جو عذاب تم نے میری جان پر توڑا ہے، اس سے کہیں بھاری عذاب تمہاری راہ دیکھ رہا ہوگا۔

عظمت و شرافت کیا ہے:

کسی کو قتل کر دینا تو بہت آسان اور سہل بات ہے۔ عظمت اور شرافت یہ نہیں ہے کہ تم دوسروں کو بیکار بنا دو، عظمت اس میں ہے کہ تم خود کو کارآمد بناؤ، شرافت یہ نہیں ہے کہ اپنے سے اعلیٰ اور بہتر انسان کو ختم کر دیا جائے۔ شرافت یہ ہے کہ اس انسان سے خود کو اعلیٰ اور بہتر بنایا جائے۔ لہٰذا، یہ کوئی

شرافت نہیں کہ تم اپنی اصلاح کی بجائے دوسروں کی جان کے دشمن بن کر ان کی زندگی کے چراغ گل کردو۔ شرافت یہ نہیں ہے کہ دوسروں کا خون کر دیا جائے، شرافت تو یہ ہے کہ اپنی اصلاح کی جائے۔

میری موت اتفاقیہ نہیں ہے!

صاحبو! ایسا نہیں کہ میرے خاتمے کا وقت محض اتفاقیہ پر آن پہنچا ہے، یا محض اتفاقیہ طور پر میری موت واقع ہو رہی ہے۔ خدا گواہ ہے، ایسا ہرگز نہیں، بلکہ میں صاف طور پر دیکھ رہا ہوں کہ میرا وقت قریب آ پہنچا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے جب میرے لیے یہی بہتر ہوگا کہ میں اس دنیا کے تمام دکھوں اور تمام تکالیف سے چھٹکارا پالوں۔ میری موت کا وقت متعین ہو چکا ہے۔ یہ حکم ربی ہے کہ عالم غیب سے جو بشارت مجھے ہر قدم پر میری رہنمائی کیا کرتی تھی، وہ اس موقع پر خاموش ہے۔ اس نے اس سے متعلق مجھ پر کوئی علامت ظاہر نہیں کی۔ گویا، میری موت رضائے الٰہی ہے۔

مجھے اپنے قاتلوں سے کیوں ناراضی نہیں ہے!

یہی ایک وجہ ہے کہ مجھے جن لوگوں نے سزائے موت سنائی ہے میں ان سے بھی کوئی ناراضی نہیں رکھتا۔ مجھے اپنے قاتلوں سے بھی کوئی شکایت نہیں اور نہ ہی مجھے اپنے مدعیوں سے کوئی گلہ ہے۔ انہوں نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا، ہر چند کہ ان کو قطعی طور پر میری کوئی بھلائی مقصود نہیں تھی۔ یہ ہرگز نہیں چاہتے تھے کہ میرا بھلا ہوتا۔ اس کے باوجود میں ان کے فائدے کے لیے ان سے کہوں گا کہ میں پورے ایتھنز کو اپنی اولاد تصور کرتا ہوں ان کو اپنے بیٹے اور اپنے بچے خیال کرتا ہوں۔

ایتھنز والو! تم ان کو خود سزا دینا:

ایتھنز والو! آج میں ان کی اصلاح کا کام تم سب کے سپرد کرتا ہوں۔ میں کہوں گا کہ تم ان کو ضرور سزا دینا۔ میری یہ خواہش ہوگی کہ تم انہیں بھی اسی طرح ستانا جس طرح کہ میں تمہیں ستایا کرتا تھا۔ اگر تم ان کو دیکھو کہ وہ دیانت یا پاک بازی یا نیکی سے بڑھ کر امارت یا دولت یا دنیا کی کسی اور شے کو زیادہ پسند کریں یا ان کو ان سے بڑھ کر اہمیت دیں، یا کسی شے کے بارے میں باطل دعویٰ کریں

کہ وہ ان کے پاس ہے جب کہ وہ حقیقت میں ان کے پاس نہ ہو۔ یعنی اگر وہ کسی جھوٹے علم وفضل کا دعویٰ کریں، جب کہ وہ عالم وفاضل نہ ہوں تو تم ان پر ثابت کر دینا کہ تمہارا یہ دعویٰ غلط ہے۔ تم وہ کچھ نہیں ہو جو کہ تم اپنے بارے میں خیال کرتے ہو۔

جیسا کہ ایتھنز والو! میں نے تم پر ثابت کیا ہے کہ تمہارا علم ناقص ہے اور تمہارے دعوے بالکل غلط ہیں۔ اس طریقے سے تم بھی ان کا محاسبہ کرنا، اگر وہ ان باتوں کا خیال نہ کریں جن کا ان کو کرنا چاہئے۔ اگر وہ ان چیزوں کو اہمیت نہ دیں، جن پر ان کو اہمیت دینی چاہئے اور وہ یہ خیال کریں کہ وہ کوئی بڑی اہم شخصیت بن چکے ہیں یا وہ کوئی بڑے شے بن چکے ہیں تو تم سب ان کو جھنجوڑنا، ہوش میں لانا جس طرح کہ میں نے تمہیں جھنجوڑا ہے۔ ان کا احتساب کرنا جس طرح کہ میں تمہارا احتساب کرتا تھا۔

تم ان سب کو اسی طرح ستاؤ جیسے میں نے تمہیں ستایا:

میری یہ خواہش ہوگی کہ تم ان سب کو اسی طرح ستاؤ جس طرح میں نے تمہیں ستایا ہے۔ اگر وہ باطل دعوے کریں۔ اگر وہ خود کو کوئی بہت بڑی شے خیال کرنے لگ جائیں۔ اگر وہ اپنے علم کے گھمنڈ میں غرور اور تکبر کی حدوں کو چھونے لگ جائیں۔ اگر وہ جہالت کو علم پر ترجیح دینے لگیں۔ اگر وہ عقل اور دلیل کے دشمن بن جائیں۔ اگر وہ دولت اور شہرت کو ہی خالی انسان کی عظمت کا معیار قرار دے دیں اور نیکی اور صداقت کو کوئی وقعت نہ دیں۔ اگر وہ انسان کی عزت اور وقار کو دنیا کی ہر چیز سے بلند خیال نہ کریں اور علم ودانش کو دنیا کا سب سے بڑا سرمایہ خیال نہ کریں۔ حق گوئی اور انسانیت پرستی کو اگر اپنا مذہب قرار نہ دیں۔ اگر خدا کی ذات کو اپنی تحقیق وجستجو کا محور قرار نہ دیں تو تم سب ان کا ضرور محاسبہ کرنا۔ یہی میری آخری خواہش ہے اور یہی میری وصیت۔

میرے رخصت ہونے کا وقت آن پہنچا:

ایتھنز والو! اگر تم ایسا کرو گے تو تمہاری اولاد اور آئندہ بیٹے تم سے انصاف حاصل کر لیں گے اور ہم تمہارے شکر گزار ہوں گے۔ میرے رخصت ہونے کا وقت آن پہنچا ہے اور ہم کو اپنے اپنے

راستوں پر جانا ہے۔ مجھے مرنا ہے اور تمہیں فی الحال زندہ رہنا ہے۔ ان دونوں راستوں میں سے کون سا راستہ بہتر ہے؟ وہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ میں تمہیں بھی اسی خدا کے حوالے کرتا ہوں''

ایسے استاد جس عہد میں بھی ہوں گے، یاد رکھے جائیں گے

یہ تھے وہ تاریخی الفاظ جو ایک خود آ گاہ ستر سال کے بوڑھے فلاسفر استاد نے یوں آسانی سے ادا کر دیئے جس کے لیے زندگی کا لالچ کرنا دانش مندی نہ تھی ..... ہزاروں سالوں کے بعد آج بھی تاریخ، فلسفہ اور علم سقراط اور اس کے لفظوں کے بنا ادھورا رہتا ہے جس استاد نے اپنے آپ کو جانا۔ اپنے لفظوں کو اور خیالوں کو جانا۔ ان کی قدر کی اور ایک خود آ گاہ استاد کے طور پر انہیں مفہوم اور معانی عطا کیے۔ اس کی عزت، شہرت کو اب دوام ملا کہ تاریخ عالم میں اس کی مثال ڈھونڈنا مشکل ہے۔

ایسے استاد جس عہد میں بھی ہوں گے، یاد رکھے جائیں گے۔ کتابوں۔ لفظوں، فلسفوں اور دلوں میں زندہ رہیں گے۔

10

باب دہم

دلوں میں جگہ
کیوں نہیں بنتی؟؟؟

حضرت زکریاؑ کی ایک محبوب دعا کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک اور پاکیزہ کلام پاک کا حصہ بنایا ہے۔ یہ سورۃ مریم کی آیت ہے، خود شناسی کی انتہا پر واقع اتنے خوبصورت الفاظ میں پڑھ کر ہی روح خوشی اور سکون سے بھر جاتی ہے، وہ کہتے ہیں۔

میں ایسا خوش قسمت ہوں، خوش بخت ہوں اور اے میرے رب میں تجھ سے مانگ کر آج تک میں محروم نہیں رہا" یہ خالی لفظ نہیں ہیں محبت اور اعتماد سے بھرا پورا خزانہ ہے۔ لفظ نہیں ہیں نور ہے پورا۔ دل کے اطمینان کا اظہار ہے، اپنے محبوب رب سے محبت اور اس پہ یقین کا اقرار ہے۔

آپ نے کبھی جانا ہی نہیں کہ مجھے اس سے مانگنا کیا ہے؟

آپ اتنے پڑھے لکھے استاد ہیں کہ جن کی شخصیت میں علم کے ساتھ ساتھ رعب تھوڑا زیادہ ہوتا ہے، کہیں تعلقات کا غرور ہوتا ہے، کہیں اپنے سکول کو دوسروں سے اچھا اور بہتر چلا کر دکھانے کا احساس، کہیں علاقے میں ممتاز نظر آنے کی طاقتور خواہش۔ کہیں ایوارڈ لینے کا خیال، کہیں اپنی ڈگری کا زعم، کہیں اپنے دوستوں کا فخر، کہیں اپنے خاندان کا مان، یہ ساری چیزیں مل کر ایک استاد کو ایک مختلف چیز بنا دیتے ہیں، ایک عجیب سا مرغوبہ جو اکثر یہ بھی جان نہیں پاتا کہ اپنے رب سے وہ مانگے کیا؟

جس طرح حضرت زکریاؑ نے کہا کہ میں مانگ کر کبھی محروم نہیں رہا اور اگر کسی نے کبھی ٹھیک سے مانگا ہی نا ہو، اور جانا ہی نا ہو کہ مجھے اس سے مانگنا ہے کیا؟ کیا دس بچوں کا پاس ہونا، کیا وقت پر تنخواہ کا آنا مانگیں گے؟ کیا سکول کا پھیلنا مانگیں گے؟ کیا سکول میں بچوں کی تعداد مانگیں گے؟ کیا وقت پر سکول میں بچوں کا آنا مانگیں گے؟ جب تک واضح نہ ہوگا کہ مانگنا کیا ہے، جب تک آپ اس چیز کو بہت واضح طور پر جانیں گے کہ اصل میں آپ چاہتے کیا ہیں؟ اور خود آپ کس لیے زندہ

ہیں؟ کس لیے آپ کو یہاں بھیجا گیا، اللہ کے دین کو بھی سمجھا کہ نہیں، اس کا منشا بھی جانا کہ نہیں، اس کی ہدایت کی طلب کی کہ نہیں، آخر آپ کس لیے ایک پوری کائنات میں مصروف ہیں؟ کیا صرف سرکاری نوکری اور تنخواہ کے لئے آپ کو پیدا کیا گیا تھا، یا اپنے گاؤں اور کمیونٹی میں ہر دم سازشی سیاست کرنے اور اپنی جھوٹی شان بنانے کے لئے دنیا میں بھیجا گیا تھا۔ جب یہی نہیں جانتے تو کہاں کی خودشناسی اور کہاں کی خود آگاہی، آپ دعا کے ہر مزے اور ہر لذت سے ہی محروم رہیں گے۔

کبھی لوگ پوچھتے تھے کبھی آنحضور ﷺ بھی پوچھتے تھے:

اس محرومی سے بچنے کا بھی ایک طریقہ رہا ہے۔ محفل نبوی کا ایک عجیب انداز ہوتا تھا کبھی لوگ پوچھتے تھے کبھی آنحضور ﷺ پوچھتے تھے۔ وہ سارے کمال ادب وآداب والے شاگرد تھے، اپنے استاد کے سوال کا جواب بڑی محبت سے دیتے تھے اور اکثر یہ کہتے تھے اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ آنحضور ﷺ نے ایک بار پوچھا "کیا تم جانتے ہو دنیا میں سب سے بڑا سخی کون ہے؟ تو جتنے لوگ سامنے بیٹھے ہوئے تھے تو سب نے یک زبان ہو کر کہا

اللہ اور اس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ یہی ان کی تربیت تھی، اسی نے انہیں پھل دار انسان بنایا

آنحضور ﷺ کے جواب میں کبھی کسی نے بتانے کی کوشش نہ کی کہ میں آپ کو بتاتا ہوں، میرے پاس کافی علم و دانش اور ذہانت موجود ہے جیسے ہم بھی کرتے ہیں تو آپ ﷺ نے کہا"

دنیا میں سب سے زیادہ سخی تو ہمارا رب ہے، وہ مہربان اللہ، اس سے بڑھ کر کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔"

پھر کہا لوگو کیا تم جانتے ہو کہ اللہ کے بعد دنیا میں کون بڑا سخی ہے؟

لوگوں نے پھر وہی کام کیا اور لوگ کون ہیں؟ محبت کرنے والے، ساتھ اُٹھنے بیٹھنے والے، جان قربان کرنے والے، کہا یا رسول اللہ ﷺ آپ جانیں اور آپ کا رب بہتر جانے۔

تو کہا زندہ لوگوں میں رب نے اپنے رسول کو سب سے زیادہ سخی بنایا ہے۔

پھر تیسری مرتبہ پوچھا کہ بتاؤ میرے بعد کون سخی ہے؟

لوگوں کا پھر وہی جواب تھا

تو اب رسول اکرم ﷺ نے مسکرا کر کہا

''میرے بعد سخی وہ ہے جس نے علم کو آگے پہنچایا، پہلے بڑی محبت کے ساتھ اس علم کو حاصل کیا اور پھر اس کو آگے پہنچایا'' اور اگلا جملہ کیسا کمال کا تھا نوٹ فرمائیے

''قیامت کے دن ایسا شخص ایک امت کے طور پر اٹھایا جائے گا۔''

جنت میں لوگ فارغ تو نہیں بیٹھے ہوں گے:

کتنے لوگ ہوں گے آپ کے آس پاس جنہوں نے آپ سے اس وجہ سے علم سیکھا ہو گا۔ ہم بہت دور تک سوچتے نہیں، اکثر ہم ماضی میں ہی رہتے ہیں مگر تصور کی آنکھ سے کم ہی دیکھتے ہیں، کبھی آنکھیں بند کر کے سوچیے گا کہ آنے والے بہت سالوں کے بعد قیامت کا منظر ہو اور پھر فیصلے کی گھڑی کے بعد جنت عطا ہو جائے، جنت میں لوگ نہروں کے کنارے فارغ تو نہیں بیٹھے ہوں گے، یقیناً وہاں بھی جگہ جگہ بورڈ لگے ہوں گے، وہاں جگہ جگہ معروف، اچھے اور نیک نام اساتذہ کی چھوٹی چھوٹی امتیں ان کے شاگردوں کی صورت موجود ہوں، دنیا میں سب سے سچی بات تو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے ہی کہی جاتی ہے اور اس پر آنکھیں بند کر کے یقین ہو تو ہی ایمان مکمل ہوتا ہے، ورنہ نہیں ہوتا۔ کیا آپ جیسا ایک خود شناس استاد اس ایمان سے محروم رہ سکتا ہے۔

جس سے محبت کرو گے اسی کے ساتھ اٹھائے جاؤ گے:

مدینہ منورہ میں ایک سانولے سلونے نوجوان تھے، ثوبانؓ نام تھا ان کا، 18,19 سال کے ہوں گے، مسجد نبوی روزانہ آتے تھے، نماز پڑھتے تھے اور ٹکٹکی باندھ کر آنحضور ﷺ کو دیکھا کرتے بس تکتے رہتے پھر چلے جاتے، ایک دن نہیں آئے، دو دن نہیں آئے تو آنحضور ﷺ نے پوچھا کہ ثوبانؓ کو کیا ہوا؟ یاد رہے ثوبان ایک غلام زادے تھے تو بتایا گیا کہ بیمار ہو گیے ہیں۔ آپ ایسے مہربان استاد کا صرف اسی جگہ سے تعلق نہیں کہ جو آیا، اس سے مل لیا۔ نہ آیا تو ہماری طرح یاد بھی نہ رکھا، نماز کے بعد اپنے اصحاب کو ساتھ لیا اور ان کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ ثوبانؓ لیٹے ہوئے ہیں، ان کا رنگ زرد

ہو چکا تھا اتنے بیمار تھے کہ آپ ﷺ کو دیکھ کر وہ اٹھ بھی نہ سکے، بے تحاشا کمزور ہو چکے تھے، اللہ کے رسول ﷺ نے پوچھا "ثوبان کیا ہوا؟"

ثوبانؓ نے جواب دیا یا رسول اللہ ﷺ کیا بتاؤں زندگی میں ایک ہی محبت کی اور وہ آپ ﷺ سے، میں تو مسجد آتا ہی آپ ﷺ کو دیکھنے کے لیے تھا، نماز کے بعد بیٹھ جاتا تھا آپ ﷺ کو تکتا رہتا تھا یوں میری آنکھیں ٹھنڈی رہتیں، پھر اگلی نماز پر یہی کرتا۔ میری زندگی کا مقصد، محور صرف آپ ﷺ کو دیکھنا اور آنکھوں کو ٹھنڈا کرنا تھا اور دل کو سکون دینا اور تو میری زندگی میں کچھ تھا ہی نہیں، پھر یہ ہوا کہ چند روز پہلے جب میں واپس آ رہا تھا تو میں نے سوچا ثوبانؓ اگر تو مر گیا تو قبر میں آنحضور ﷺ کو کیسے دیکھے گا؟ اور اس کے بعد کے مراحل میں کہاں تو اور کہاں محمد ﷺ، کیا خبر پھر ملاقات ہو بھی سکے گی یا نہیں تو یا رسول ﷺ اس سوچ نے میرے جسم سے جان ہی نکال دی، میں تو اُٹھنے کے قابل نہ رہا اور چارپائی پر گر گیا، اب مجھے لگتا ہے کہ کوئی دم آتا ہے کہ میرا دم جاتا ہے۔

رسول ﷺ اس کے قریب ہوئے، ماتھے پر ہاتھ رکھا اور کمال محبت سے فرمایا

"ثوبانؓ یاد رکھ! جس سے محبت کرے گا، اسی کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔"

صحابہؓ کہتے ہیں کہ پوری زندگی میں یہ دوسرا موقع تھا جب ہم اس قدر خوش ہوئے تھے۔ پہلا موقع وہ تھا کہ جب ہم نے ایمان قبول کیا تھا اور دوسرا موقع یہ تھا جب اللہ کے رسول ﷺ کے اس جملے نے ہمیں زندگی کی سب سے زیادہ خوشی عطا کر دی تھی'"

محبت بڑی احتیاط سے کرنی چاہیے:

تو اے پیارے اور محترم اساتذہ! محبت بڑی احتیاط سے کرنی چاہیے۔ جس سے بھی کی جائے قیامت کے روز اس کے ساتھ اُٹھنا پڑتا ہے اور علم سے تعلق بہت اخلاص سے جوڑنا چاہیے کہ یہ بہت ممکن سالوں، عشروں اور دہائیوں کام کرتے کرتے خود آپ ایک امت بن جائیں۔ کس طرح بنیں گے یہ میں نہیں جانتا، مگر میرا دل جانتا اور مانتا ہے کہ جیسے اللہ کے رسول ﷺ نے یہ کہا تھا کہ تمہاری اچھی گواہی تمہارے گھر سے آتی ہے۔ اگر تمہاری بیوی اور بچے گواہی تمہارے حق میں نہیں دے

رہے تو بخشش کا کوئی امکان نہیں۔ بخشش، کامیابی یہ Casual thinking نہیں ہے جیسے Pair of words ہم بولتے ہیں ایک سے لفظ ہوتے ہیں ایک سی Sound ہوتی ہے مگر معنی میں زمین اور آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ ہر محبت ہی کامیابی یا مکمل ناکامی کا سامان بنتی ہے۔

جب اپنی گواہی کی ضرورت پڑی تو 40 بھی پورے نہ ہوں:

ہمارے ایک دوست ہیں، ایک سکول میں پرنسپل ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ جہاں رہتے ہو تمہیں اس جگہ کتنے لوگ جانتے ہیں؟ کہا کہ تین چار گلیوں تک تو لوگ جانتے ہوں گے۔ تو میں نے کہا کہ کبھی ٹارگٹ کیا ہے کہ بچوں کو ڈھونڈنے اور پڑھانے کے علاوہ کہ کل جب تمہارا جنازہ ہو تو اس میں تین چار گلیوں سے ہٹ کر بھی لوگ آ جائیں۔ تین چار گلیوں سے تو 40 لوگ پورے نہیں ہونے والے اور یہ کیسی پلاننگ ہے کہ لوگوں کے بچوں کو پڑھاتے پڑھاتے جب اپنی گواہی کی ضرورت پڑی تو 40 بھی پورے نہ ہوں۔ پھر گلی محلے میں بات ہو کہ ماسٹر صاحب کا جنازہ بھی پورا نہ ہوا، جس سکول میں ساری عمر کام کیا، اس میں اس روز چھٹی بھی نہ ہو، جس گاؤں میں ساری عمر رہے وہاں صف ماتم بھی نہ بچھے، ایسی تو نہ ہو جیسا جنگ کے ایک کالم نگار کے مرنے کے بعد اخباروں میں کالم لکھے گئے کہ اتنے بڑے دانشور اور کالم نگار صاحب مر گئے اور جنازے پر چار بندے بھی پورے نہیں ہوئے پھر دوسرے کالم نگار لوگوں کی اس کمی کے تجزیے کریں، دکھ سے سکرپٹ لکھیں کہ ہائے ہائے کیا ہوا، لوگ کیوں نہیں آئے، یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ جب تک ان کو آپ سے محبت نہ ہوگی وہ کیوں آئیں گے۔ آپ کے کام، آپ کے خلوص، آپ کی اپنے رب سے محبت، اس کے بندوں سے اخلاص، اپنے طلبہ سے تعلق ہی طے کرے گا کہ کتنے لوگ آئیں گے۔ عقل مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان مسلسل سیکھتا ہے۔

اتنے عام سے دوستوں میں آپ اتنے خاص کیسے ہو گئے:

ایک معروف دانشور ہیں تاریخ میں، حکیم جالینوس ان کا نام ہے۔ ان کے بہت عام سے

دوست تھے۔ حکیم صاحب سے کسی نے پوچھا کہ اتنے عام سے دوستوں میں آپ اتنے خاص کیسے ہو گئے۔ آپ کے دوستوں کو تو سارے شوق تھے، ہر وہ برا شوق جو معاشرے میں برے لوگوں کو ہوتا ہے تو حکیم صاحب نے کہا کہ میں نے اپنے چراغ کے تیل کے لیے اتنے پیسے خرچ نہیں کیے جتنے انہوں نے شراب خریدنے کے لیے لگائے تھے بلکہ میں نے ان سے کہیں زیادہ خرچ کیے اس دیے کی روشنی میں کیے گئے مطالعے نے مجھے ان سے مختلف کر دیا، بہتر بنا دیا۔

دیکھیں کہیں نہ کہیں کوشش کرنی پڑتی ہے، Effort کرنی پڑتی ہے پھر جا کر کہیں ویسی بات بنتی ہے جیسے کوئی Invest کی جاتی ہے، جیسا بیج ویسا پودہ اور پھر ویسا ہی پھل۔ جیسا پرنسپل ویسے اس کے آل اولاد جیسے اساتذہ، جیسا استاد ویسے ان کے ہاتھ سے نکلنے والے شاگرد۔ کہیں دل میں کوئی بڑی سوچ ہوگی تو رب سے اس کی تکمیل جیسا کچھ مانگیں گے پھر ویسا ہی کام کریں گے مگر سچ تو یہ ہے کہ ہم تو اپنے رب سے مانگنے کے بارے میں بھی سنجیدہ نہیں ہوتے، اپنی آرزو تک نہیں جانتے۔ کیا مانگنا ہے اس بارے میں یکسوئی تک نہ ہو، اس بارے میں ہی انسان واضح نہ ہو تو نتائج کا آپ بخوبی سوچ سکتے ہیں۔

یہ کیسا نقصان بھرا سودا کیا آپ نے....!

آج اس لمحے ہم ذرا سوچ لیتے ہیں کہ اتنا بڑا رب جس کے بارے میں سارے لوگ کہتے ہیں کہ God is so Big, He loves to fullfill big dreams and desires اتنی دنیاؤں کا اتنا بڑا رب ہے اس سے زیادہ لینے کے لیے خواہش بھی بہت بڑی ہونی چاہیے، چھوٹی چھوٹی خواہشوں کے ساتھ رب سے نہ مانگا جا سکتا ہے نہ رب سے جڑا جا سکتا ہے، بہت بڑے نتائج بھی حاصل نہیں کیے جا سکتے۔ بڑے نتیجوں کے لیے، بڑے کاموں کے لیے، بڑے منصب کام نہیں کرتے، ان منصبوں پر بیٹھنے والے لوگ بہت اہم ہوتے ہیں اور وہ لوگ تب اہم ہوتے ہیں جب وہ کچھ جانتے ہوں، وہ خود ہی نہ جانتے ہوں تو آپ سوچئے کہ پھر وہ کس کام کے۔ بطور استاد آپ بھی تو ایک بڑے منصب پر فائز ہیں، سب کو خبر ہے آپ ہی بے خبر ہیں...... نہ اپنے دل اور علم کی روشنی

کے لیے دیے کے تیل پر خرچ کیا نہ دنیا کے مالک سے ہی جڑے اور اس کی رضا کے لئے وہ پڑھایا اور سکھایا جو اسے پسند تھا، بلکہ بدقسمتی تو یہ کہ یہ تک نہ جانا کہ اسے پسند کیا ہے۔ ایک لمحے کو سوچئے اسے بھلا بچوں کے نمبروں اور گریڈز سے کیا لینا، جو اس سے محبت ہی نہ کرنا سیکھ سکے، اس کی کتاب کو پیار سے پڑھنے کی عادت ہی نہ بنا سکے، جنت اور دوزخ کے لئے ضروری اعمال کا فرق بھی نہ پہچان پائے، دین کو غالب کرنے، اللہ کی تعلیمات اور احکامات کو دنیا میں پھیلانے کو اپنی زندگی کا مقصد ہی نہ بنا سکے یوں نہ آپ خود خاص بن سکے اور نہ ہی اپنے بچوں کو خاص بننے کا موقع دیا۔ اتنی لمبی نوکری اور یہ گھاٹے کا سودا..... یہ کیسا نقصان بھرا سودا کیا آپ نے....!

اب بوتل وہیں رہ گئی دانت کا مسئلہ بن گیا:

نقصان سے یاد آیا ہم ایک دوست کے ہاں گئے ہوئے تھے۔ تو وہ بڑی پریشانی میں تھا کبھی اندر جائے، کبھی باہر آئے، کبھی اندر، کبھی باہر، پھر آ کر کہنے لگا یار گھر میں کچھ کھانے کو نہیں ہے پھر وہ قریبی دوکان پر چلا گیا تو وہاں سے گرم گرم بوتل لے کر آیا اور اب چابی نہیں تھی اس کو کھلنے کے لئے، کھولتے کھولتے دانتوں سے دانت کلک کر گئے، بوتل وہیں رہ گئی دانت کا مسئلہ پڑ گیا پھر اس نے اس بوتل کو چارپائی پر مار کر کھولنا چاہا تو بوتل کا منہ ٹوٹ گیا۔ اب ہم اسے کہیں کہ بس کرو، بس کرو تم، وہ کہے نہیں مہمان آئے ہوئے ہیں کچھ تو دینا فرض بنتا ہے۔

آپ کو کیا لگتا ہے وہ بوتل آپ سے پی جائے گی، دانت اس کا ٹوٹا ہوا ہو، بوتل کا منہ الگ سے ٹوٹا ہوا، اوپر سے گرم گرم بوتل، کیسے پئیں گے آپ؟ اس واقعہ سے میں نے سیکھا کہ کبھی ہمارے گھر میں مہمان آئیں تو ایسا معاملہ کبھی نہ ہو، اب عام طور پر ہم تین چار بوتلیں الگ سے رکھتے ہیں، بچوں کی پہنچ سے دور، بچوں کے لیے الگ سے رکھتے ہیں۔ وہ خالص مہمانوں کے لیے ہوتی ہیں تاکہ جب وہ آئیں تو ان کے لیے بھاگنا نہ پڑے، دوڑنا نہ پڑے، اس وقت پریشانی نہ آئے اسے تیاری Preparation کہتے ہیں۔ اصل تیاری Preparation تب ہوتی ہے جب آپ بہت واضح دیکھ سکتے ہوں، اندر سے سوچ سکتے ہوں کہ مجھے بطور استاد کیا اور کہاں کہاں کون سا علم

تقسیم Deliver کرنا ہے۔ عمر بھر کا نہیں تو سال کے آغاز میں تو آپ اپنے علم کو تقسیم کرنے کے اہداف طے کر سکو، اس سال کون کون سی خوبیاں بانٹنی ہیں، یہ سال قرآن کی تعلیمات بتانے کا ہے یا یہ سال احادیث سنانے اور پڑھانے کا، یا اس سال دنیا میں آنے والے نئے علوم بتانے کی باری ہے۔

اب تو Inference اثر پزی کا زمانہ ہے:

دنیا بھر میں یہ کہا جاتا ہے کہ ابھی وہ زمانہ گزر گیا جب اتھارٹی مانی جایا کرتی تھی۔ تعلیمی اداروں میں بھی استاد کی اتھارٹی کم ہوئی ہے، اب تو باپ کی اتھارٹی بھی پوری طرح نہیں مانی جاتی۔ گھر میں ماں کا غصہ بچے پوری طرح نہیں مانتے، پرنسپل کے سامنے استاد اسکی پوری اتھارٹی نہیں مانتے۔

اب تو Inference اثر پزیری کا زمانہ ہے اور Inference تب آتا ہے جب لوگ آپ سے محبت کرتے ہیں، جب لوگ آپ پر یقین کرتے ہیں کہ یہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔ کبھی آپ کسی ایسے بندے سے محبت کر سکتے ہیں جس کے بارے میں آپ کو یقین ہو کہ وہ کسی سے مخلص نہیں ہے۔ .....کبھی آپ کسی ایسے استاد سے کیسے محبت کر سکتے ہیں جس کے بارے میں جانتے ہوں کہ ہر بندہ جا کر اس کے کان بھر سکتا ہے۔ اور وہ کانوں کا ایسا کچا ہے کہ اس سے جس نے کوئی چغلی کی، غیبت کی وہ دل میں اس بات کو پکا کر کے بیٹھ جاتا ہے اور جب وہ خود آتا ہے تو لوگ اس کی عزت کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ خود ساری ہی سنی سنائی، کچی پکی باتیں سنا کرتا ہے۔.....ایسے استاد سے آپ محبت کرنے پر کیسے آمادہ ہو جائیں گے کہ پاس سے گذرتا ہوا ہر فرد میل/ فی میل اس کی نگاہوں کا نشانہ بنتا ہو، کوئی اسکی نگاہوں سے محفوظ نہ ہو، اس پر اعتبار ہی نہ کرتا ہو؟.....کبھی آپ اکیلے میں اس کے ساتھ بیٹھیں تو اس کی باتوں کا وزن محسوس نہیں ہوتا، اس کے علم کے بارے میں ذرا بھی گمان نہیں ہوتا کہ اس کا علم اور دانائی آپ سے زیادہ ہے۔

.....نہ اس سے مل کر خدا یاد آئے نہ کوئی مثبت احساس جاگے۔ ہم لوگوں کی عزت کسی وجہ سے کرتے ہیں بغیر وجہ کے نہیں۔ لوگوں سے محبت بھی کسی وجہ سے ہوتی ہے بغیر وجہ کے نہیں ہوتی۔

آپ کے پاس کیا خوبی ہے کہ کہ لوگ آپ سے محبت کریں؟

آپ کے پاس کیا خوبی ہے کہ کہ لوگ آپ سے محبت کریں؟ یہ طے آپ خود کرو گے، یہ کوئی اور طے نہیں کرسکتا۔ نہ حکومتی افسران اور نہ ہی پرائیویٹ اداروں کے سربراہ یہ طے کرسکتے کہ آپ کے اکاؤنٹ میں وہ کیا کیا خوبیاں ہونی چاہیے جو آپ اپنے طالبعلموں کو دے سکیں۔ خالی اکاؤنٹ کے چیک لکھ لکھ کر کسی کو نہیں دیے جاسکتے۔ کوئی خوبی ہوگی تو ہی دی جاسکے گی۔ میں ابھی آپ کو دس بیس، تیس طریقے بتا بھی دوں کہ یوں خود اساتذہ کی تربیت اعلیٰ درجے کی ہوسکتی ہے، یوں وہ اپنے بچوں کی تربیت کرسکتے ہیں لیکن اگر آپ کے اپنے دل میں، ذہن میں ہی کچھ نہیں ہے دینے کو، سوال یہ ہے کہ پھر بچوں کو دیں گے کیا؟

آپ کا دل ہی واضح اور کلیر نہیں ہے،

آپ کی سوچ اور آپ کا عقل ہی یکسو نہیں ہے،

علم نافع کے بارے میں اقدار، خوبیوں، عادتوں، صلاحیتوں، رویوں، خواہشوں، اور خوابوں کے بارے میں تو آپ ان کو دیں گے کیا اور اگر آج کا دن ہی نمٹانے اور چلانے پر ہی غور کرتے ہیں کوئی اور بات نہیں سوچتے۔ تو ظاہر ہے یہ زندگی اتنی چھوٹی تو ہے نہیں۔

علم کی بات کیا کرو، علم سے سینے بڑے ہوتے ہیں:

حضرت علیؓ پر اللہ رحم کرے، اللہ ان سے خوش رہے، وہ کہا کرتے تھے

''جب آپس میں ملا کرو تو علم کی بات کیا کرو، علم سے سینے بڑے ہوتے ہیں، علم سے دل بڑے ہوتے ہیں اور علم کا ذکر آپس میں نہیں کرو گے تو تمہارے سینے سے علم جاتا رہے گا''

کبھی سوچئے گا کہ دن بھر آپ کے پاس بچے آتے ہیں یا استاد، کلاسوں کے درمیان میں یا کلاسوں کے بعد تو کتنے ہفتوں سے آپ نے ان سے کوئی بڑی عمدہ اور اچھی بات نہیں کی ہوتی، کوئی علمی بات نہیں کی ہوتی، شائد ہفتے کم ہوں، کتنے مہینوں سے آپ نے کوئی اچھی بات ان سے نہیں کی ہوتی۔ آپ نے کتنے عرصے سے ان کو یہ تک نہیں بتایا ہوتا کہ آپ نے کوئی اچھی کتاب پڑھی ہے جو شیئر

کرنے کے قابل تھی؟ اسمبلی میں، اساتذہ کی میٹنگ میں، کلاس روم میں۔ لوگوں کے درمیان اگر آپ کے پاس اپنا کچھ بنیادی اور یجنلOriginal خیال نہیں ہے کہنے کو کوئی بات نہیں ہے تو آپ کسی کو کچھ بتا نہیں سکتے، کچھ سمجھا نہیں سکتے۔

لاہور کا ایک بڑا اسکول ہے پرائڈ پبلک سکول اینڈ کالج رائے ونڈ روڈ پر ٹھوکر سے ذرا آگے، چند برس قبل اس کے جلسہ تقسیم انعامات پر ہم لوگ گئے ہوئے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تعلیم وتحقیق کے صدر شعبہ بھی وہاں آئے ہوئے تھے۔ پروگرام ابھی شروع نہیں ہوا تھا اور ہم خوش گپیوں میں مصروف تھے میں نے موقع غنیمت جانا اور ڈاکٹر منور صاحب سے پوچھا کہ سر یونیورسٹی میں آپ کتنے عرصہ سے ہیں تو انہوں نے کہا کہ 20 سال سے میں یونیورسٹی میں ہوں، میں نے ان سے پوچھ ڈالا کہ کبھی آپ نے سنا یا محسوس کیا کہ ان 20 سالوں میں کتنے لڑکوں لڑکیوں نے بطور استاد آپ سے محبت کی ہوگی۔

انہوں نے تڑپ کر جواب دیا "کسی ایک نے بھی نہیں"

پھر وہ لمحہ بھر کو رکے سوچا اور بولے "یہ محبت وغیرہ تو سکولوں میں ہوتی ہے ٹیچروں سے۔ کالجوں میں نہ ٹیچروں کو غرض ہوتی ہے نہ لڑکوں کو غرض ہوتی ہے۔ سرکاری یونیورسٹیوں میں البتہ ٹیچروں کو تنخواہ اور ترقی کی زیادہ فکر ہوتی ہے اور لڑکوں کو ڈگری کا لالچ ہوتا ہے، اللہ اللہ خیر صلا۔"

تنخواہ دار ملازموں سے کام لیتے ہیں محبت نہیں کرتے:

20 سال تک یونیورسٹی میں پڑھانے کے بعد اگر ایک استاد کا وژن یہ ہے سوچ کا انداز ایسا ہے تو آپ سوچیں کہ انہوں نے اپنے بچوں کو طالبعلموں کو کیا دیا ہوگا؟ سوائے وقت پورا کرنے اور تنگ کرنے کے، توجب دیا کچھ نہیں، جب ان کی زندگی کو کامیاب بنانے، خوبصورت بنانے، شخصیت کو بہتر کرنے میں کردار کوئی نہیں تو کوئی پھر کیوں یاد کرے گا۔ کیوں محبت کرے گا۔ ہم نے تو یہی دیکھا اور سنا ہے کہ تنخواہ دار ملازموں سے کام لیتے ہیں محبت نہیں کرتے

مجھے اچھی طرح یاد ہے گزشتہ سال ۲۰۱۳ میں ایک پروفیسر صاحب فوت ہوئے، سائیکالوجی

پڑھاتے تھے۔ ساری عمر اللہ کا انکار کرتے رہے۔ ایف سی کالج میں رہے، گورنمنٹ کالج میں رہے، ایم اے او کالج میں رہے، کل 11 لوگ تھے ان کے جنازے میں ۔ اور ان گیارہ کے گیارہ کو پتا نہیں تھا اب کرنا کیا ہے۔ پھر غور کر کے اس کو اٹھایا اور قبر میں اوپر سے نیچے گرا دیا، ان میں اس کا سگا بیٹا بھی شامل تھا۔

دو بار تو قدرت یہ موقع سب کو دیتی ہے:

جو زندگی بھر آپ نے سرمایہ کاری یا انویسٹمنٹ کی ہوتی ہے وہی واپس ملتی ہے کچھ جمع تفریق ہو کر۔ اب زندگی آپ سے وہی کرتی ہے جو آپ اس کیساتھ کرتے رہے تھے۔ تب نہ تو گلہ کیا جا سکتا ہے نہ شکوہ، آپکا شکوہ سننے والا ہی کوئی باقی نہیں ہوتا، شکوہ کرنے والے پیچھے کہیں زمین کے نیچے چلے جاتے ہیں، آپ اس کا نظارہ کرنا چاہو تو دو مواقع پر قدرت یہ سب کو یاد دلاتی ہے، ایک جب آپ کا ٹرانسفر ہوتا ہے اور دوسرا جب آپ ریٹائر ہوتے ہیں، اگر تو یہاں وہاں کہرام مچا ہو، بچے رو رہے ہوں، والدین جمع ہوں، شاندار دعوت کا اہتمام ہو، تحفہ مل رہا ہو تو اس کا سیدھا سیدھا مطلب یہ ہے کہ آپ شاندار وقت گزار کر جا رہے ہیں۔

آپ کسی گڈریئے سے کیسے کم ہو سکتے ہو:

آپ وہ کمال لوگ ہیں جن کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ اصل میں تو یہ استاد لوگ گڈریئے ہوتے ہیں۔ ہمارے آپ کے پیارے اللہ میاں کو بھی خوب سوجھی کہ پہلے تو سارے نبیوں کو بھیڑیں ،بکریاں چرانے پر لگایا اور پھر ہمیں آپ کو دکھا کر سمجھایا کہ میں نے جو تمام امتوں کے نبی بنائے یا یوں کہیے کہ تقریبا تمام امتوں کو بھیڑیں اور بکریاں چرانے والے جو نبی دیئے تو کیا تم نے کبھی غور نہیں کیا کہ بھیڑیں اور بکریاں چرانے والا جو گڈریا ہوتا ہے، اس کے ہاتھ میں ایک ڈانگ ہوتی ہے اور بھیڑیں اور بکریاں ایسی جنس ہیں کہ جس چیز سے منع کروانہوں نے ادھر ہی جانا ہوتا ہے، جس کھیت سے روکو اسی کا رخ کرنا ہوتا ہے یہاں تک کہ آپ روک لو، پیار کرو، گود میں بھر لو اور سمجھاؤ جونہی چھوڑو گے تو جس پھول سے منع کرو گے اسی کو جا کر منہ ماریں گی ۔ جیسے ادھر ہی کا رخ کرنا ان پر

واجب رہا ہو۔ پھر گڈریا غصے میں آ جاتا ہے، اپنی ڈانگ کو اُٹھاتا ہے مگر وہ جانتا ہے کہ اگر میں نے زور سے ماردی تو کسی نہ کسی شریر کی کمر ٹوٹ جائے گی۔ یاد رکھیے کسی بھی گڈریئے کے ریوڑ میں کبھی بھی کوئی ٹوٹی ہوئی ہڈی والی بھیڑ نہیں ملتی، اگر وہ توڑنا چاہتا تو شام تک تین چار کی ہڈیاں تو روز ہی توڑ چکا ہوتا۔ ایک تھکے ہارے گڈریئے سے دو چار کی ٹوٹی ٹانگوں کی تو روزانہ توقع رکھنی چاہیے تھی۔ آپ کسی گڈریئے سے کیسے کم ہو سکتے ہیں اگر جو اپنے شاگردوں کو ریوڑ کی بھیڑیں ہی سمجھا ہوتا۔

یہ جو اخباروں میں خبریں آتی ہیں کہ فلاں تعلیمی ادارے میں استاد نے شاگرد کو سنگل باندھ کر مارا اور پنکھے سے باندھ کر مارا، تھپڑ مار کر آنکھ نکال دی۔ بے شک یقین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ایسا ہمارے ملک میں کیسے ہو سکتا ہے جبکہ ایسا ہو چکا ہوتا ہے، اللہ معاف کرے پتہ نہیں کہاں سے ہمارے اپنے اساتذہ میں یہ اس قسم کے ظالم گڈریئے پیدا ہو گئے ہیں جو اپنے ہی بچوں سے یہ ناروا سلوک روا رکھتے ہیں، وہ ان بچوں کی یادوں میں کیا بن کر جیتے ہیں اور کیا بن کر جینے کے آرزومند ہوتے ہیں جو بچوں کو ایسے پڑھاتے ہیں۔

خدا کا شکر کریں آپ ویسے نہیں، آپ تو وہ خوش بخت ہو کہ جو جانتے ہو کہ کتنا بڑا کام کر رہے ہو تو بڑے کام کرنے والوں میں کچھ بڑے وصف بھی تو ہونے چاہیں۔ کچھ بڑی خوبیاں ایسی ضرور ہونی چاہئیں کہ جو باقیوں میں نہ ہوں۔

ہمارا دل ہی آمادہ نہیں ہوتا:

اس بات کا تو آپ کو بھی خوب گمان اور اندازہ ہے کہ روزانہ سکول آتے ہوئے اگر نیت نوکری کا ایک اور دن پورا کرنے کی ہے تو اس کا اجر تو مل کر رہنا ہے۔ اور اگر آتے ہوئے کبھی آپ کے من میں تھوڑا سا روشن دان والا روشن خیال چمک اٹھے تو اللہ کے مہربان نبی ﷺ نے اس کا اجر کچھ اور بتایا تھا...

ویسے تو اللہ کے پیارے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ "جب تم علم کے لیے گھر سے نکلتے ہو تو تمہارے راستے میں فرشتے پر بچھاتے ہیں"۔

فرشتوں کے پروں پر چل کے سکول آنا اور جانا یہ بڑا لذت والا کام ہے۔ چونکہ ہم اس کو مانتے ہی نہیں ہیں کیونکہ ہمارا دل ہی آمادہ نہیں ہوتا کہ میں اور اتنا بڑا کام اور اتنی اچھی نیت، نہیں، نہیں یہ نہیں ہوسکتا، یوں ہم کو وہ خوشی بھی نہیں ملتی جو خالق نے ہمارے لیے رکھی تھی۔

فائدہ انہیں کو ہوتا ہے جو فائدہ لینا چاہتے ہوں:

ہم کمال لوگ ہیں اصل میں ہمیں سب پتا ہوتا ہے، ہم دوسروں کو بڑے شوق سے بتا سکتے ہیں، قائل کر سکتے ہیں، خود ہمیں کوئی سمجھانے آئے تو بڑی مشکل کا سامنا ہوتا ہے۔ سننا اور بیٹھنا مشکل محسوس ہوتا ہے، ہمیں پہلے جمائیاں آتی ہیں پھر انگڑائیاں آنے لگتی ہیں، اس کے بعد 100،100 طرح کے اعلیٰ درجے کے خیال آتے ہیں جیسے رمضان المبارک میں تراویح پڑھتے ہوئے ہوتا ہے۔ اکثر ہم سلام پھیر کر پوچھتے ہیں یار کتنی رکعتیں ہوگئیں ہیں۔ یقین کا معاملہ ہوتا ہے شائد کہ مولوی صاحب کی گنتی اچھی ہے میری توجہ نہ بھی ہوئی تو وہ سنبھال لیں گے۔ اسی دوران ہم پورے پورے سوالات وہیں حل کر لیتے ہیں۔ جن لوگوں کو خط لکھنے ہوتے ہیں، ان کو خط لکھ ڈالتے ہیں۔

میرے یونیورسٹی میں پڑھنے کے دوران راشد نسیم صاحب جمعیت کے ناظم اعلیٰ تھے، وہ کراچی کے رہنے والے تھے ایک بار دورے سے لاہور واپس آئے رمضان المبارک شروع ہو چکا تھا، انہیں قرأت سننے کا بڑا شوق تھا تو میں نے ان سے کہا کہ جامعہ اشرفیہ میں قرأت بہت اچھی ہوتی ہے۔ وہاں چلتے ہیں تو ان کو لے کر میں وہاں چلا گیا۔ تراویح پڑھنا شروع ہوئے، شاید آٹھ دس تراویح پڑھی ہوں گی کہ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے قریب والا کوئی نمازی مجھے کہنیاں مار کر تنگ کر رہا ہے میں نے ناگواری سے اپنی بند آنکھیں کھولیں تو راشد نسیم صاحب کی آواز آئی ''اختر بھائی سلام پھیریے، تراویح مکمل ہوگئی ہیں''

اور ہم خود اس وقت سوئے رہ جاتے ہیں:

انہوں نے واپسی پر مجھے بہت چھیڑا کہ ہاں ہاں کتنی اچھی قرأت ہوتی ہے یہاں، ماشاءاللہ خوب نیند آور ہے کہ پورا وقت تم بیٹھے سوتے رہے، میں نے شرمندگی سے کہا اصل میں یہ یقین کا

مسئلہ ہے مجھے اپنے مولوی صاحب کی قرأت پر یقین تھا اور رکعتوں کی گنتی پر بھی کہ وہ ہرگز گڑبڑ نہیں کریں گے۔

اساتذہ میں بھی اکثر یہ یقین کا مسئلہ ہوتا ہے کی ہم سب جانتے ہیں، ہم دوسروں کو بھی بتانا چاہ رہے ہوتے ہیں جیسے مجھے پتا تھا کہ وہاں اچھی قرأت ہوتی ہے۔ بہت اعلیٰ قرأت ہوتی ہے، تراویح بڑے مزے کی ہوتی ہیں۔ مہمان تو خوش ہو کر آتا ہے کچھ حاصل بھی کر لیتا ہے اور ہم خود اس وقت سوئے رہ جاتے ہیں اور سوئے ہوئے بندے کو کسی علم اور قرأت سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہم سب کے ساتھ یہ واقعہ ہوتا ہے کبھی ہم یاد رکھتے ہیں کبھی بھول جاتے ہیں اور جن کو یاد رہتا ہے وہ فائدے میں رہتے ہیں۔ اور فائدہ انہی کو ہوتا ہے جو فائدہ لینا چاہتے ہوں جو فائدہ لینا نہ چاہیں تو ان کو کوئی دھکے سے لقمہ نہیں کھلا سکتا چاہے وہ لقمہ پراٹھے کا ہو، مٹن کا ہو، مچھلی کی بوٹی کیوں نہ ہو، ہم ادھر سے اُدھر گھماتے رہتے ہیں۔ حلق سے نیچے نہیں جانے دیتے۔ تقریروں کی لذت منہ تک ہے، زبان تک ہے اور بس۔ لذت حلق سے نیچے جائے گی تو آپ کے جسم کا، آپ کے دل کا، آپ کے ایمان کا حصہ بنے گی۔

جب آپ کسی طالب علم کو ڈانٹ ڈپٹ کر رہے ہوتے ہیں، اس سے محبت نہیں کر رہے ہوتے اور اس کے بارے کچھ غصے سے سوچ رہے ہوتے ہیں تو محبت اور معافی کا لقمہ اس وقت تک حلق کے نیچے نہیں گیا ہوتا، وہ لقمہ نیچے کہیں جائے گا تو بات بنے گی۔

اگر تم پوری دنیا کے خزانے دے کر میرا کتب خانہ لینا چاہو تو:

یہ جو لارڈ میکالے کو ہم سب باجماعت برا بھلا کہتے ہیں ہم نے اسے دیکھا بھی نہیں ہے۔ شکل بھی نہیں دیکھی، فوٹو بھی نہیں دیکھا کہ وہ کیسا آدمی تھا، حد یہ ہے کہ کبھی اس کو پڑھا بھی نہیں کہ اس کے سارے کام کے پیچھے کیا سوچ کار فرما تھی۔ اس نے اپنی قوم کے وفادار پیدا کرنے والا ایک عمدہ تعلیمی نظام تجویز کیا جو پاکستان بننے کے سات دہائیوں کے بعد بھی نتائج دے رہا ہے۔ اس نے اپنی ذہانت سے آپ کا پورا تعلیمی سسٹم اس طرح بدل کر رکھ دیا کہ ستر سال کے بعد بھی ہمارے ہر طرح

کے ماہرین اس کو برا بھلا کہہ کر فارغ ہو جاتے ہیں اور خود ایک آزاد قوم کی ضرورتوں کے مطابق تعلیمی نظام بنانے، بدلنے اور تشکیل دینے میں مکمل طور پر ناکام رہے ہیں۔ ثابت ہوا کہ کسی کو برا بھلا کہنے سے نہ نظام بنتے ہیں اور نہ ہی بدلتے ہیں۔ اس کے لیے الگ صلاحیتوں اور واضح سوچ کی ضرورت ہوتی ہے۔ لارڈ میکالے نے اپنی قوم سے محبت کا لقمہ حلق سے نہ صرف نیچے اتارا بلکہ اپنی روح کا حصہ بنالیا ہم آج تک اس کیفیت سے محروم ہیں۔ اسی لارڈ میکالے کے علم سے شغف کا عالم یہ تھا کہ وہ کہا کرتا تھا:

''اگر تم پوری دنیا کے خزانے مجھے دے کر مجھ سے میرا کتب خانہ لینا چاہو تو سوچنا بھی مت کہ میں اس دولت کے بدلے یہ تمہیں دے دوں گا۔''

دو سالوں میں 80 شاندار عربی کتابوں کا ترجمہ کر ڈالا:

اٹلی میں ایک استاد اور محقق الجیراڈ کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پوری دنیا کے یہ جتنے پڑھے لکھے گورے Whitemen ہیں، یہ ان سب کا استاد ہے، بلکہ استادوں کا استاد ہے۔ وہ وہاں سے سپین گیا، سپین میں مسلمانوں کے تعلیمی ادارے تھے۔ ان کے اساتذہ سے پڑھا۔ وہاں اس نے عربی سیکھی۔ اس نے دو سالوں میں مسلمانوں کی ہر اہم کتاب کا مطالعہ کر ڈالا۔ البیرونی سے لے کر الفارابی تک ہر کتاب پڑھ ڈالی۔ پھر وہ بیمار ہو گیا اور بیمار بھی ایسا کہ ڈاکٹروں اور حکیموں نے زندگی کے کل دو سال بتائے وہ بھی مکمل آرام کی صورت، اس دوران اس نے عالم عرب سے ہر اہم کتاب منگوا کر گھر میں جمع کر لی اور دنیا تب یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ جب یہ پتا چلا کہ ان دو سالوں میں اس نے 80 شاندار اور بہترین عربی کتابوں کا ترجمہ کر ڈالا۔ اس کی زندگی کا جب آخری مہینہ تھا تو اس کے حکماء نے کہا تھا کہ تم بیمار ہو۔ اب آرام کرو تم یہ ادویات کھاؤ۔ بہت محنت کر لی تم نے، کسی استاد سے مت ملنا، کوئی کتاب مت پڑھنا۔ جب کچھ دنوں کے بعد وہ حکیم اس سے ملنے واپس آئے تو پتہ چلا کہ وہ مزید کئی کتابوں کا عربی سے انگریزی میں ترجمہ کر چکا ہے۔ اس سے کہا گیا کہ یہ کیسا پاگل پن ہے تو اس نے کہا کہ یہ پاگل پن نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں نے یہ ترجمہ نہ

کیا تو کوئی اور نہیں کر سکتا اور میری قوم کے بچے اس نعمت سے، اس بھلائی سے اور اس علم سے محروم رہ جائیں گے۔ اس کو آج بھی دنیا کا سب سے بڑا ترجمہ نگار مانا جاتا ہے۔ اس کے فوت ہونے کے برسوں بعد بھی لوگ اسے، اسکی خدمات کو یاد رکھے ہوئے ہیں۔ گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں اس کا نام جگمگا رہا ہے۔

جب تم نہ رہو تو لوگ تمہیں یاد کر کے روئیں:

حضرت علیؓ کہا کرتے تھے کہ جب تک زندہ رہو اس طرح زندگی بسر کرو کہ لوگ تمہیں یاد کر کے خوش ہوں۔ تمہارا ہونا ان کے لیے خوشی کا باعث ہو اور جب تم نہ رہو تو لوگ تمہیں یاد کر کے روئیں۔ جب شاگرد آپ کے ہاتھ سے تیار ہو کر زندگی میں آگے نکلتے ہیں، سکول سے فارغ ہو کر جاتے ہیں وہ صرف شاگرد نہیں ہوتے، آپ کے ہاتھ سے لگائے ہوئے پودے ہوتے ہیں۔ آپ کے اپنے ہی بیٹوں جیسے ہوتے ہیں۔ آپ کی خوشی غمی ان کو محسوس ہونی چاہیے، انہیں یاد رکھنی چاہیے کہ آپ کیسے اچھے استاد تھے، کیسے عمدہ اور اعلیٰ انسان تھے۔ ایک بہت اعلیٰ انسان کو آپ بھی جانتے ہیں اُن کا نام نعمان بن ثابت تھا۔ تاریخ میں اُنہیں ایک فقہ کا امام ہی نہیں دو باکمال شاگردوں امام ابو یوسف اور امام محمد کے اُستاد کے طور پر بھی یاد کیا جاتا ہے۔

امام ابو حنیفہؒ سے کسی نے اچھے استاد کا پوچھا تھا:

امام ابو حنیفہؒ سے کسی نے پوچھا کہ استاد کیسا ہوتا ہے؟ کہا اچھا استاد دیکھنا ہے تو تب دیکھو جب وہ دوسروں کے بچوں کو پڑھا رہا ہو اگر تو تمہیں یوں لگے کہ جس محبت اور لگن سے وہ اپنے بچوں کو پڑھا رہا ہے وہ اُس کے اپنے ذاتی بچے ہیں۔ تو وہ اچھا استاد ہے، اگر اس سے ہٹ کر کچھ کر رہا ہے تو وہ اچھا استاد نہیں ہے۔ اس عظیم استاد امام ابو حنیفہ کے قلم کی جو بچی ہوئی سیاہی تھی اس سیاہی سے ان کے شاگرد امام ابو یوسف نے اپنے استاد امام حنیفہؒ پر کتاب لکھی۔

ہماری تاریخ میں کتنے ہی ایسے عمدہ اور اعلیٰ استاد گزرے ہیں کہ جن پر فخر کیا جا سکتا ہے، ایک استاد ایسے بھی ملتے ہیں کہ جن کا نام امام جوزی تھا، وہ جس قلم تراش کی مدد سے اپنے قلم کو تراشتے

تھے۔اُن کا تراشہ محفوظ کر لیتے تھے۔ اس کی مقدار اتنی تھی کہ جب وہ فوت ہوئے تو ان کو نہلانے کے لیے گرم کیے جانے والے پانی کے لیے وہ کافی تھا۔

ایک اور بڑے استاد تھے ان سے کسی نے کہا آؤ بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہیں۔ اس نے کہا کہ ٹھہرو میں اس دوست کی بات سن کر گپ شپ کر لوں پھر تم آگے چلنا۔ سورج رکتا ہے کیا کسی کے انتظار میں؟ عبداللہ بن مالکؒ جیسے استاد، استادوں کے استاد یہ وہ سارے لوگ ہیں جو استادوں کے استاد ہیں جن کے استاد، پھر ان کے ساتھ شاگرد، اپنے اپنے عہد کے پرنسپل ہیں سارے۔ ان کے ناموں کے ساتھ صرف ٹیگ لگا ہوا نہیں تھا۔ ان کے دفتروں کے باہر صرف پھٹیاں لگی ہوئی نہیں تھیں۔

عبداللہ بن مبارکؒ نے ایسا علم پہلے کب سیکھا تھا:

عبداللہ بن مبارکؒ بہت مشہور استاد ہیں۔ تاریخ میں جہاں جاتے، پڑھاتے، لوگوں کو اچھی باتیں بتاتے، ان کے منہ سے جو بات نکلتی وہ علم کا، فہم کا، تدبر کا خزانہ ہوتا، سفر میں تھے تو جنگل میں اتفاق سے انہیں ایک بچہ نظر آیا، 8،9 سال کا، رکے، دل میں دکھ سا محسوس ہوا کہ کاش یہ بچہ شہر میں ہوتا، میرے مدرسے میں ہوتا، میرے سکول میں ہوتا تو میں اسے کچھ پڑھا لیتا۔ بڑے پیار سے کہا'' اتنے بڑے ہو گئے ہو کچھ پڑھا، کچھ سیکھا؟

بچے نے بڑے لحاظ اور احترام سے جواب دیا

'' اے بزرگ محترم! میں نے زیادہ تو نہیں سیکھا البتہ چار باتوں کا علم سیکھا ہے۔ پوچھا کیا؟

کہا ایک زبان کا علم، ایک دل کا علم، ایک کانوں کا علم اور ایک آنکھوں کا علم۔ بچے کی بات سن کے ٹالا جا سکتا تھا۔ استاد تھے رکے، حیرت سے کہا، یہ کون سا علم ہے؟ میں نے پہلے کبھی نہیں سنا۔ اس نے کہا دل کا علم یہ ہے کہ جس نے دیا ہے اسی کے لیے دھڑکے، اور آنکھ کا علم یہ ہے کہ جس نے دی ہے اسی کے نظارے دیکھے، اور وہ دیکھے جو وہ دکھانا چاہتا ہے اور وہ نہ دیکھیں جو وہ دکھانا نہیں چاہتا۔ جس جس منزل سے، جس جس چیز سے اس نے روکا کہ یہ نہیں دیکھنی تو آنکھ اسے کیوں دیکھے؟

پھر اس نے کہا کان کا علم یہ ہے کہ وہی سنے جو وہ سنانا چاہتا ہے۔ وہ کیوں سنے جو اسے ناپسند ہے۔ زبان کا علم یہ ہے کہ اس سے وہی ادا ہو جو اس کے مالک اور خالق کو پسند ہے۔ عبداللہ بن مبارکؒ کی دھاڑیں نکل گئیں۔ اس بچے کو دیکھا اور کہا کہ تو نے آج مجھے کچھ نیا سکھا دیا ہے۔ جب وہاں سے روانہ ہوئے تو اس نے پیچھے سے آواز دی اور بولا بزرگو آپ عالم لگتے ہو، استاد محسوس ہوتے ہو، ایک بات یاد رکھنا کہ اگر دنیا کو راضی رکھنے کے لیے سیکھا تو اللہ سے کوئی توقع نہ رکھنا اور اگر اللہ کے لیے کیا ہے تو مخلوق سے کوئی توقع نہ رکھنا۔'' عبداللہ بن مبارک کہتے ہیں ایسا علم میں نے پہلے کب سنا اور سیکھا تھا۔ آپ غور کریں تو بہت سیدھا سیدھا اصول اور ضابطہ بیان ہو گیا ہے جو بطور استاد عمر کے ہر حصے میں کام آ سکتا ہے۔

سیکھنا تو ہر عمر میں ہوتا ہے، جیسے جیسے آپ بڑے ہوتے جائیں گے، جیسے جیسے عمر بڑھتی جائے گی، جیسے جیسے آپ کا مرتبہ اور مقام بڑھتا جائے گا۔ ویسے ویسے آپ کا سیکھنے کا عمل بڑھتا جائے گا۔

دنیا بھر کے جو بڑے ادارے ہیں جنہیں کامیاب ترین بزنس انسٹیٹیوٹ کہا جاتا ہے۔ آج وہ اپنے نام کے ساتھ Learning Organization لکھتے ہیں۔ جس کے ساتھ نہیں لکھا ہوتا لوگ اسے اچھا نہیں جانتے، جو سیکھتا ہے وہ زندہ رہتا ہے، جو سیکھتا ہے وہ بہتر ہو جاتا ہے۔ بطور استاد آپ بھی تو ایک ادارہ ہو آخر آپ کی شخصیت کے ساتھ کیوں نہیں لکھا جاتا کہ یہ بھی ایک لرننگ اورگنائزیشن ہے۔ جو مسلسل سیکھتی ہے اور آگے بڑھتی ہے۔

بیٹا! بکریاں نہیں بدلتیں، انسان بدلتے ہیں:

ہم بیس تیس سال قبل ہم اپنے گاؤں ۲۰۹ مراد ہرن مائنر ضلع بہاولنگر جایا کرتے تھے۔ کبھی چار کبھی چھ سال بعد۔۔ ایک بار سکولوں میں چھٹیاں تھیں اور ہم گاؤں پہنچے، ان دنوں ہمارے دادا جی کے گھر ایک بکری نے بچے دیئے ہوئے تھے۔ براؤن کلر تھا بچہ، مجھے ابھی یاد ہے ہم نے اس کا نام گونی رکھا۔ بے حد کیوٹ سا بچہ تھا، ہمارے ساتھ چارپائی پر بیٹھ جاتا، صاف ستھرا بھی تھا۔ بچہ بکری کا ہو، ہاتھی کا ہو یا انسان کا پیار سے سیکھ جاتا ہے۔ یہ سب پیار کی زبان سمجھتے اور اس رنگ میں جلدی

ڈھل جاتے ہیں۔ جس رنگ میں ہم انہیں ڈھالنا چاہیں۔ ہفتہ دس دن وہ ہمارے ساتھ رہا، جمپ لگا کر اس چارپائی پر بیٹھ جاتا جہاں ہم بیٹھتے ہوتے، اس دوران اس نے چارپائی ایک دفعہ بھی گندی نہ کی۔ پھر ہم واپس آ گئے، کئی برس کے بعد جب دوبارہ جانے کا اتفاق ہوا تو اسی بکری کے بچے وہاں گھوم پھر رہے تھے تو ہماری بہن نے، چونکہ ہم شہری لوگ ہیں، ہمارا سوچنے کا زاویہ اور ہوتا ہے بڑی معصومیت سے دادا سے پوچھا

''میاں جی! یہ وہی گونی ہے ناں؟

تو دادا جی بے اختیار ہنس پڑے اور کہنے لگے ''نی کڑیے! یہ گونی نہیں اس کی 12 ویں نسل ہے''

بہن نے حیرت سے کہا ''میاں جی! یہ تو بالکل ویسی ہے جیسی گونی تھی''

دادا جی نے بڑی محبت سے کہا ''بیٹا بکریاں نہیں بدلتیں انسان بدلتے ہیں''

انسان سیکھتے ہیں اسی لیئے اللہ جی ان کو انسان بناتا ہے، نہ ہاتھی بدل سکتا ہے، نہ گینڈا بدل سکتا ہے، نہ ہی شیر بدل سکتا ہے۔ کبھی کسی شیر کو مونچھیں داڑھی لگائے نہیں دیکھا ہوگا، کبھی کپڑے پہنے ٹائی لگاتے نہیں دیکھا ہوگا، کبھی اپنے شوز پالش کرتے نہیں دیکھا ہوگا۔ یہ تو انسان ہیں جو سیکھتے ہیں اور بدلتے ہیں جب ہم انسان بہتر ہونا چاہ رہے ہوتے ہیں تو سیکھتے ہیں اور بہتر ہو جاتے ہیں۔

شخصیت پر پڑے داغوں اور چھالوں کا علاج:

کچھ عرصہ قبل میں نے اپنے آفس کی دونوں سائیڈوں کو ہلکا میرون کلر کروایا، یہ سب کو بہت خوبصورت لگا۔ جس نے دیکھا اسے بھایا، اسکی تعریف کی۔ دو تین ماہ ٹھیک گذر ے پھر ایک روز دیکھا کہ ایک سائیڈ کی دیوار پر ہوئے رنگ میں چھالے سے پڑنے شروع ہو گئے ہیں۔ ان داغوں اور چھالوں کا علاج کروانا پڑتا ہے ان پر غصہ کرنے سے بات نہیں بنتی۔ سچی بات یہ ہے کہ ہر تعلیمی ادارے میں اساتذہ ہوں یا پرنسپل کیریئرز کے شروع میں بہت ان تھک متحرک اور مثبت جذبات سے بھرے ہوتے ہیں پھر وقت کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کی دیواروں پر بھی ایسے چھالے چاہے ان چاہے پڑ جاتے ہیں، نظر آنے لگتے ہیں، بدنما بھی لگتے ہیں یہ چھالے اصل میں آپ کے اندر آتی

فکری تبدیلیوں کے باعث شروع ہوتے ہیں لیکن وہ آپ کی نظر میں نہیں آتے جبکہ باقی سب کو نظر آنے لگتے ہیں۔ وہ جب بھی نظر میں آجائیں تو ان کو چھوڑ نہیں دیتے کہ یار کیا کریں رہنے دیتے ہیں ،کون؟ ان کو دوبارہ صاف کرے، یاد رکھیے ان کو پھر سے نئے رنگ کرنے پڑیں گے، صاف کرنا پڑتا ہے، ہم دوسروں کی اصلاح کے لیے تو ہمہ وقت تیار ہی رہتے ہیں البتہ اپنے بارے میں اکثر اتنے حساس نہیں ہوتے۔ جبکہ استاد پر ایک وقت میں کئی نگاہیں ہمیشہ لگی رہتی ہیں، آپ کے شاگردوں کی ،ساتھ کام کرنے والے اساتذہ کی،

والدین کی، سربراہ ادارہ کی، اگر اچھے کام پر آپ کی تحسین ہوتی ہے تو آپ پر سخت نظر بھی رہے گی، اس پر برا تو کبھی منانا ہی نہیں چاہیے۔ اپنی کمی کوتاہی اور غلطی سامنے آنے پر ناراض ہونے کی بجائے اسے دور کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔

ہر استاد کے پاس ایک اپنا ''جھاواں'' ہونا لازم ہے:

ہم جب چھوٹے تھے تو ہمارا گھر چشتیاں شہر کے ایک ایسے محلے میں تھا جہاں کمہاروں کی آویاں نظر آتی تھیں، ان کے ہاں ایک چھوٹا سا پتھر جیسا آئیٹم ہوتا تھا جسے ''جھانواں'' کہا جاتا تھا، یہ بڑی مفید چیز تھی، ہماری والدہ ہر چھٹی والے دن ہماری ''جھاواں کلاس'' خود لیتیں اور اس کھردرے پتھر کی مدد سے ہمارے پاؤں کی پھٹ جانے والی ایڑھیاں رگڑ کر ملائم کر دیا کرتی تھیں، یہ مرمت اگلے ہفتے بھر کے لیے کافی ہوا کرتی تھی، آج کل یہ جھاویں ایران سے بن کر آتے ہیں اور کافی خوش شکل ہوتے ہیں، وقت کے ساتھ ساتھ میں نے سیکھا کہ ہر خود شناس استاد کے پاس ایک اپنا ''جھاواں'' ہونا لازم ہے۔ جب جب آپ پرنسپل ہوتے ہیں، استاد ہوتے ہیں تو آپ کی ذات کے کچھ حصے ایسے ہو جاتے ہیں کہ جو دوسروں کو چبھتے ہیں تو آپ کو یہ جھاواں اسی موقع پر پورے اطمینان اور تسلی سے استعمال کر کے اپنی ذات کے ان گوشوں کو گول کر لینا چاہیے جو دوسروں کیلیے مشکل کا باعث بن رہے ہوتے ہیں۔ اپنی ذات کے کھردرے حصوں کو گول اور آرام دہ کرنا کوئی بہت آسان کام ہوتا نہیں ہے۔ مگر پھر بھی کرنا لازم ہوتا ہے۔ خوشدلی اور آمادگی سے کر لیں گے

تو عزت بھی بڑھے گی اور دلی اطمینان بھی۔ ہم دائیں بائیں سے جیسے جیسے ملائم ہوتے جاتے ہیں ویسے ویسے طلبہ، اساتذہ ان کے والدین اور خود ہمارے اپنے بچے ہم سے محبت کرنے لگتے ہیں۔

دعویٰ کے ثبوت دینے پڑتے ہیں:

اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں رب نے گواہی دی کہ اگر آپ ﷺ مہربان نہ ہوتے، اگر آپ ترش رو ہوتے، اگر آپ سختی سے بولنے والے ہوتے تو لوگ یوں نہ آپ سے محبت کر رہے ہوتے نہ آپ پر یوں فدا ہو رہے ہوتے۔ جو بات اور خوبی رب نے اپنے رسول ﷺ کے بارے میں بتائی ہے وہ ان کے ماننے والے ایک امتی اور استاد کیلیے کیونکر ضروری نہیں ہوگی۔

برسوں پہلے آپ گورنمنٹ کے پاس گئے کہ آپ کو استاد بنا دیا جائے، آپ نے دعویٰ کیا کہ میرے پاس ڈگری بھی ہے اور شوق بھی، اور یقین دلایا میں بہت عمدہ استاد ثابت ہوں گا، پھر آپ کی بات مان کر آپ کو استاد بنا دیا گیا۔ دیکھیں سکول میں آنے کے بعد اور یہاں کا پرنسپل بننے کے بعد اگر آپ یہ خود ہی طے کر لیں اور یہ سوچ لیں کہ I am the best & perfect teacher اور دلیل یہ ہو کہ میں تو اپنے معاشرے کے چنے ہوئے لوگوں میں سے ہوں اور مجھ سے بہتر آدمی اور مجھ سے بہتر استاد تو کوئی اور ہو نہیں سکتا، تو بڑی زیادتی ہو جائے گی۔ ابھی تک یہ دعویٰ ہے اور یاد رہے کہ دعویٰ کے ہمیشہ ثبوت دینے پڑتے ہیں۔ کسی کے کہنے سے کیسے مان لیا جائے کہ وہ ایک بہترین استاد ہے۔ جب تک اس نے اپنے عمل سے بار بار ثابت نہ کر دیا ہو، پرنسپل صاحب نے مان لیا ہو، اساتذہ نے دل پر پتھر رکھ کر تسلیم کر لیا ہو، طلبہ نے محبت سے اقرار کر لیا ہو کہ آپ کا دعویٰ درست ہے، آپ واقعی ایک عمدہ اور بہترین استاد ہیں تو پھر بات میں دم بھی ہو اور دعویٰ بھی درست مان لیا جائے گا۔ صرف آپ کے کہنے سے دعویٰ درست نہیں ہو جائے گا، ثبوت تو دینے ہی پڑیں گے۔

ایک روز کہیں سے ایک بھڑ دعویٰ لیکر آ گئی تھی:

سیانے کہتے ہیں کہیں پر پروانوں کا ایک محلّہ تھا۔ برسوں برس سے سارے پروانے وہاں پر رہتے تھے، ان کی زندگی بڑی اچھی گزر رہی تھی کہ ایک روز کہیں سے ایک بھڑ آ گئی۔ اس نے آ کر

پھریداروں سے کہا کہ میں بھی تمہارے جیسی ہوں، میرے بھی پر ہیں میرا دعویٰ درست مانو اور مجھے پروانہ سمجھ کر بستی کے اندر آنے دو تو ان پھریداروں نے کہا:

" دیکھو بات سنو! تمہارا وزن ہم سے تھوڑا زیادہ ہے اور تم ہم سے تھوڑی بھاری ہونے کے ساتھ ساتھ زیادہ چمکدار اور رنگ دار بھی ہو تو ہم اپنے بڑوں سے پوچھ کے آتے ہیں"

پروانوں کے بزرگ استاد نے کہا دعویٰ بڑا ہے کہ وہ ہم میں سے ہے ٹھیک ہے ہم اس کا دعویٰ مان لیں گے مگر پہلے ایک کام کرنا ہوگا۔ یہ جو نیا پروانہ ہم میں داخل ہونے جا رہا ہے، اس سے کہو کہ جاؤ جا کر ذرا شہر میں دیکھ کر آئے کہ کیا شام اتر آئی ہے، کیا بتیاں روشن ہو گئیں؟ اگر شام ہو گئی ہے تو ہم سب مل کر چلتے ہیں، اس کے اپنے ساتھ شامل ہونے کی خوشی مناتے ہیں۔ یہ سن کر بھڑ طنزیہ طور پر مسکراتی ہوئی اڑی اور تھوڑی دیر اٹھلاتی بل کھاتی اڑتی ہوئی واپس آئی، اور زور زور سے پکارنے لگی کہ جاؤ اپنے بڑوں سے کہو کہ میں تمہارے امتحان میں پاس ہو گئی ہوں، شہر سے جا کر خبر لے آئی ہوں کہ بتیاں تو روشن ہو گئیں ہیں، شام ہو گئی ہے اور جگہ جگہ سٹریٹ لائٹیں جل اٹھی ہیں، اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی پھریدار پروانوں کے قہقہے نکلنے لگے، انہوں نے ہنستے ہوئے کہا کہ ابھی ہمیں بڑوں کے پاس جانے کی ضرورت نہیں رہی۔ تم نے جو دعویٰ کیا تھا پروانہ ہونے کا تم اس کا ثبوت لانے میں بری طرح ناکام ہوئے ہو، تم اصل پروانہ ہوتے تو زندہ واپس کیسے آ جاتے، وہ پروانہ کیسے ہو سکتا ہے جو جل نہ جائے بلکہ اطلاع دینے واپس آ جائے؟

یہی استاد ہونے کے دعوے کا مضبوط جواب ہے:

تو جب ہم دعویٰ کرتے ہیں، کہ ہم پرنسپل ہیں، ہم استاد ہیں تو اس وقت تک ہمارا دعویٰ اس دعویدار بھڑ کی طرح ہی ہوتا اور رہتا ہے۔ جس دن آپ دفتر کی کرسی سے ہٹ کر لوگوں کے لیے پرنسپل بن گئے، سٹینڈرڈ بن گئے تو مانا جائے گا کہ آپ کا دعویٰ پورا ہو گیا۔ جب آپ کے آس پاس، آپ کے محلے میں، آپ کے شہر میں اور آپ کے گاؤں میں اور اس سے بھی آگے لوگ آپ کو نام سے جانیں، آپ کے طلبہ سے جانیں، آپ کے نتائج سے جانیں اور جن جن

بچوں سے آپ جڑے تھے جن کے زندگیوں کو آپ نے بہتر بنایا تھا، اب آپ ان کے گھروں میں گفتگوؤں کا مرکز اور محبتوں کے حقدار بن چکے ہیں، اپنے تعلیمی اداروں کے اساتذہ کے دلوں میں جگہ پا چکے ہیں، ان کے ساتھ باہم جڑے ہوئے ہیں، یہی ایک استاد کو زیبا ہے، یہی اسکے دعوے کا مضبوط جواب ہے۔

تشدد آمیز تصور والا شعر:

میں نے اپنے ایک سرائیکی دوست سے اساتذہ کی خودشناسی پہ کام کا تذکرہ کیا، اس نے پوچھا اس کا کیا فائدہ ہوگا؟ میں نے کہا اسے پڑھنے سے کم سے کم اساتذہ کی سوچ میں بہتری اور وسعت آئے گی۔ اسے کمزور خودشناسی کے نقصانات سمجھائے۔ مضبوط تصورِ ذات کے فوائد گنوائے۔ یہ سب سن کر وہ اچانک مسکرانے لگا۔ میں نے وجہ پوچھی بولا ایک شاعر نے کہا ہے۔

لالی اوہدے بلہاں دی
ایسی تیسی پھلاں دی

اب ہم دونوں ہی ہنس دیئے۔ شاعر کا تصور ذات کمزور نہیں، خاصا تشدد آمیز اور رومانی خیالات کو تہس نہس کر دینے والا تھا۔ آپ کو نہیں لگتا ہمارے آس پاس بسنے والے اکثر اساتذہ اسی کیفیت کا شکار رہتے ہیں۔ اُن کے لفظوں، لہجوں اور رویوں سے اپنے لیے معاشرے کے لیے اور اپنے طلبہ کے لیے غصہ ہی غصہ ہوتا ہے۔ بہت کم ہم نے اساتذہ کو اپنے اساتذہ کی مثالیں دیتے دیکھا یا اُن کو دعائیں دیتے دیکھا کہ جنہوں نے انہیں لکھنا پڑھنا سکھایا اور ایک اچھا استاد بنایا۔ جو شاگرد اس سوچ کو پالیتا ہے کل خود اُستاد بن کر اسی کا پھل کھاتا ہے۔ تاریخ نے ایسے کتنے ہی شاندار شاگردوں کا ذکر کیا ہے۔ جو خود اُستاد بنے تو امر ہو گئے۔

جب استاد اتنا بڑا ہو تو شاگرد کس درجے میں ہوگا؟

امام شافعی نے کہا 40 سال تک کوئی نماز میں نے ایسی نہیں پڑھی کہ جس میں، میں نے اپنے استاد کو دعا نہ دی ہو، شاگرد بھی امام اپنے زمانے کے اور جس استاد کی ہم بات کر رہے ہیں۔ وہ

استاد ہیں امام مالکؒ۔ آپ سوچیے جب استاد اتنا بڑا ہو تو شاگرد کس درجے میں ہوگا؟

یہ وہ استاد ہیں جو اپنے کو جاتے ہوئے مال و اسباب بھی ڈھیروں کی صورت دیا کرتے تھے۔ کہیں سے 100 گھوڑے آئے تھے اور امام شافعیؒ کو ایک پسند آیا تو انہوں نے سارے کے سارے دے دیئے۔ شاگرد تعلیم مکمل کر کے مکہ میں رہے تو بھی ان کا خرچ وہاں استاد کے پاس مدینہ منورہ سے آتا رہا، اور جب استاد محترم امام مالک فوت ہوئے تو امام شافعی روتے تھے اور کہتے تھے رونے سے ڈرتا ہوں کہ کہیں لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ چونکہ میرا رزق وہاں سے آتا تھا۔ اس لیے روتا ہوں کہ میرا وہ استاد اس دنیا سے چلا گیا ہے جس جیسا کوئی دوسرا نہیں ہے۔

استاد شاگردوں سے جانے جاتے ہیں اور سچ یہ ہے کہ اصل اُستاد پیروں جیسے ہوتے ہیں ہمیشہ یہی دیکھا ہے کہ پیر خود نہیں بنتا مرید پیر کو بناتے ہیں، میری نظر میں آپ سارے استاد پیر ہیں آپ نہ بھی مانیں، میں پورے دل سے مانتا ہوں، دنیا مانتی ہے۔ اب آپ بھی ایک خودشناس پیر بن کر دکھائیں تو بات بنے۔

اب آپ بھی خودشناس پیر بن کر دکھائیں تو بات بنے:

کہا جاتا ہے کہ ایک شاگرد، ایک مرید کو بڑے زوروں کی بھوک لگی جیب تقریباً خالی تھی کل دو روپے پاس تھے، سوچ سوچ کر یہی رستہ سمجھ آیا کہ پیر صاحب کے پاس جا کر لنگر سے پیٹ بھر کر کھانا کھایا جائے تو اپنے پیر صاحب کو ملنے چل پڑا۔ چلتا چلتا تانگے پر بیٹھا ایک روپیہ اسے دیا دوسرا روپیہ کشتی والے کو دیا۔ بھوکا پیاسا پیر صاحب کے پاس پہنچا تو پیر صاحب کو بڑی سی چارپائی پر لیٹے دیکھا۔ انہوں نے آمد پر بڑی خوشی کا اظہار کیا اور بڑے پیار سے کہا:

''ساڈا ابیٹا آیا، ساڈا مرید آیا، آجا میرا بچہ آجا''

پیر صاحب نے اسے اپنے ساتھ چارپائی پر بیٹھایا، اس کا حال احوال لیا اور پھر اپنی ٹانگیں آگے کر دیں اور کہا دباؤ اور جنت کماؤ۔ اب وہ غریب کا بچہ بھوک سے مر رہا تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا اس نے ٹانگیں دبانی شروع کر دیں۔ آدھا گھنٹہ گزرا، گھنٹہ گزرا، وہ پیر صاحب کی ٹانگیں دبائے اور بھوک

سے بلبلائے جا رہا تھا، اچانک پیر صاحب نے کہا:

''پُت تو وی جنتی، تے میں وی جنتی۔ آپاں دویں جنتی'' (تم بھی جنتی اور میں بھی جنتی)

مرید آپ سے کسی سرکاری سکول میں پڑھا ہوا نہیں تھا اس لیے اسے غصہ آ گیا کہنے لگا۔

''پیر صاحب مائنڈ نہ کریں۔ میں نے تو بھو کے پیٹ آپ کو دبایا ہے میرا جنتی ہونا تو بنتا ہے، عقل میں آتا ہے، آپ کس چکر میں جنتی ہو گئے؟'' پیر صاحب نے بڑی بے نیازی سے ٹانگیں واپس کھینچیں اور کہا'' لے بیٹا تو اب میری ٹانگوں کے بغیر کلا (اکیلا) جنت کما کے دیکھا''

تو آپ وہ پیر ہیں جو ٹانگیں دیتے ہیں، دبواتے ہیں، کام کرتے ہیں پڑھاتے ہیں تو نہ صرف خود کو بلکہ اپنے شاگردوں کو بھی جنتی بناتے ہیں۔ براہ کرم اب سکول جا کر حقیقت میں ٹانگیں دبوانا نہ شروع کر دیجئے گا۔ کہنا صرف یہ ہے کہ آپ جو کام کرنے کے لیے وہاں اپنے سکول گئے ہوئے ہیں یہ صرف نوکری نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ صرف بھوکے پیٹ پاؤں دبوانے جیسی بظاہر ایک غیر پیداواری حرکت ہے۔ آپ ایک بڑے ذہن ساز اور امت ساز کام پر متعین ہیں، کریں گے تو نتائج ویسے ہونگے اور نہیں کریں گے تو ظاہر ہے اس نعمت اور کامیابی سے محروم رہ جائیں گے۔ فیصلہ بھی آپ کا اور اپنے خود شناس استاد ہونے کے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے مضبوط ثبوت لانے کا مشکل کام بھی آپ کا۔ وہی طے کرے گا کہ آخر دلوں میں جگہ کیوں نہیں ملتی۔

☆.........☆.........☆

11

باب: یازدہم

آپ کیسے یاد رکھے جانا چاہیں گے؟

"اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ سے پڑھے ہوئے بچے ہمیشہ راہنمائی کے منصب پر جائیں، تو یاد رکھیئے۔ ان کی زندگیوں اور سوچوں کو جوش سے بھر دیں۔ پرجوش لوگ ہی زندگی میں قیادت کرتے ہیں۔ بڑے کام کرتے اور بڑا نام پاتے ہیں۔ ان بچوں کا ایک حلقہ بنائے رکھیں۔ نئے بچے آتے رہیں، پرانے جاتے رہیں۔ آپ انہیں اچھی تحریریں پڑھنا سکھائیں۔ اچھے لوگوں، اچھی کتابوں اور اعلیٰ خیالات سے ملائیں۔ مل کر خواب دیکھنے سے اجتماعی سوچ اور Collective wisdom پیدا ہوتا ہے۔ یہ عقل ودانش نصابی کتابوں کے اسباق اور اوراق سے نہیں ایک زندہ اور صاحب فہم استاد کے دم قدم سے ہوتا ہے۔ جو کلاس روم کے بعد بھی اپنی توجہ اور محبت کم نہیں ہونے دیتا اور ایک عمدہ نسل کی تیاری اور ان کے ذہنوں کی آبیاری کرتا رہتا ہے۔ اپنے علم کو تازہ رکھتا ہے۔ نئی کتابیں، نئے حوالے، نیا علم تلاش کرتا ہے۔ اخباری خبروں اور کالموں سے اپنی گفتگو اور اپنے دن کو برباد نہیں کرتا۔ علمی گفتگو اور علم دوستی کو اوڑھنا بچھونا بنانے والے کو کوئی کیسے بھلا سکتا ہے؟

کیا آپ ایک ایسا استاد بننے کا سوچ سکتے ہیں جو خود سے بھی پوری واقف نہ ہو؟ جس کی کل وقتی مصروفیت اُس کے بچوں کے لیے نہ ہو۔ اُس کا وقت طلبہ کی انفرادی کردار سازی میں نہ گزرے۔ اور نہ ہی کسی منفی سوچ کو ختم کرنے کی جستجو میں اس کا دل دھڑکے۔ کوئی ایسا استاد کیسے طلبہ کے دلوں میں دھڑک سکتا ہے؟ آیئے ایک شاگرد سے ملتے ہیں جس کی اپنے استاد کے لیے دی گئی گواہی کو تاریخ نے تسلیم کیا۔ وہ کہتے ہیں

"میں ایک زمانے تک ان کی خدمت میں آتا جاتا رہا ہمیشہ نماز پڑھتے ہی دیکھا، روزے کی حالت میں پایا یا پھر تلاوت کلام اللہ میں مصروف دیکھا۔ فیاضی وسیر چشمی ان پر ختم تھی۔ عفو و درگزر، حسن سلوک اور اساتذہ کی قدردانی میں ہمیشہ پہل کرتے"

یہ امام مالک کی گواہی تھی، وہی امام مالک جو عمر بھر مدینہ منورہ سے باہر نہ گئے کہ کہیں شہر نبی ﷺ سے دور زندگی کا چراغ گل ہی نہ ہو جائے۔ کبھی سواری پر نہ بیٹھے کہ مبادا یہاں سے آنحضورؐ پیدل گزرے ہوں۔ حدیث کے عالم ''موطا امام مالک'' کے مصنف و مرتب، اپنے استاد کے بارے میں۔ اسی محترم استاد کے لیے عمرو بن مقدام نے کہا

''ان پر نظر پڑتے ہی لگتا تھا کہ یقیناً خاندان ہاشمی کے چشم و چراغ ہیں، عبادت، ریاضت اور سخاوت میں وہ یکتا روزگار تھے۔''

''تہذیب التہذیب'' میں ان کا اپنا کہنا ہے۔

''مجھے جس قدر اپنے جد امجد حضرت علیؓ سے محبت ہے اتنا ہی اپنے نانا حضرت ابوبکرؓ کا احترام ہے۔''

یہ امام جعفرؒ صادق تھے۔ امام ابوحنیفہؒ کے دوست، ان کے علم اور فقہی فراست کے معترف، ایک روز اپنے شاگرد سے فرمانے لگے۔

''چار کاموں میں کسی بھلے مانس کو عار نہ ہونا چاہیے''

حاضرین نے بڑی توجہ اور اشتیاق سے دریافت کیا

''کون سے چار کام؟''

فرمانے لگے

''اول..... ماں باپ کی خدمت گزاری میں

دوم....... کسی کے لئے اپنی جگہ سے اٹھنے میں جلدی کرنے میں

سوم...... مہمان کی خوشدلی سے آؤ بھگت کرنے میں

چہارم..... استاد کی عزت و تعظیم کرنے میں''

غور کیجئے اگر کوئی خود شناس استاد یہی چار باتیں پلے باندھ لے۔ انہی پر عمل شروع کر دے تو اس کی شخصیت کی خوب صورتی اور ہر دل عزیزی میں کس قدر اضافہ ہوگا؟

ایک خودشناس آدمی چاہے وہ کسی بھی عمر کے حصے میں ہو، جب جب کوئی عمل کرے گا اس کی چار وجوہات ہی ہوسکتی ہیں۔

☆ اپنے رب کی رضا کے لیے۔

☆ اپنی والدین کی خوشنودی کے لیے۔

☆ اپنی خوشی اور وقار کے لیے۔

☆ دنیا کی نظروں میں اُٹھنے کے لیے۔

ہر درجے کا تپاک اور عزت افزائی فرق ہوگی''

ایک خودشناس استاد کے سامنے اللہ کی رضا ہوگی تو ہر کام میں نیت اور ارادہ صاف اور واضح ہوگا۔ بنیاد پختہ اور نظر دنیا اور آخرت دونوں کی کامیابی اور کامرانی پر ہوگی۔ وہاں کے لیے اثاثہ زیادہ چاہیے تو کام بھی زیادہ سیدھے کرے گا۔ اپنے خلاف کم سے کم گواہیاں پیدا کرے گا۔

کسی بڑھیا نے مشہور بادشاہ الپ ارسلان کو ایک پل پر روک کر پوچھا تھا ''میرا حساب یہاں دے گا یا پل صراط پر۔''

بادشاہ نے ایک لمحے کا توقف کیا بنا کہا ''نہیں تمہارا حساب یہاں ہی ہوگا وہاں تک معاملہ نہیں جانے گا۔'' ہم میں سے کوئی بھی اللہ کے ہاں جا کر شکایت، شکوہ اور اپنے خلاف دی جانے والی گواہی افورڈ نہیں کرسکتا کیونکہ وہاں شرمندگی کا نہ حساب ہوسکے گا نہ ازالہ۔

ہم لوگ جمعیت میں تھے تو وہاں ایک معمول تھا، کسی کو شکوہ شکایت ہے تو پہلے اکیلے مل کر دور کرلیں۔ اگر اجتماع میں یعنی دوران میٹنگ کسی نے ہاتھ اٹھا کر اپنی شکایت پیش کردی یا احتساب کرنے کی اجازت چاہی تو وہ زیادہ شرمندگی کا موقع بن جاتا۔ کوئی ٹیچر یا ہیڈ ماسٹر صاحب اکیلے میں سزا دے لیں تو اتنا مسئلہ نہیں ہوتا اگر وہ سکول کی اسمبلی میں بلا کر سب کے سامنے بتا کر سزا دیں، جواب مانگیں تو زمین میں گڑ جانے والے حالات ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح بڑے ہوکر دفتروں میں، بڑے اجلاسوں میں یا جلسوں میں ایسا ہو تو ساری کیفیت ہی بدل جاتی ہے۔

رب کے سامنے مشکل سے بچنے کے لیے بہتر یہی ہوتا ہے کہ اسی زندگی میں نیت اور معاملہ صاف رکھا جائے۔ وہ صاف نیت سے خوب واقف ہوتا ہے اس لیے نہ بندہ ضائع کرتا ہے نہ اس کی نیت کا اجر..... کوئی استاد اپنی نیت ہی کو نہ سنبھالے تو پھر کہنے کو کیا رہ جاتا ہے۔

دوسری بات یہ کہ والدین کی خدمت گزاری کے لیے خود رب العالمین نے بار بار ہدایت دی، بچپن سے ہی ہر مسلمان اور صاحب ایمان کے دل میں بات بٹھا دی کہ ماں باپ کی عزت ضروری ہے۔ یہ آپشنل نہیں ہے کہ جی چاہا تو کر لی اور جی نہ چاہا تو منہ پھیر لیا۔ اللہ کے رسولؐ نے بھی اسی کی تلقین کی، باپ کے غصے کو اللہ کی ناراضی اور خوشی کو اللہ کی خوشی بتایا بڑھاپے میں کبھی اف تک نہ کہنے کا حکم دیا۔ ماں باپ پر محبت کی نظر کو اجر و ثواب کا مستحق گردانا۔ خود بڑے ہو کر اس فرض کو بھولتے ہم نے بہت دیکھے ہیں۔ آپ کبھی یہ نوبت نہ آنے دیں۔

یہ خود شناسی کی انتہائی کمی اور کمزوری ہوگی ہے جب کوئی بیٹا یا بیٹی ماں باپ کے آگے بولنے اور جواب دینے لگتا ہے۔ ہم نے کبھی زندگی بھر نہ یہ جرأت کی، نہ کبھی سوچا، اپنے والد محترم کو ہم نے کبھی دادا کے برابر بیٹھتے نہیں دیکھا۔ جن کے ماں باپ اَن پڑھ ہوں، ان کا یہ احسان ہی کم ہے کہ خود علم نہ رکھتے ہوئے بھی اولاد کو پڑھا دیا۔ علم سے روشناس کرا دیا۔ اس سے زیادہ بے علمی کیا ہوگی کہ پڑھ لکھ کر وہی محسن ماں باپ بُرے لگنے لگیں۔

جب کبھی اخبار میں خبر آتی ہے کہ کسی بدبخت نے ماں باپ پر ہاتھ اُٹھایا یا زمین کے کسی چھوٹے سے ٹکڑے کے لالچ میں شیطان بن کر دونوں میں سے کسی کو مار دیا تو دل لرز جاتا ہے۔ آخر کہیں تو کمی رہی ہوگی جو اس نے زندگی میں ہی جہنم کی آگ کو اپنے لیے چن لیا۔ قاتل اور ظالم کو زندگی میں کبھی چین نہیں آتا۔ چہ جائیکہ اس بدبخت نے نافرمانی اور گناہ کی اس حد کو ہی عبور کیا ہو۔ آپ کو اپنے طلبہ و طالبات سے اس حوالے سے ضرور بات کرتے رہنا چاہئے۔

ہمیشہ اپنے رب سے سعادت مندی کی دعا کرتے ہوئے زندگی کی آخری سانس تک سعادت مند بیٹے اور بیٹی بن کر رہنے کی جستجو اور آرزو کرنی چاہیے۔ ہمارے بزرگ دوست عظمت شیخ صاحب

انکی نواسی اپنی ماں سے پچھلے دنوں ملنے گیا تو وہ اپنا گھر چھوڑ کر اپنی بیٹی کے ہاں قیام پذیر تھے۔ سے بڑھ کر خدمت کر رہی تھی۔ وہ ان کو بستر سے اترنے نہ دیتی تھی۔ جو مانگتے، اشارہ ملتے ہی فراہم کرنے کی کوشش کرتی۔ دل سے اس کے لیے دعا نکلی۔ اللہ معاف کرے فی زمانہ بیٹے شادی کے بعد ماں باپ کی خدمت سے محروم رہ جاتے ہیں مگر اچھی اور سعادت مند بیٹیاں شادی اور بچوں کے بعد بھی اپنی ماؤں اور باپوں کو نہیں بھولتیں۔ بیٹی سعادت مند ہوگی تو ہی اسکی اولاد بھی فرمانبردار اور محبت کرنے والی ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ آپ بھی ایک خودشناس اور خود آگاہ سچے بیٹے اور بیٹی کی طرح کبھی خدمت سے محروم نہیں رہیں گے۔

جب ذات کی خوبصورتی صرف چہرے کی خوبصورتی بن جائے:

یونان اپنے فلسفی اساتذہ کے ساتھ ساتھ ایک بڑے فاتح اور حکمران سکندر کے حوالے سے بھی جانا جاتا ہے۔ سکندر کے عہد میں ایک دانا اور حکیم بہت مشہور ہوئے۔ ان کا نام دیوجانسن کلبی تھا۔ کسی نے پوچھا! ''آپ کو کلبی (کتوں والا) کیوں کہتے ہیں؟'' بولے ''چونکہ میں سچی بات لوگوں کے منہ پر کہہ دیتا ہوں اور کم عقل لوگوں پر آوازے کستا ہوں۔'' وہ لوگوں کو سمجھاتے تھے کہ ''جب کوئی کتا اپنے مالک کو چھوڑ کر تمہاری طرف آنے لگے تو پتھر مار کر بھگا دو، اپنے پیچھے آنے مت دو، کل وہ تمہیں بھی چھوڑ کر کسی دوسرے کے پیچھے روانہ ہو جائے گا اور پھر تم دل گرفتہ ہو گے اور تکلیف سہو گے۔ دیوجانسن کلبی کا ایک قول خود شناسی کے حوالے سے بے حد توجہ طلب ہے۔ کہا

''عاقل وہی ہے جو لوگوں کے خوف کے بغیر محض خدا کے خوف سے گناہ سے شرم رکھے اور عبادات خدا، خواہش دل کے ساتھ کرے۔''

کہا جاتا ہے کہ ایک بار حکیم صاحب جا رہے تھے تو انہوں نے ایک نوجوان کو دیکھا جو بے حد خوب صورت تھا مگر ان کے افعال اور اعمال پسندیدہ نہ تھے بڑی دل سوزی سے کہا۔

''اے میرے بیٹے! اے پسر تو نے فضائل نفس، ذات کی خوبیوں اور خوبصورتیوں کو صرف چہرے کے محاسن (خوبصورتی) بنا ڈالا'' ذرا اس جملے کی گہرائی پر غور کریں، استاد اسی لئے استاد ہوتا ہے کہ کم لفظوں میں دانش کی دولت عطا کرتا ہے یعنی اے نوجوان تو نے رب کی عطا کردہ اپنے نفس کی

خوبیوں اور خوبصورتیوں کو ذات اور اعمال کی خوبصورتی میں ڈھالنے کی بجائے صرف چہرے کی خوبصورتی بنا کر دوسروں کو متوجہ کرنے کو آسان جانا، چہرے کی جاذبیت لیکر گناہ کے کام کو آسانی سے کرنے کو ہی حاصل زندگی بنالیا۔ یہ عیش پرستی تو عارضی ہے، کاش تو نے اپنی ذات اور شخصیت پر توجہ دی ہوتی، اسے اعلیٰ اور خوبصورت بنایا ہوتا۔

ان کی بے نیازی کے حوالے سے تاریخ میں آیا ہے کہ

سکندر ایک فتح کے بعد اظہار عقیدت کے لیے اور تحسین پانے کے لیے ان کے پاس گیا اور اپنی کامیابی اور فتح کا بتا کر بولا" بتایئے اس خوشی میں آپ کے لیے میں کیا کروں۔؟"

" دیو جانسن کلبی اس وقت دھوپ میں لیٹے ہوئے تھے بے نیازی سے بولے" بس اتنی مہربانی کرو کہ ذرا دھوپ چھوڑ کر پرے کھڑے ہو جاؤ۔"

سکندر نے پوچھا کہ" میں ثواب کیسے حاصل کروں، جو میرے بعد میرے کام آئے۔" جواب دیا۔" اچھے کاموں سے کیونکہ تمہیں اس کی اس قدر قدرت حاصل ہے جو رعایا سے ساری عمر ممکن نہیں ہوگی۔"

بطور استاد آپ محسوس کریں تو یہ حقیقت آپ کے سامنے آئے گی کہ اچھے کاموں اور سوچ کے بیج بونے کی جو قدرت اور آسانی رب نے آپ کو دی ہے وہ عام لوگوں کو عمر بھر میسر نہیں آتی۔ ایسے میں کوئی خود آگاہ استاد ایسی سعادت سے کیسے محروم رہ جائے اور کسی محرومی کو اپنے گلے اور زندگی کا ہار بننے کی اجازت کیونکر دے سکتا ہے کہ جو اسے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہنے کی آسانی اور آسودگی سے دور کردے۔

20 باتوں سے خودشناسی میں اضافہ کرنا ممکن ہے:

چونکہ خودشناسی کی تشکیل بچپن سے شروع ہو جاتی ہے لہٰذا بچپن ہی سے اسے بہتر بنانے کے اقدامات کیے جائیں۔

1۔ بچوں پر غیر ضروری تنقید نہ کی جائے، بلکہ انہیں مثبت احساس دلایا جائے

2۔ کبھی بچوں کی توہین اور تذلیل نہ کی جائے۔ یہ دکھ عمر بھر یاد رہتا ہے

3- بات بات پر ان کو شرمندہ نہ کیا جائے، شرمندگی صلاحیتوں کو کھا جاتی ہے

4۔ اگر بچوں میں کوئی جسمانی خرابی مثلاً اونچے دانت ہوں تو انکے نام نہ رکھے جائیں، نہ رکھنے دیئے جائیں۔ یہ انسانی طور پر بھی بڑا گھٹیا طرز عمل ہے۔

5۔ انہیں دوسروں سے ملنا جلنا اور بات چیت کرنا سکھایا جائے۔ ان کو اعتماد دیا جائے۔

6۔ بڑے بچوں کے جذبات کا خیال رکھا جائے۔ انہیں غیر مشروط محبت دی جائے۔ اگر ان سے کوئی غلط کام ہو جائے تو غلط کام کو برا کہا جائے مگر بچوں کو محبت پھر بھی دی جائے۔ نفرت سے بچے عمر بھر کے لئے پیچھے رہ جاتے ہیں۔

7۔ بچوں میں احساس جرم اور خوف پیدا نہ کیا جائے۔ غلطی کا احساس ہونا ضروری ہے اور معافی مانگنے کا حوصلہ پیدا کیجئے، بچے جب جب معافی مانگیں انہیں خوشی سے معاف کرنے کو عادت بنائیے۔

8۔ بچوں کو سکھایا جائے کہ وہ خود بھی اپنی تذلیل نہ کریں۔ خود ترسی بھی عمر بھر کا عذاب بن جاتا ہے۔

9۔ اساتذہ کو بچوں کو ضرور بتانا چاہئے کہ وہ کن کو اور کس طرح کے بچوں کو پسند کرتے ہیں۔

10۔ اساتذہ، بچوں کے والدین سے مسلسل رابطہ رکھیں اور بچوں کی گروتھ (Growth) اور کامیابی میں حصہ دار بنائے رکھیں۔

11۔ بچے کے اندر خود مختاری اور چھوٹے بڑے معاملات میں ذمہ داری لینے کا احساس پیدا کیا جائے۔ اسے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دیں۔

12۔ بچے کے سامنے خود بھی اچھی خود شناسی کی مثال بنیں۔

13۔ دنیا میں ہر بچہ منفرد ہے۔ بچے کے منفرد ہونے پر اس کی عزت واحترام کریں، اس خوبی کا اقرار بھی کریں

14۔ بچوں کو سکھائیں کہ وہ اپنے آپ کو اہمیت دیں۔ اپنی عزت کریں۔

15۔ بچوں کو اپنے کردار وعمل کی کمی کو سمجھنے میں مدد دیں۔ انہیں بتائیں کہ ہر فرد اپنی کامیابی اور ناکامی کا ذمہ دار خود ہوتا ہے۔

16۔ بچوں کے اچھے کاموں، ہوم ورک، لکھائی، صاف لباس کی دل سے تعریف کریں۔

17۔ کامیابیاں حاصل کرنے کے لیے بچے کی مدد کریں۔ بچے سے اس کی اپنی کامیابیوں کی فہرست بنوائیں۔ اسی فہرست کو گاہے بگاہے خود بھی پڑھ لیں، بچوں کو ملنے والے سرٹیفکیٹ، ٹرافیاں اور انعام کو سکول یا کلاس روم میں ایسی جگہ رکھیں جہاں وہ ان کو اکثر دیکھ سکیں، دوسرے بھی ان کو دیکھ سکیں۔ ایسا کرنا بڑا مفید رہتا ہے

18 اپنے ایک بچے کا دوسرے سے منفی موازنہ کبھی نہ کریں، سب بچے ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔

19۔ بچوں کو نظم وضبط، ضبط نفس اور ڈسپلن سکھائیں۔ یہ ان کی زندگی کو خوبصورت بنا دے گا۔

20۔ بچوں کو مثبت سوچنے کی عادت ڈالیں۔ یہ سونے سے بھی قیمتی خوبی ہے، اور ہر وقت دوسروں کے بارے میں برا سوچنے سے روکتی ہے

یہ 20 باتیں تو صرف تجاویز ہیں۔ آپ خود سوچیں گے تو بچوں کی خود شناسی بڑھانے والی کئی 20 باتیں خود آپ کو یاد آ جائیں گی۔ اصل فائدہ یہ ہوتا ہے کہ آپ خود بھی سیکھتے ہیں، اپنے آپ کو بہتر بناتے ہیں۔

دلچسپ منظر کا تکلیف دہ پہلو، اسے کوئی کیسے یاد رکھے گا:

گزشتہ دنوں یو ایم ٹی میں کیمسٹری کے استاد علی رضا میرے آفس مشورے کے لیے آئے۔ ان کے ٹریننگ کے شوق میں بہتری کے امکانات کے حوالے سے ہم بات چیت کر رہے تھے جب انہوں نے بتایا کہ وہ کچھ عرصہ قبل اپنے سکول گورنمنٹ ہائی سکول منہالہ خورد واہگہ گئے جہاں سے انہوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی۔ انہوں نے ہیڈ ماسٹر صاحب کی اجازت سے کلاس دہم کا ٹیسٹ لیا۔ انہیں ایک طرح سے شکایت تھی کہ ہیڈ ماسٹر صاحب نے آنے کی زحمت بھی نہ کی البتہ ایک دو استاد ضرور آ گئے۔ علی رضا نے بچوں سے پوچھا کہ وہ زندگی میں کیا بننا چاہتے ہیں تو ان کی

حیرت کی انتہا نہ رہی جب کچھ طلبہ نے بتایا کہ وہ ٹیکسٹائل انجینئر بننا چاہتے ہیں۔ایک نے کہا وہ چیف آف آرمی سٹاف بننے کا خواہاں ہے دوسرے نے چیف جسٹس بننے کی آرزو ظاہر کی۔انہیں اس بات کی خوشی تھی کہ مین سٹریم سے ہٹ کر ایک سرحدی گاؤں کے بچے اگر اس طرح سوچنے لگے ہیں تو یقیناً بے حد خوش آئند بات ہے اور اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ا۔ن کا کوئی نہ کوئی استاد ان سے اس طرح کی بات کرتا رہا ہے۔

علی رضا اپنے پرانے سکول یہ سوچ کر گئے تھے کہ زندگی میں انہوں نے جو اچھا سیکھا ہے وہ اپنے سکول کے بچوں کو لوٹا آئیں مگر وہاں کئی حیرتیں ان کی منتظر تھیں۔ بے شک سرکاری سکولوں میں حکومتوں نے بڑے بڑے اچھے اور پڑھے لکھے استاد تعینات کر رکھے ہیں۔ان کی تنخواہوں کے گریڈ اور سکیل بھی بہت اچھے اور مثالی ہیں مگر کیا کیجئے اکثر سے والدین کو ایک ہی شکایت ہوتی ہے کہ بچوں کو پڑھانا ان کا من پسند کام نہیں بن سکا۔ وہ نوکری کا وقت پورا کرنے آتے ہیں۔ اکثر تو اخبار پڑھتے اور علاقائی سیاست پر بحث کرتے اپنی سکول ڈیوٹی کے گھنٹے پورے کرتے ہیں اور علم کے منتظر بچوں کو کچھ سکھائے پڑھائے بغیر گھر واپس چلے جاتے ہیں۔کیا لوگ یہ سوچنے اور کہنے میں حق بجانب ہیں کہ رزق کو حلال کرنا ہم سب اساتذہ پر زیادہ لازم ہے۔ جب تک وہ کام بہترین اور احسن طریقے سے نہ کیا جائے جس کے لیے تنخواہ مل رہی ہے تو رزق پر شک کے سایے تو گہرے ہوتے رہیں گے ورنہ حقیقت یہ ہے پڑھانا تو نوکری سے زیادہ پیغمبری پیشہ ہے۔جس کی تنخواہ بھی مل رہی ہوتی ہے۔نیت اچھی ہو تو یقیناً اجر اور ثواب الگ سے ملتا ہے۔علی رضا نے دیکھا کہ سکول کے گراؤنڈ میں بچے 10۔10 فٹ کے فاصلے پر بیٹھے ہیں۔اس نے سوچا امتحان ہو رہا ہوگا مگر پتا چلا کہ یہ کوئی امتحان نہیں ہو رہا ٹیچر اپنی کرسی پر بیٹھے اخبار کا مطالعہ فرما رہے تھے اور بچوں کو اتنی دور دور اس لیے بٹھایا گیا تھا تاکہ باہم باتیں نہ کریں۔ بچے پانچ لائنوں میں بیٹھے تھے اور کلاس کے آخری بچے ٹیچر سے 500 فٹ دور بیٹھے تھے۔

بچوں کو خاموش رہ کر کتابیں پڑھنے کا حکم تھا مگر 500 فٹ دور بیٹھے بچے بڑی سہولت اور

مزے سے گپیں ہانک رہے تھے اور کھلے گراؤنڈ کی سہولت سے ان کی آواز پیدا ہو رہی تھی نہ ٹیچر تک پہنچ رہی تھی اور دونوں فریق مطمئن تھے، کسی بچے کی آواز اونچی ہوتی تو استاد کی ایک تیز دھاڑتی ہوئی آواز چند لمحوں کے لیے پھر خاموشی طاری کر دینے کے لیے کافی ہوتی۔ اس دلچسپ منظر کا تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ گھنٹی بجی تو استاد صاحب اُٹھے اپنی اخبار سمیٹ کر چلے گئے اور ایک نئے ٹیچر آ کر اس کرسی پر بیٹھ گئے، پھر پریڈ بدل گیا۔ نئے مضمون کا ٹیچر بھی آ گیا مگر زمین پہ بیٹھے بچوں کی قسمت بدلی اور نہ کتابیں، انہیں نہ کچھ نیا پڑھنے کو ملا نہ سننے کو اور نہ سمجھنے کو۔ پڑھائی کے اس اعلیٰ معیار کے بعد بھی کوئی بچہ چیف جسٹس یا چیف آف آرمی سٹاف بننے کے خواب دیکھنے کی جرأت کرتا ہے اور اپنی آرزو کو مرنے نہیں دیتا تو حقیقت میں کسی معجزے سے کم نہیں۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ بھی رہی ہو کہ انہی اساتذہ میں سے دو چار ایسے بھی آ جاتے ہیں جنہیں یہ بچے زندگی بھر نہیں بھول سکتے ،کہیں ہیڈ ماسٹر صاحب اچھے آ جاتے ہیں تو ماحول بدل جاتا ہے

کبھی اساتذہ فرشتوں جیسے تھے کہ صبح کسی لالچ کے بنا زیرو پیریڈ لیتے بغیر احسان جتائے، بغیر فیس لیے زیادہ پڑھاتے۔ یہ پریڈ سکول شروع ہونے سے پہلے ہوتا اور ظاہر ہے استاد بچوں سے بھی پہلے آتے۔ ان کے پڑھائے ہوئے بچوں کو ہم نے زندگی کے سفر میں آگے ہی آگے بڑھتے دیکھا۔ وہ کہیں بھی ہوں اپنے استاد کو نہیں بھول پاتے۔

سرکاری سکولوں میں ہمیشہ سے ایسا نہیں تھا:

ان مخلص اساتذہ کے پڑھائے ہوئے بچے آج بھی سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کے سربراہوں کی صورت میں جگہ جگہ اپنے اساتذہ کی محبت، عزت اور توجہ کی گواہی دیتے آپ کو مل جائیں گے۔ چشتیاں کے گورنمنٹ ہائی سکول نمبر 1 میں چھٹی جماعت کے انچارج ماسٹر نور احمد صاحب کی پڑھائی ہوئی کلاسیں اور سردیوں کے موسم میں منہ اندھیرے چھ بجے گھر سے نکلنے اور ساڑھے چھ کلاس روم کے اندر ہونے کی سختی آج تک مجھے یاد ہے۔ ہلکی سی تاخیر ہونے پر کلاس روم کے دروازے پر کان پکڑنے والوں میں شامل ہونے سے بچنا کوئی آسان کام نہ ہوتا تھا۔ کوشش کے

باوجود ہفتے میں ایک آدھ بار اس سزا کا حصہ بننا پڑتا۔ پڑھائی کے دوران کچھ بھول جاتے توجہ کہیں اور چلی جاتی یا کام مکمل نہ کیا ہوتا تو ہاتھ کی انگلیوں میں پنسل دے کر دبائے جانے کا خوف آدھی جان نکال دیتا تھا۔ ماسٹر صاحب کے ساتھ ان کا گول مٹول بھانجا بھی آیا کرتا تھا۔ ہماری بڑی حسرت تھی کہ کسی روز وہ ماسٹر صاحب کے ساتھ نہ آئے اور لیٹ ہونے کی صورت میں اسے بھی کان پکڑنے پڑیں۔ظاہر ہے یہ اس کی بھی عزت کا مسئلہ رہا ہوگا۔ایک آدھ بار جو وہ قابو آیا تو کلاس بھر میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ جہاں تک یاد پڑتا ہے رمضان نام تھا اس کا۔مگر اصل بات تو یہ تھی کہ ماسٹر نور محمد جیسے اساتذہ زیادہ تھے جو نوکری نہیں کرنے آتے تھے،علم بانٹنے آتے تھے۔

آپ کو بطور استاد لوگ کیسے یاد رکھیں گے:

آنے والے دنوں اور برسوں میں آپ کے سکول سے جانے والے طلبہ اور ان سے وابستہ لوگ آپ کو بطور استاد کیسے یاد رکھیں گے یہ ان پر نہیں آپ پر منحصر ہے۔آپ کے تصور ذات پر منحصر ہے،آپ کی خود شناسی اس کا فیصلہ کرے گی۔اگر آپ کی خواہش ہے کہ لوگ آپ کو ایک ایسے اچھے اور سچے استاد کے طور پر یاد کریں۔

1۔ جس نے اپنے طلبہ وطالبات میں احساس شکر پیدا کیا ہو۔

انہیں اپنے رب کا شکر گزار بنایا۔اپنے ملک سے محبت کرنے والا۔

اپنے ادارے کا مشکور اور والدین کا ممنون،ان کے احسانوں کو یاد کرنے والا۔

ان کی محبت،توجہ اور تعلیم وتربیت کی اہمیت سمجھنے والا تو

یقین مانیے آپ ایک لمبی عمر پانے والے ہیں:

2۔ اگر آپ کی خواہش ہے کہ لوگ آپ کو ایک راہبر،راہنما اور ایسے استاد کے طور پر جانیں جس نے طلبہ کو زندگی کی منفی سوچوں سے بچانے میں مدد کی۔انہیں سماجی ،جنسی اور معاشرتی معاملات میں راہنمائی فراہم کی۔لڑائیوں میں صلح کرائی۔ناراض بچوں اور خاندانوں کے دلوں کو جوڑنے کی فکر کی۔بڑوں کے احترام اور ان سے شرمائے بغیر مشورہ لینے کی تعلیم کامیابی

سے دی تو یقین مانیے بچے بار بار کی غلطی سے بچیں گے، مشورے کا مقام و مرتبہ جانیں گے اور خود سوچنے، فیصلہ کرنے اور مشورے کے بعد اس کی ذمہ داری لینا سیکھیں گے۔ پڑھائی کسی خوف سے نہیں اپنی ضرورت اور شوق سے کریں گے۔

بھلا وہ آپ کی راہنمائی اور مشوروں کی قدر و قیمت کیسے بھلا پائیں گے؟

3۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ سے پڑھے ہوئے بچے ہمیشہ راہنمائی کے منصب پر جائیں، تو یاد رکھیے۔ ان کی زندگیوں اور سوچوں کو جوش سے بھر دیں۔ پرجوش لوگ ہی زندگی میں قیادت کرتے ہیں۔ بڑے کام کرتے اور بڑا نام پاتے ہیں۔ ایک اعلیٰ استاد ہی ہے جو اپنے بچوں کو رب سے جوڑتا ہے۔ اس کی پہچان کرواتا ہے۔ اپنے دین سے محبت سکھاتا ہے۔ دینی تعلیمات کا فہم روح تک اتارتا ہے۔ اپنے ملک کے لیے جینا مرنا سکھاتا ہے۔ اپنے خاندان، برادری، اسکول، قصبے اور شہر کے لیے بڑے کام کرنے اور بڑی کامیابی حاصل کرنے پہ اکساتا ہے۔

4۔ کیا آپ ایک ایسا استاد بننے کا سوچ سکتے ہیں جو خود سے بھی پوری طرح واقف نہ ہو۔ جس کی کل وقتی مصروفیت اُس کے بچوں کے لیے نہ ہو۔ اُس کا وقت طلبہ کی انفرادی کردار سازی میں نہ گزرے۔ اور نہ ہی کسی منفی سوچ کو ختم کرنے کی جستجو میں اس کا دل دھڑکے۔ کوئی ایسا استاد کیسے طلبہ کے دلوں میں دھڑک سکتا ہے؟

5۔ اک ایسا استاد جسے طالب علم صرف کسی چائے یا برگر کی دکان پر وقت گزارنے کے لیے یاد کریں۔ اُس کا کردار، کام اور بات صرف چند لمحوں کے لیے اُن کی ہنسی کا حصہ ہو۔ یا جس کا نام آنے پر خاموشی چھا جائے۔ اور کوئی تبصرہ کرنا بھی مناسب نہ سمجھے۔ کیا ایسی بے وقعت زندگی گزارنے کا آپ سوچ بھی سکتے ہیں؟

6۔ اک ایسا استاد جو وقت پر کلاس تو لے مگر اس کے پاس اپنی کلاس کو جاننے کا وقت ہی نہ ہو۔ جسے طالب علم تو استاد کے روپ میں جانتے ہوں مگر وہ کسی طالب علم کو ذاتی طور پر نہ جانتا ہو۔

جس کے خوف اور عزت کا دورانیہ صرف اور صرف پونے گھنٹہ کی کلاس ہو۔ پڑھنا لکھنا سکھانا اُس کا شوق، مقصد یا خواہش نہیں بلکہ صرف اک مجبوری ہو۔ نوکری ہو، ڈیوٹی پوری کرنے والے تو چپڑاسی، مالی اور چوکیدار بھی ہوتے ہیں۔ صرف نوکری کی خاطر پڑھانے والوں کو کوئی کتنا یاد کر سکتا ہے۔

7۔ اک ایسا اُستاد جس کا علم طالب علموں کے ہی نہیں بلکہ اُس کے اپنے کام بھی نہ آ سکے۔ جیسے علم رٹانا تو اچھی طرح آتا ہو، پر اُسے استعمال کرنا سکھانا بالکل بھی نہ آتا ہو۔ کسی کمرہ امتحان کی ہواؤں میں رٹے ہوئے جملوں کو لکھنے کے بعد بری طرح بھلا دیئے جانے والے تصورات کی طرح جینا چاہو گے!

8۔ ایسا استاد جسے نہ خود پر یقین، نہ اپنے رب کے خالق اور مالک ہونے پر یقین ہو۔ وہ قوم، ملک، سلطنت، پائندہ تابندہ باد، شاد باد منزل مراد تو روز سکول کی اسمبلی میں سنتا ہو مگر اُس کی سوچ اور فکر صرف اک کورس کی کتاب میں چھپے لفظوں تک محدود ہو۔ فرد، کلاس، سکول، معاشرہ، سماج اور ملک سنوارنا اُس کی ترجیح ہو نہ سوچ، اس سے ملنے سے رب یاد آئے نہ اس کے بولنے اور لکھنے سے کردار و اخلاق کے پودے سرسبز ہوں، وہ جو شیخ سعدیؒ کے اس قول کو پہچان ہی نہ پایا ہو ''اگر چاہتے ہو کہ تمہارا نام باقی رہے تو بچوں کو اچھے اخلاق سکھاؤ''۔

چھوٹی سوچ اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر روتے، شکوے کرتے لوگوں کی طرح جنہیں نہ کوئی پسند آتا ہے نہ کوئی دوسرا انہیں پسند کرتا ہے کی طرح یاد رکھے جانا پسند کرو گے!

اللہ آپ کی عمر اور زندگی میں برکت دے، ابھی گھڑی کی سوئی رکی نہیں۔ پھر آپ کیوں رکے ہوئے ہیں

لفظ تو لفظ ہی سکھاتے ہیں
آدمی، آدمی بناتے ہیں

اپنے علم اور ظرف کے برتن پر نئے سرے سے توجہ دیں۔

اپنی منزل، اپنے مقصدِ زندگی اور اپنے خوابوں کو اتنا بڑا کیجئے کہ ان کو حاصل کرنے میں آپ کو مزہ آنے لگے، خوشی ملنے لگے۔ پھر دیکھئے! لوگ آپ کو کیسے یاد رکھتے ہیں؟ یہ ایک نئے فرد کی یاد ہوگی۔ ایسا خوش قسمت اور قابل رشک استاد جو اپنے آپ سے واقف تھا، اپنی صلاحیتوں، اپنے ہنر، اپنی عادتوں، اپنی خوبیوں، اپنی اقدار سے آگاہ تھا اور اس کی ذات کے درخت کی ہر شاخ پھلدار تھی۔ ایسے تمام پھول جو اس کیلئے ہی نہیں دوسروں کے لیے بھی ناپسندیدہ تھے۔ دھیرے دھیرے خشک ہو کر جھڑ گئے تھے اور باقی پھل اپنی چمک، خوشبو اور تازگی سے دیکھنے والوں کی آسودگی اور راحت کا باعث بن رہے تھے۔

☆..........☆..........☆

اپنے آپ کو بدلنے اور سمجھنے کے لیے 5 سال بہت کافی ہیں۔ سال 2015 سے 2020 کے لیے

خودشناسی استاد کی

آپ کی خوب صورت شخصیت کے لیے ان 4 پہلوؤں پہ توجہ لازم ہے

کن اہداف کو حاصل کرنا ہے

1۔

2۔

3۔

4۔

5۔

کن خوبیوں کو بڑھانا ہے

1۔

2۔

3۔

4۔

5۔

کن عادتوں کو ختم کرنا ہے

1۔

2۔

3۔

4۔

5۔

کن باتوں کو نظرانداز کرنا ہے

1۔

2۔

3۔

4۔

5۔

ہائی پوٹینشل آئیڈیاز کے شکریے کے ساتھ خودشناسی بڑھانے کے لیے استعمال کیا جانے والا یہ انتہائی اہم خاکہ آپ کے لیے پیش ہے۔ یاد رہے یہ پڑھنے کے لیے نہیں۔ آگے بڑھنے سے قبل پُر کرنے کے لیے ہے۔

آپ کی لائبریری اس کتاب کے بنا ادھوری رہے گی

''دَرِ دِل پہ دستک''

آپ کے محبوب مصنف اختر عباس کے قلم سے، یہاں دل کی نرمی لفظوں میں ڈھل کر اثر کرتی ہے۔ جناب اختر عباس نے کتاب کے ابتدائیہ میں لکھا۔

''دل میں آنے والا ہر خیال کسی دستک کی طرح ہوتا ہے۔ میرے دل پہ دھیرے سے ہونے والی اس دستک نے جہاں میری تعمیر ذات میں آسانی کر دی وہاں میرے پڑھنے والوں کی زندگی کو آسودگی سے ہمکنار کیا۔ الحمدللہ کہ میرے رب کو اچھے لگے اگر جو اسے پسند نہ آئے ہوتے تو کب کسی دل میں انھیں ذرہ برابر بھی جگہ مل پائی تھی۔''

جناب مجیب الرحمٰن شامی نے لکھا:

''سچ پوچھیے تو ہر شخص ان سے لطف اٹھا سکتا ہے یقین کی دولت سے مالا مال ہو سکتا ہے اپنی دنیا آسان بنا سکتا ہے۔ اختر عباس کی نظر آج پر نہیں کل پر بھی ہے اور یہی بات انھیں اپنے ہم عصروں اور جملہ اہل قلم میں ممتاز کرتی ہے۔''

جناب ارشاد احمد عارف نے لکھا:

''اس قدر سلیس و سادہ کہ ہر ذہنی سطح کے فرد کو حد سے زیادہ آسان لگے۔ یہی اختر عباس کا کمال ہے جو آپ کو اس کتاب میں بار بار حیران کرے گا یہ کتاب ہر زندہ تحریر کی طرح اپنی زندگی اور توانائی کا ثبوت خود فراہم کرتی ہے۔''

جناب رحمت علی رازی نے لکھا:

''یہ مستقل نوعیت کی زندہ رہنے والی تحریریں ہیں اللہ تعالیٰ نے اختر عباس کے قلم سے لکھے لفظوں کو جس قدر تاثیر اور شدت بخشی ہے۔ یہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ بڑے نصیب کی بات ہے۔''

صفحات:240 قیمت:200 روپے منشورات کی پیش کش

یہ خوبصورت کتاب آپ ہی کے لیے لکھی گئی

منگوانے کے لیے رابطہ کیجیے

ادارہ مطبوعات طلبہ 1۔اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور

یادداشت

اختر عباس

نئی نسل کے نمایاں تربیت کار کہانی کار اور افسانہ نگار

اختر عباس نئی نسل کے ادیبوں میں سے ایک نمایاں کہانی کار، لکھاری اور دانشور کے طور پر الگ سے ایک پہچان رکھتے ہیں۔ نوعمر اور نوجوان قارئین ان کی سوچ، محبت اور مہارتوں کا اصل میدان ہیں۔ اس گروپ کے لئے لکھنا اس لحاظ سے بے حد مشکل ہوتا ہے کہ یہ جذبات کی انتہا پہ رہنے والی ذہانت اور توانائی سے بھری عمر ہوتی ہے، اس عمر میں نصیحت سے دلچسپی نہیں ہوتی۔ اس کے مسائل، پسند اور سوچ بچوں سے مختلف اور بڑوں کے برعکس ہوتی ہے مگر اس عمر کی باتیں اور تحریریں سوچ پر واضح اثر ڈالتی ہیں۔

اختر عباس نے 21 کتابیں تحریر کی ہیں۔ جن میں 15 نئی نسل کے لیے ہیں۔ وہ اپنے رب کے بے حد شکر گزار ہیں کہ جس نے انکے قلم میں تاثیر اور سوچ میں رخ، جدت اور قوت بخشی۔ ان کی کتابیں اب تک 2,30,000 کی تعداد میں چھپ اور فروخت ہو چکی ہیں۔ ان کی ایک نمایاں کتاب "آداب زندگی کے" نہ صرف یوتھ بلکہ والدین کو بھی بے حد پسند ہے۔ یہ کتاب 42,000 سے زائد شائع ہو چکی ہے۔ کتنے ہی بڑے سکولز میں اسے پڑھانے کا بطور خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ ۔ ان کے افسانوں کے تین مجموعے پھٹا ہوا دودھ، ممار شا اور خاموشی، پیچھے شور، قارئین کے وسیع حلقے سے مقبولیت اور داد پا چکے ہیں۔

"دل پہ دستک" ان کی دل کو چھو لینے والی ان تحریروں کا مجموعہ ہے جنہیں ایک بار پڑھنے والا مدتوں فراموش نہیں کر پاتا۔ اساتذہ کی تربیت کے لئے یہ انکی دوسری کتاب ہے۔ اس سے قبل "ونگ لائن پر کون پہنچا تا ہے" اپنا الگ مقام رکھتی ہے اور اسے بے حد پزیرائی حاصل ہوئی ہے۔ بچوں کیلئے لکھی گئی اہم کتابوں میں تھینک یو اللہ میاں، عقل کہاں سے آئی، بہانے باز، آٹوگراف، تین گول، ہرنوٹا، کمسن مجاہد، سروکی نیکی، نامکمل دعا، قوسی پہیلی بات ہی بھول گئی، دو آنسو، نامکمل دعا، حکمت بھری کہانیاں، ڈریگن کی واپسی، مٹھو۔ غلطی کے بعد، کانوں کو لگے ہاتھ، آسمان سے گرا، بے آواز لاٹھی، ہمت والا کمانڈو، غلطے اور کئی ان ون شامل ہیں۔

اختر عباس نے پنجاب یونیورسٹی سے MPA کیا پھر NUST سے HR میں سپیشلائزیشن کی 13 سال پاکستان میں بچوں کے مقبول رسالے پھول کے بانی مدیر رہے۔ ہمقدم، قومی ڈائجسٹ اور اردو ڈائجسٹ کے کئی سال ایڈیٹر رہے۔ وہ ملک کے نامور ایچ آر ٹرینر اور کنسلٹنٹ ہیں۔ پبلک سروس کمیشن کے ایڈوائزر اور لاہور ایچ آر فورم کے سینئر ممبر ہیں۔ وہ ممتاز ٹریننگ کمپنی High Potential Ideas کے چیف انسپائرنگ آفیسر ہیں۔

فون۔ 0300-9468746 ای میل۔ akhterabas@ymail.com

EHSAS
Quality Education

ہائی پوٹینشل بکس رحمٰن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور 0332-9468746 , 042-35424443